فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر

تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے

(جلد پنجم)

تالیف:

محمد طاہر جمال ندوی

ناشر:

دار البحوث والمناصرة الاسلامية

چاٹگام، بنگلا دیش۔

کتاب	:	تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (پنجم)۔
مؤلف	:	محمد طاہر جمال ندوی، فاضل دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، انڈیا۔
سن تصنیف	:	۱۹۹۹ء
سن کتابت	:	نومبر/ ۲۰۲۳ء
بار اول	:	دسمبر/ ۲۰۲۳ء
بار دوم	:	۱۰/ ۰٦/ ۲۰۲٦ء
تعداد	:	۱۰۰۰ (ایک ہزار)
قیمت	:	۵۰۰/ٹاکا، بنگلہ دیشی۔ ۳۰/ریال سعودی
کمپوز	:	محمود العالم (اندرقلعہ، چاٹگام، بنگلا دیش)
ناشر	:	دار البحوث والمناصرة الاسلامية چاٹگام، بنگلا دیش
ملنے کے پتے	:	0088-01533091784
Email	:	tahernadwi@gmail.com

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلئ استاد نہیں

انتساب

فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر

(الاحزاب:۱۳)

اس لہو کے نام جو ملت اسلامیہ ارکان کے لئے بہا مگر خود ارکان میں اجنبی ٹھہرا

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریری
کہ این مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیری



محمد طاہر جمال ندوی

۱۲/ دسمبر/ ۲۰۲۳ء

عرض ناشر

برادر محترم مولانا محمد طاہر جمال ندوی (فاضل جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ہند، وتلمیذ خاص مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی شخصیت ہمارے دینی وروحانی، علمی وثقافتی، فکری وسیاسی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، آپ ایک قابلِ القدر عالم دین، معروف ادیب و قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور مفکر مورخ بھی ہیں، جن کی چند تصانیف ماشاء اللہ چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں، اور بہت ساری تصانیف اب تک زیرِ طبع وزیرِ نظر بھی ہیں۔

مولانا محمد طاہر جمال ندوی بن الحاج مولانا حافظ جمال الدین احمد کی ولادت ۵/۵/۱۹۶۶ء میں بستی باغکونہ علی چنگ ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب اور سرکاری پرائمری اسکول سے پا کر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، یہاں سے آپ نے ثانویہ تک کی تعلیم پا کر دار المعارف الاسلامیہ چاٹگام میں ایک سال حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی اور حضرت مولانا فرقان اللہ خلیل صاحب سے پڑھا، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں پڑھ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، یہاں سے کلیۃ الادب العربی سے ماجستر کر کے ۱۹۹۱ء میں سند فراغت حاصل کی۔

مولانا محترم فراغت تعلیم کے معابعد بنگلا دیش آئے اور یہاں کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے تھے، جن میں دارالانصار چاٹگام قابل ذکر اور ناقابل فراموش درسگاہ ہے، پھر چند سال پڑھانے بعد آپ نے حجاز مقدس کا سفر کیا، جہاں آپ نے چند سال گزارے، اس کے بعد دوبارہ بنگلا دیش آئے ہوئے ہیں، حالیا تصنیف وتالیف میں مصروف اور سرگرم عمل ہیں، الحمد للہ مولانا کی چند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ گرانمایہ تصانیف ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

☆ سرزمین ارکان کی تحریکِ آزادی تاریخی پس منظر میں۔

☆ سازش کا طوفان عقلیت ومادیت کے روپ میں۔

☆ روہنگیا مسلمانوں کے جانگسل المیے۔

☆ تذکرۂ علامہ سید الامینؒ۔

☆ تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانیؒ۔

☆ روہنگیا مسلمان اور ان کی ہجرت کے اسباب۔

☆ ارکان کے عظیم شاعر علاول/ الاول، حیات وکارنامے۔

☆ ارکان روہنگیا یونین، ماضی اور حال کے تناظر میں۔

☆ روہنگیا چیخ وپکار اور مطالبات (ترجمہ)۔

☆ وادئ پرخار کے گمنام مسافر۔

☆ سالارِ کارواں محمد جعفر حبیبؒ۔

☆ سرخیل کارواں۔

☆ علماء اور جمعیۃ علمائے اسلام ارکان۔

☆ روہنگیا رسم الخط کا ایک علمی اور فکری جائزہ۔

☆ روداد سخن۔

☆ نقوش خیال۔

☆ حیاتِ نور۔

☆ حیاتِ ڈاکٹر محمد یونس۔

☆ برما میں خانہ جنگی کا دور دورہ۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۲)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۳)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۴)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۵)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۶)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۷)۔

☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۸)۔
☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۹)۔
☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۰)۔
☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۱)۔
☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۲)۔

مولانا کی ان تمام تصانیف میں سے سب سے مقبول ترین تصنیف ''سرزمین ارکان کی تحریکِ آزادی تاریخی پس منظر میں'' جو دسمبر ۱۹۹۹ء میں پہلی مرتبہ چھپ کر منظر عام پر آئی، اور دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے، جس کے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ: ''فاضلِ عزیز مولوی محمد طاہر جمال ندوی شکر وسپاس کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی محنت ولیاقت کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا، اپنے وطن کا حق ادا کیا، اور تاریخ کے خلا کو پر کیا، جو عرصہ سے پایا جاتا تھا''۔

مولانا کی زیر نظر تصنیف ''تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے جلد پنجم'' بھی ہمارے نزدیک ایک شاہکار تصنیف ہے، جسے آپ نے بڑی محنت، لیاقت اور عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے، اس میں کسی قسم کی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح اس سوانحی تصنیف کو بھی ایک ملی فریضہ اور قومی خدمت کے بطور اور بقول آپ کے ایک سعادت سمجھ کر لکھا ہے، اور اس کی تکمیل کی راہ میں آپ نے جو تکلیفیں، صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں ان کے اجر ومعاوضے صرف اور صرف ذاتِ خداوندی کی طرف سے ممکن اور امید ہیں۔

تاہم اس قوم کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہم اپنی قوم کی طرف سے عصر حاضر کے ہمارے اس عظیم مصنف وقلم کار کو خراجِ تحسین وگل دستۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنی خاص رحمت اور فضل وعنایات سے مصنف کی زندگی اور قلمی کاوشوں کو مزید شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین یارب العالمین

محمد طارق جمال
سکریٹری برائے نشر واشاعت
دار البحوث والمناصرة الاسلامية
چاٹگام، بنگلادیش۔

فہرست

تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے

(جلد پنجم)

حرف آغاز

الحمد للہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی اشرف الانبیاء وسید الاولین والآخرین، وعلی آلہ و صحبہ اجمعین،ومن تبعهم باحسان الی یوم الدین، ولا عدوان الا علی الظالمین، امابعد:

تاریخ کاروان حیات کا حافظہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جوقوم یا افراد اپنے حافظہ کھو بیٹھتے ہیں، وہ اپنے مستقبل تاریک بنالیتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی بھی قوم کا حال ماضی کا آئینہ اور کسی بھی قوم کا مستقبل حال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور تاریخ انسانی زندگی کا وہ آئینہ ہے، جس میں قوم اپنی حیات کا ہر اہم پہلو بڑی سچائی اور گہرائی کے ساتھ دیکھ پاتی ہے، چاہے اس کا تعلق انسانی سماج، طبقات، سیاست، معیشت معاشرت غرض انفرادی ہو یا اجتماعی، ذہنی ہو یا اخلاقی، تہذیبی ہو یا تمدنی کہ تاریخ ان کے ہر اہم پہلو کو بڑی گہرائی سے سامنے لاکر سورج کی طرح عیاں کردیتی ہے۔

اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ جوقوم اپنے ماضی اور اپنے اسلاف کے کارنامے بھلا دیتی ہے، اس کا وجود بحیثیت ایک قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے، کیوں کہ اس کے امتیازات، خصوصیات، کمالات، غیرت وخودداری کے جذبات اور عظمت وشرافت کے جو سرچشمے تھے کہ جہالت نے انہیں ان سے محروم کردیا تو اس کا رشتہ اپنے اسلاف سے ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جاتا ہے، اب اس حالت میں ان کی رگوں میں وہ خون گرم کہاں سے آئے گا، جو اس کے جسم میں زندگی کی حقیقی توانائی اور اپنی عزت وآبرو، عصمت وناموس اور عظمت واقتدار پر کٹ مرنے کا حوصلہ اور جذبہ پیدا کرسکتا تھا؟ اس لئے ہر زندہ اور حوصلہ مند قوم اپنی قومی تاریخ اور اپنے ماضی کی عظمت رفتہ اور اپنے اسلاف کے روشن کارناموں کو حرز جان بنائے رکھتی ہے۔

مسلمانان ارکان اپنے وطن عزیز میں حکمران رہ چکے تھے، ۱۷۸۴ءکوان پر برمیوں کا زبردست حملہ ہوا تو ان کے روشن حالات نے انگڑائیاں لیں، ان پر ناموافق سیاسی حالات کا تسلط ہوگیا، ان کی سیاسی، معاشی، سماجی، معاشرتی، ثقافتی غرض سبھی شعبوں کو زوال وانحطاط نے دیمک کی طرح چھاٹ گیا تھا، ان کے علم وفن، مال ودولت، عزت وآبرو، نخوت وغیرت، ناموس ووقار سب پر آنچ آنے لگی، برطانوی دور حکومت میں بھی ان کی یہی حالت بدلی نہ تھی، پھر ۱۹۴۸ء میں برمیوں کا ارکان پر دوبارہ قبضہ ہوگیا تو انہوں نے ارکانی مسلمانوں پر وہ سارے مظالم ڈھائے، جن کی یاد وتذکار سے ہٹلر اور چنگیز بھی شرمائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پوری دنیا کی اسلامی اور اسلامیوں کی تاریخ کی طرح ارکان کی تاریخ میں بھی زوال وانحطاط کا کرشمہ دیکھا گیا ہے، مسلمانان ارکان جب یہاں حکمران تھے تو اس زمین نے ہر شعبہ ہائے زندگی میں بڑے بڑے اعیان پیدا کئے، اور تو اور ان میں ادباء، شعراء، انشاپرداز اور علماء وصلحا کی کوئی کمی نہیں تھی، اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ہمارے اسلاف علم وادب، تہذیب وثقافت، اخوت ومساوات انسانی کے سرمایہ کار تھے، انہوں نے اپنے سرمایہ کو یہاں کے مسلمانوں کے علی الرغم دوسرے انسانوں، وحشی اور غیر متمدن قوموں پر پوری فیاضی کے ساتھ لٹایا تھا، ہمارے اسلاف نے یہاں کے ذرے ذرے سے محبت کی، اور یہاں کے چپے چپے کو اپنے جذبۂ عشق ووارفتگی کی سجدہ گاہ بنائی۔ یوں یہاں کی محبت بھری سرزمین نے ان کے دلوں کو جیت لیا تو انہوں نے اپنے سینے کو مزید کھول دیا تھا، ماضی کی اسکرین پر ان تمام مناظر کی تصاویر مرتسم ہیں، جو ہمارے سنہرے ماضی کی یاد دلاتی ہیں، اب انہیں بھول جانا ہماری قومی زندگی کا کوئی چھوٹا نہیں بلکہ سب سے بڑا حادثہ نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

ہماری قومی تاریخ کے سنہرے صفحات شاہد ہیں کہ ارکان میں جو دعاۃ ومرشدین اسلام کے پیام جاودانی لے کر آئے تھے، انہوں نے عزم وہمت کو ہم رکاب کرکے یہاں کے انسانیت کش حالات کو سازگار بنایا، اور اپنی عزت وشرافت، اصول پرستی اور عدل گستری، مساوات اور انسانیت نوازی کے کارناموں سے یہاں کی غیر متمدن، وحشی اور بربر قوموں کو اسلام سے روشناس کردیا تھا، انہوں نے اپنی اخلاقی بلندی اور رواداری کے مخلصانہ جذبات کے ذریعے یہاں والوں کو اتنا متاثر کیا کہ نہ صرف ان

قوموں نے بلکہ یہاں کی سرزمین نے بھی ان کے لئے اپنے آغوش محبت وا کر دیا، اور انہیں عزت واحترام کے بلند مقامات پر بٹھایا، تاریخ کی ایک لمبی مسافت ہے، جسے ہم نے اس سرزمین میں عظمت وسربلندی کے لہراتے ہوئے پرچم تلے طے کی ہے، یوں یہاں کی گلریز وادیوں نے ہمارے اسلاف کے پاؤں چومے، سنگلاخ پہاڑیوں نے ان کے قدموں کو بوسا دیا، کبھی کبھار ضرورت کی بنیاد پر ہمارے اسلاف نے اپنا قدم آگے بڑھایا، اور وہ خون کے متلاطم سمندروں کو پار کیا، اور اپنے اپنے مقصد ومنزل کو پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔

مگر اب طرفہ یہ ہے کہ ہم بڑے نا خلف، بزدل اور بادہ مست بن گئے ہیں، ہمارے ان دعاۃ و مرشدین، شہیدوں اور غازیوں نے عزیمت ودعوت کا روشن باب رقم کیا تو ہم نے ان کی آرزؤں اور امنگوں سے غدر کرنا شروع کر دیا ہے، وہ اور ان کے تمام کارنامے آنے والی نسل کے لئے روشنی کے مینار تھے، مگر اب ہمارے ہاتھوں ان کی شناخت اور تاریخی کارنامے مسخ ہونے لگے ہیں، اس طرح روشنی کے ان میناروں کی بنیادیں بھی ہمارے ہاتھوں متزلزل ہونے لگی ہیں۔

انسانی تاریخ کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ اس نے بعض موقع پر اپنے اسلاف اور ان کے کارناموں کو یا تو بھلا دیا ہے یا بگاڑ دیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں اسلام کا دروازہ کھولنے والا ملت اسلامیہ کے عظیم سرخرو نوجوان حضرت محمد بن قاسم کے حالات بڑے دردناک ہیں، جو خود مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوئے، اور ایک طویل مدت تک مطلق العنان حکمرانوں نے انہیں مسلم تاریخ میں جائز مقام تک دینا گوارا نہ کیا، مگر اسلامیان ارکان کے اسلاف کی طرح ان کے متعلق بھی وقت نے جب اپنے چہرے سے ناانصافی کی گرد وغبار ہٹائی، تو اسلام کے اس عظیم المرتبت خادم کے روشن چہرے پر پڑی ہوئی گرد وغبار صاف ہو کے چہرہ مزید تابناک ہوا، تو تاریخ نے انہیں اپنے سینے سے لگایا، غیرت مندوں نے انہیں اپنی حمیت وغیرت کی علامت بنائی ہے۔

ادھر اور ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد یہاں کی تاریخ نے حضرت سید احمد بن عرفان الشہید اور حضرت اسماعیل شہید پیدا کئے، جنہوں نے وادی بالاکوٹ میں جہاد کا علم بلند کیا، باوجودیکہ ان مجاہدین اسلام کی پشت میں کچھ غدار خوانین نے چھرا گھونپا، سکھوں اور انگریزوں کی امیدیں اور مرادیں بھر لائیں،

مگر دریائے کنہار کے شوریدہ سر لہروں کے ساتھ اس تحریک کا مقدس لہو مل کر تاریخ کا رخ پھیر دیا، یوں یہ حضرات جنوبی ایشیا میں حقیقی اسلامی جہاد کے سب سے بڑی اور سب سے پہلی تحریک کے نقیب بن کر ابھرے، نہ صرف وہ حضرات بلکہ ان کے رفقاء، ہم نوا وشرکاء سبھی کو تاریخ نے بلند مقام عطا کیا ہے۔

بعض مورخین شاید وطن مقدس ارکان کے دور اخیر کے مجاہدین کو ناکام دیکھ رہے ہوں گے، جس طرح بعض حضرات مورخین حضرت سید احمد بن عرفان الشہید کی تحریک جہاد کو ایک ناکام تحریک کی نظر سے دیکھتے ہیں، مگر یاد رہے کہ بعض موقع پر شکست بڑا تلخ تجربہ ہوتا ہے، لیکن زندہ قوموں کی تاریخ میں بارہا ایسا بھی ہوا کہ ایک شکست ان کے لئے بڑی فتح کا پیش خیمہ بن گئی، اور وہ قومیں پہلے سے بڑھ کر معزز اور مضبوط بن کر ابھریں، تو راقم الحروف کی امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ اور تو اور سرزمین ارکان کے دور آخر کی تاریخ بھی اس انداز سے ابھر آئے گی۔

بایں ہمہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ مجاہدین سید احمد بن عرفان الشہید کے برعکس سرزمین ارکان کے دور آخر کے مجاہدین کی نامرادی کی تلخی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ اہل وطن اپنے جان نثاروں کو بھی بھول گئے ہیں، ان لوگوں کو بھول گئے جنہوں نے اپنی کڑیل اور بے داغ جوانیاں اور عمریں غاصبوں، خون خواروں اور طاغوتوں کے مقابلے میں دفاع دین ووطن کی خاطر قربان کر دیں، اب تو حسرت ویاس کا یہ عالم ہے کہ ان شہیدوں اور غازیوں کے نام تک نہیں لئے جا رہے ہیں، لیکن یاد رہے کہ آخر وہ لوگ ہمارے ہی تھے، جنہوں نے دریائے مایو اور کلاڈان سے وضو کیا، اور اپنے لہو کے سوغات دے کر ہماری تاریخ کو سرخرو کیا، وہ قائدین ملت، وہ جوانان قوم ہمارے جسد ملی ہی کا اٹوٹ حصہ تو تھے، جنہوں نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ پھینکنے کی کوششیں کیں، اور اپنی اپنی زندگیوں کو اس حوالے سے وقف کر دیا، مگر آج ہمارے اندر شعور واحساس کی چنگاری ایسی بجھی کہ ہم ان شہیدوں اور غازیوں کے نام تک بھول گئے ہیں۔

جی ہاں! ان محسنوں کو یاد کرنا ہمارا فرض اولین ہے، جنہوں نے ظلمت واندھیاری کے اس مہیب طوفان میں حق وصداقت کی قندیلیں روشن کیں، جنہوں نے حق کی آوازیں بلند کرنے کے صلے میں طعنوں، ملامتوں کے تیر سہے، اور اپنی زندگی، اپنے مستقبل کو ملت وقوم کی راہ پر نثار کیا، ملک وقوم کی آزادی اور اگلی نسل کے مستقبل کی حفاظت کی بھرپور کوشش کی، اس مقصد کے لئے قید خانے کی

اندھیاری کے نذر ہو گئے، شہید ہوئے، غازی بنے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اب ان کی اکثریت ہمارے مابین نہیں رہے، مگر ان غزاۃ وشہداء کی پاک روحیں دیکھ رہی ہیں کہ ان کی قربانیوں سے کون کون مستفید اور کون کون فیضیاب ہو رہے ہیں، اگر ہم فراموش کرنے والے نہیں ہیں تو ہم ان شہیدوں اور غازیوں کو کبھی بھی نہیں بھول سکتے، ہر چند کہ وہ لوگ اپنے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، لیکن ان کا ملت و ملک پر نچھاور کیا ہوا لہو، جانے والوں کا قرض اور آنے والوں کی امانت ہے، اگر ہماری قوم ان کی جان نثاری، جرات وعزیمت کو نظر انداز کرتی ہے تو بجا طور پر یہ شک پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری قوم زندہ بھی ہے یا نہیں؟

ہمارے اسلاف ہمت وحوصلہ، غیرت وشجاعت، عزم واستقلال، حب دینی اور حب الوطنی، حق وصداقت، انصاف وعدل گستری، رواداری وفیاضی غرض اخلاق عالیہ کے مجموعی طور پر مجسم تھے، اسی روشنی میں انہوں نے یہاں سے جہالت کو دور کیا، اور علم وعمل کی روشنی پھیلائی، آزادی کی یاد دلائی، حریت کا سبق پڑھایا، تہذیب وشائستگی کے چراغیں روشن کر کے فکر وتدبر اور علم وعمل کی روایات قائم کیں، وہ سب حقیقت میں اسلام کی تعلیمات سے سرشار تھے، انہوں نے ملک وملت کی فتح مندی اور کامرانی کے لئے جان کے نذرانے پیش کئے تھے، اسلامی جہاد پر ان کا یقین تھا، مگر اب ہم کیا ہو گئے ہیں کہ ان کے کارناموں کو بھی بھول جانے لگے ہیں، ہمارے منہ ان سے پھیرنے لگے، انہوں نے حصول آزادی اور انسداد غلامی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی، مگر ہم نے غلامی کو اپنا شیوۂ زندگی بنا لیا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ارکان کے روہنگیا مسلمان بحیثیت قوم ایک زندہ دل اور معزز قوم ہے، جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ اس قوم کے اسلاف نے اپنے وطن میں ایمان وعقیدہ مسلک ومذہب کی تبلیغ واشاعت کے لئے قندیل نورانی اور چراغ روحانی جلایا تھا، یہاں انہوں نے وہی کچھ کیا، جو اسلام نے ان سے مطالبہ کیا تھا، انہوں نے یہاں کی اجڈ اور غیر مہذب قوموں کو اسلام کی روشن تہذیب وثقافت سے روشناس کرایا، اور ایک دنیا کی دنیا کو ظلمت واندھیاری کے مہیب طوفان سے نکال کر ہدایت وروشنی کی طرف لے آیا تھا، ان کی وجہ سے یہاں کی اجڈ قوموں کو وہ زندگی ملی، جس کے حصول کے بعد انسان تمام مخلوقات خداوندی سے برتر ہو کر اعلی سے اعلی مقام اور بلند سے بلند تر مراتب پر فائز ہو جاتا ہے۔

ہمارے ان بزرگوں کی دعوت وعزیمت کے واقعات اور کارناموں کی دھندلی سی نشانیاں اور جھلکیاں جو تاریخ کے صفحات میں ملتی ہیں، ان سے یہ اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ انہوں نے اشاعت دین اور تبلیغ ملت اسلامیہ کے لئے زمانے کی چاہت وطلب کے مطابق مختلف حکمت عملیوں کو اپنایا تھا، ان میں سے ایسے بھی پائے جاتے ہیں، جو اس راہ دعوت وعزیمت میں اپنی اخلاقی بلندیوں، ذاتی خوبیوں اور کرداری رعنائیوں سے لوگوں کو متوالے بنائے اور اجڈ لوگوں کو اسلام کے حلقہ بگوش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ان میں سے بعض عبقری شخصیات ایسی بھی پائے جاتی ہیں، جنہوں نے اپنے تطبیقی فیصلوں سے جہاد فی سبیل اللہ کے میدان کا انتخاب کیا، اور تیر وتفنگ، تلواروں اور نیزوں کے سائے تلے پل کر اسلام اور مسلمانوں کی آبرو بچائی تھی، اور جب بھی موقع ملا تو یہاں اسلام کا نظام بھی قائم کیا، اور امن وآشتی، عدل مساوات کے ذریعے امن وطمانیت کی فضا قائم کر دی تھی۔

ہم اپنے ان بزرگوں میں عالی مشرب صوفیاء ودرویش، عالی ہمت علماء وصلحاء، روشن خیال شعراء وادباء، اور عالی مقام مولفین ومصنفین، دل دردمند دعاۃ ومصلحین، فکر ارجمند کے مالک دانشوران وسیاست دان، جان سوز رہنما ومرشدین، کوہ ہالہ سے ٹکر لینے والے قائدین وشہسواران، غرض سب کچھ پاتے ہیں، انہوں نے ہر دور میں بدلتی ہوئی صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور وقت کی فضا اور ماحول کو خوب خوب سمجھا تھا، اور اپنے اپنے زمانے میں اپنی اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق دینی اور قومی ذمے داریاں خوب خوب نبھائی تھیں۔

پہلی صدی ہجری سے لے کر اب تک ہم اپنے بزرگوں کو اسلام اور انسانیت، ملک اور قوم کی خدمات انجام دینے والے پاتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک چلنے والا جو سلسلۂ دعوت وجہاد نظر آ رہا ہے، یہ دراصل ہمارے ان ماضی کے بزرگوں کی خدمات کی ایک روشن کڑی ہے، جس طرح ماضی میں ہمارے بزرگوں نے زمانے کی پر کٹھن پگڈنڈیوں کی چکر کاٹتے ہوئے اس سلسلہ کو باقی رکھا تھا، ٹھیک آج بھی ان کے نہج پر یہ سلسلہ منزل کی طرف رواں دواں نظر آتا ہے۔

۱۹۴۲ء میں ہمارے بزرگوں نے ایک مرتبہ علم جہاد بلند کیا تھا، یہاں مسلمانوں کی جان ومال، عزت وناموس کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی، اس حوالے سے بہتوں نے اپنی اپنی جان کے نذرانے پیش کئے تھے۔ ٹھیک اسی طرح ۱۹۴۷ء میں حضرت جعفر حسین قوالی شہید نے ہمارے بزرگوں

کے اس جہادی سلسلہ کو مزید نکھارا اور آگے بڑھایا تھا، بعد میں ان کے متبعین اور خوشہ چینوں نے ان پر چھائی ہوئی خزاں کو بہار کی شبنم سے آبیاری کرنے کی کوشش کی ہے، کیا ہم ان تمام حضرات کی خدمات وکارناموں کو یکسر بھلا سکتے ہیں؟ کیا وہ عقیدت ومحبت کے کم سے کم گلدستے پانے کے لائق بھی نہیں ہیں؟ جی ہاں حق تو یہ ہے کہ ان پر عقیدت ومحبت کے جتنے بھی گلدستے نچھاور کئے جائیں تو بھی کم ہیں، ہم ان کے عقیدے و مسلک، فکر وجذبات، اولوالعزمی وعالی مشربی، قربانی وجان نثاری، اخوت ومحبت، پیار اور ہمدردی، عبادت و خدا ترسی، صبر وحق پسندی، فدائیت وللّٰہیت کو تہ دل سے سراہتے ہیں، اور ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بلندیوں اور کرداری روشنیوں کو موجودہ لوگوں اور آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ اور معالم الطریق بھی سمجھتے ہیں۔

۱۹۴۲ء سے لے کر آج تک اس راہِ دعوت وعزیمت میں ہزاروں فدایان ملت وقوم نے اپنے بزرگوں کی طرح جان کے نذرانے پیش کئے، جن کی تفصیلات کے لئے ایک اکیڈیمی کے زیر سائے مرتب ہونے والا ایک موسوعہ کی ضرورت ہوگی۔ تحریک آزادی ارکان کے زیر سائے کام کرنے والے تمام مجاہدین وقائدین باشعور، زندہ دل اور مستقبل سے باخبر تھے، حقیقت میں یہ لوگ گفتار کے غازی نہ تھے، بلکہ کردار وعمل ان کی زندگی کا شیوہ بن چکا تھا، قربانی اور ایثار ان کی زندگی کا مقصد اصلی تھا، انہوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں سے درس عبرت حاصل کیا، دعوت و جہاد اسلامی کو شیوۂ حیات بنایا، انہوں نے طاغوت کی غلامی اختیار کرنے کے بجائے خون کا متلاطم سمندر پار کرنے کو مناسب سمجھا تھا، ان لوگوں نے کسی بھی قسم کی غلامی کو قبول نہیں کیا، اسلام کی بقا اور اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کے لئے دل کو دہلا دینے والے طوفان سے مقابلے پر مقابلہ کیا تھا۔

مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم میں سے بعض کوربین اور نادان افراد آج اپنے ان بزرگوں کے جمیع مثبت کارناموں کو منفی نظروں سے دیکھ رہے ہیں، حتی کہ چند افراد ایسے بھی نکلے ہیں کہ وہ نہ صرف جہادو کفاح سے جی چراتے ہیں بلکہ انہیں برمیوں کی غلامی سے دلچسپی اور دل لگی اور طلب آزادی کی جدو جہد سے نفرت اور چھیڑ ہے، ان کے دل وضمیر کو اداسی اور نامرادی کی لت کھائی جارہی ہے، انہوں نے قوم کی جائز چاہت وطلب کو جھانسہ دے کر دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرنے کو پسند کرلیا ہے۔

یہ بات جس بزرگ کی زبان یا قلم سے نکلی ہے بڑی سچی نکلی ہے کہ ایک قوم کی مذلت کو دو چار افراد کی

کوشش دور نہیں کرسکتی، اسے دور کرنے کے لئے پوری قوم کو پوری تیاری، مستعدی اور دل سوزی کے ساتھ اجتماعی انداز میں کوشش کرنی ہوگی، ایک قوم کی سب سے بڑی خطا یہ ہوتی ہے کہ وہ ظلم واستبداد، جبر وتشدد کے خلاف لڑنے اور حق کی آواز بلند کرنے سے دست بردار ہوجائے، چند افراد کے خون کے آنسو ایک قوم کی مظلومیت کے مقابل نہیں ہوسکتے، بلکہ مقابلہ کے لئے پوری قوم کی اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج ارکان کے روہنگیا مسلمانوں کو اپنے بجھتے ہوئے چراغ کو بچانے کے لئے شعلوں سے ٹکر لینے والے جان سوز پروانوں کے خونِ جگر کی ضرورت ہے، جس کے بغیر خزاں کا مارا ہوا یہ گلستان شبنم بہار سے کبھی بھی آشنا نہیں ہوسکتا۔

ہمارے پچھلے بزرگوں کی خدمات وکارناموں کے حوالے سے راقم الحروف کا اتنا یقین ہے کہ ہماری قومی وملی زندگی میں جتنے دھارے بہہ گئے اور آج بھی ایک حیرت انگیز انداز میں بہہ رہے ہیں، سیاست وقیادت کے جتنے چشمے ابل پڑے، اور میدان کارزار میں جتنی پاک روحوں کے عزائم بیدار، جوں، اور دار ورسن کی کشاکش سے غیر متزلزل رہے، یہ بس ان بزرگوں کی قربانی، جاں سوزی، اخلاص وللّٰہیت اور فدائیت کا فیضان ہے۔

یاد رہے کہ غیرت مندوں اور غازیوں کے روشن کارناموں اور ان کے اثرات ونتائج کا صحیح صحیح اندازہ مقبوضات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، جشن وجلوس کی ہماہمی، عیش وعشرت کا طرب ونشاط، تختوں اور تاجوں کی چمک دمک، تیر وتفنگ، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار سے نہیں کیا جاسکتا، اس کا صحیح صحیح اندازہ ٹوٹی ہوئی تلواروں، بکھرے ہوئے خیموں، دہکتی ہوئی روحوں، دمکتے ہوئے چہروں اور بہتے ہوئے خون کے دریاؤں سے کیا جاسکتا ہے۔

اور یہ بھی اچھی طرح یاد رہے کہ ظالم کے ظلم وجبر، استبداد وستم رانیاں جتنی بھی تپاں کیوں نہ ہوں، مگر ہر طلوع کے پردے میں رازہائے زوال مضمر ہوتے ہیں، دنیا میں آج تک صبح کو بلند ہونے والا تپاں سورج اپنے غروب کے دھیما پن سے عہدہ برآ نہیں ہوسکا، یہی حال ارکان کے مسلمانوں پر مظالم ڈھانے والوں کا ہوگا، انشاء اللہ۔

آج ہم ارکان کے روہنگیا مسلمان جن حالات کے شکار ہیں، اور ہماری قومی تحریک نے پچھلے چند سالوں

سے جس قسم کی چھلانگ لگا رکھی ہے، اس میں امید کی کرنی بڑی دھیمی نظر آ رہی ہے، جہاں تک سیاست وقیادت کی دنیا میں قدم رکھ کر اندازہ کیا، اس کے پیش نظر ہمارے لئے یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ پچھلے چند سالوں سے روہنگیا مسلمانوں کی سیاست وقیادت کا قدم آیا منزل کی طرف بڑھ رہا ہے یا یہ میدان تیہ کی چکر کاٹنے میں مصروف؟ آیا روہنگیا مسلمانوں کی کہنے میں بڑی بڑی جماعتیں سیاست وانقلاب کے میدان میں اپنا واضح نصب العین جو غیر متزلزل ہو، متعین کر سکیں یا آئے دن اس حوالے سے غلطی پر غلطی کا مظاہرہ کر رہی ہیں؟ ظاہر ہے کہ جو قوم سیاست کے میدان میں ایک قدم بھی غلط اٹھا دیتی ہے، تو اس کی تقدیر کا قدم صدیوں پیچھے چلا جاتا ہے، جس کا خمیازہ اس قوم کو نسلاً بعد نسل بھگتنا پڑتا ہے، اگر ہمارا اس طرح کا حال مزید باقی رہے گا تو آگے چل کر تباہیوں اور بربادیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا، اس لئے عرض ہے کہ ہمیں اپنے اگلے قدم کو جوش کے بجائے ہوش سے ڈالنا ہوگا، اللہ تعالی ہمیں توفیق سے نوازے۔

بہر حال ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ مایوسی ایک ایسی بیماری ہے جو قوموں کے جسم سے عزم و عمل کی ساری توانائیوں کو سلب کر لیتی ہے، مایوسی کی وجہ سے انسان کے جذبات حالات کی بر فیلی پگڈنڈیوں میں ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں، ان کے اندر سے زندگی کی ساری امنگیں رخصت ہو جاتی ہیں، اور وہ مسلسل احساس کمتری میں مبتلا ہو کر بتدریج قعر مذلت میں گر جاتا ہے، اور جو قوم اپنی ذلت ونکبت پر راضی ہو کر جد وجہد کا دامن چھوڑ دیتی ہے، وہ قدرت کے تعاون سے محروم ہو جاتی ہے۔

اس لئے حالات جتنے بھی مایوس کن کیوں نہ ہوں، مگر اللہ تعالی کی ذات پر بھروسہ کرنا ہمارا فرض ہے، توکل اور صبر کے دامن تھامے ہمیں اپنے اندر از سر نو قوت مدافعت اور عزم وعمل کی توانائیاں لانی ضروری ہیں، اگر ہم نے اپنی رہی سہی صلاحیت واستعداد کو مستحکم کیا، تو یقین ہے کہ راستے کا کہرا ہمارے سروں سے جلد چھٹ جائے گا، جس سے ہمارے مستقبل کی راہیں روشن ہو جائیں گی، ہماری ترقی کا راستہ بڑی تیزی سے صاف ہو جائے گا۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روہنگیا قوم ایک سعادت مند قوم ہے، جس کی تقدیر میں جہاد کا فریضہ لکھا گیا ہے، اور یاد رہے کہ سرزمین ارکان ایک ایسی سرزمین ہے کہ جو جنوب شرق ایشیا کے لئے باب الاسلام کا درجہ رکھتی ہے، یہ زمین مستقبل میں ایک مضبوط اور غیر مسخر اسلامی گھاٹی میں تبدیل ہو سکتی ہے، اگر چاہے خدا کرے۔

بہر حال زیر نظر مجموعہ (تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے) ہماری آنے والی نسلوں کے لئے سعادت کی زندگی کا ایک پیغام ہے، جسے یادوں اور تذکاروں کا گلدستہ، آنسوؤں کا مالا، جان نثاروں کی روداد جان سپاری اور فدایان قوم وملت کی داستان الفت ومحبت کہا جا سکتا ہے۔ یہ مجموعہ ایک تاریخ تو نہیں، لیکن تاریخ کا احتجاج ضرور ہے، یہ مجموعہ فکری نظر بندوں کی کم نگاہی، مورخین یا تذکرہ نگاروں کا ماتم، سیاسی وانقلابی مجبوریوں کا نوحہ، پس ماندگان تحریک کا مرثیہ اور اسلامیاں ارکان کے جذبوں کا امین بھی ہے، اس مجموعہ میں جتنے بھی تذکرے ہیں تقریبا ہر ایک مختصر تجزیے پر مشتمل ہیں، مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ آج کی درسگاہوں سے درس خود فراموشی کرنے والے جوانوں کو یہ علم ہو کہ ہم کیا تھے اور اب کیا ہو گئے، اور یہ سوچے کہ ہماری حالت ایسی کیوں کر ہو گئی۔

اس مجموعہ میں شامل بیشتر ستاروں کے حالات وواقعات کو جمع کرنے میں بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑیں، کوشش تو کی گئی، مگر غلطی کے امکانات بہت ہیں، پھر ممکن ہے کہ قارئین کرام کو اس میں کہیں کہیں جذبات کا عنصر بھی نظر آئے گا، تاہم اس حوالے سے ہم کسی بھی معذرت کو اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے موضوع پر قلم اٹھانا ہے تو جذبات سے بالکل بر تر ہو کر اٹھانا امکانیات سے نہیں ہے، لیکن یہ بھی یہ وضاحت کی ضرورت ہے کہ یہ جذبات صرف اسلوب نگارش اور بیان احوال کی حد تک ہے، حقائق وواقعات کی استنادی حیثیت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ **هذا، و صلى الله تعالى على خير خلقه محمد واله وصحبه وسلم۔**

بیاد رفتگاں دو چار آنسو
یہی اپنا فریضہ رہ گیا ہے

خاکسار/

محمد طاہر جمال ندوی

۰۳/دسمبر/۲۰۲۲ء

حضرت مولانا ابوحنیفہ صاحب کیلا دنگی

دور آخر میں سرزمین ارکان میں فقیہ العصر کے لقب سے معروف عالم دین حضرت مولانا ابوحنیفہ صاحب کی پیدائش جنوبی منگڈو کی بستی کیلا دنگ میں تقریباً سن ۱۹۰۰ء میں ہوئی، آپ کے والدین کے متعلق کوئی معلومات تادم تحریر نہیں مل سکیں۔

مکتب نشینی کے بعد مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے مختلف مدارس میں حاصل کی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر چند سال کی پڑھائی کے بعد سند فراغت حاصل کی۔

فراغت تعلیم کے بعد مولانا وطن واپس آئے، اور مولانا اسعد اللہ صاحب گرجنڈیاوی (سابق مہتمم مدرسہ عالیہ شقدارفارہ) کی ہمشیرہ سے شادی کی، مولانا ایک عظیم خادم قوم تھے، چنانچہ آپ کی خدمات کے حوالے سے حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی کا بیان ہے کہ:

''مولانا اپنے علاقے میں شرعی معاملات کا صحیح صحیح حل دیا کرتے تھے، دور دراز سے آنے والے معاملات اور استفتاء کے جوابات بھی دیا کرتے تھے، مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں سالانہ امتحان کے مواقع پر آپ کو بحیثیت ممتحن دعوت دیا جاتا تھا، موقع بموقع طالب علموں کو امعان نظر کے ساتھ پڑھنے، تحقیق اور دقت نظر سے کتب بینی کرنے کی نصیحت کیا کرتے تھے، ہمیشہ کتب بینی کی اہمیت پر زور دیا کرتے تھے، علاوہ ازیں آپ نحو وصرف اور فقہ وفتاوی میں امتیازی شان رکھتے تھے''۔

شک نہیں ہے کہ مولانا ابوحنیفہ صاحب ایک جلیل القدر عالم باعمل اور وقت کے عظیم فقیہ انسان تھے، آپ نے ایک اطلاع کے مطابق ۱۹۷۵ء میں وفات پائی، اور کیلا ونگ کی سرزمین میں مدفون ہیں، ادھر جہاں تک پتہ چلا ہے کہ آپ کی صرف ایک اولاد ہے، وہ بھی اپنے لائق وفائق والد بزرگوار کی طرح فقیہ العصر بنے، جن کا نام گرامی مفتی مولانا فیض الحق صاحب کیلا دنگی ہے، اللہ تعالی مولانا فیض الحق صاحب کی حیات دراز کرے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا ابوسفیان صاحب کیلا دنگی

سرزمین ارکان کے علمائے اسلام میں داعیوں کی ماشاءاللہ کوئی کمی محسوس نہیں کی گئی، ان علمائے اسلام اور دعاۃ میں حضرت مولانا ابوسفیان صاحب کیلا دنگی بھی معروف حضرات میں شامل ہیں، مولانا کی پیدائش کیلا دنگ میں ۱۹۲۳ء میں ہوئی، آپ کے والد صاحب بھی ایک نیک اور شریف بزرگ تھے۔

مولانا نے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں حاصل کر کے مشرقی پاکستان کی معروف ومشہور دینی اور علمی درسگاہ مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ (چاٹگام) میں جا داخلہ لیا، وہاں سے آپ نے دورۂ حدیث نبویؐ کی تعلیم مکمل کی، آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت العلامہ مفتی عزیز الحق صاحب کے علاوہ حضرت مولانا امام صاحب علی احمد خیلی، حضرت مولانا علی احمد بوالوی، حضرت مولانا نورالاسلام صاحب (قدیم) اور میر سنن حضرت مولانا امیر حسین صاحب شامل ہیں۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ نے شادی خانہ آبادی کی سنت ادا کی، اس کے بعد قرآنی تعلیم کے ساتھ وابستہ ہوگئے، آپ نے علاقہ کے بہتوں دینی مدارس میں تعلیم دی، اور ساتھ ہی ساتھ دعوت جماعت تبلیغ سے وابستہ ہوکر سرزمین ارکان کے طول وعرض میں گھوم پھر کر مسلمانوں کو دینی تعلیمات سے روشناس کراتے رہے تھے، مولانا کے متعلق حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی فرماتے ہیں کہ:

''مولانا ابوسفیان صاحب حسن سیرت کے حامل ایک عالم باعمل انسان تھے، تقریباً پوری زندگی قرآنی تعلیم سے وابستہ رہ کر دعوت دین اسلام کو اپنا شعار بنا لیا تھا، جماعت تبلیغ سے خاص طور پر اپنے کو وابستہ کرلیا تھا، بعد میں حجاز مقدس پہنچے، وہاں بھی دعوت کے سلسلے میں کام کیا، جوار حرم پاک میں آپ کا میں قیام تھا، چنانچہ ہمیشہ حرم کعبہ میں نماز باجماعت ادا کرتے رہے تھے''۔

مولانا ایک بڑے عالم دین، معلم اور داعی الی اللہ بزرگ تھے، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک میں یکتائے روزگار تھے، آپ کا انتقال مکہ معظمہ میں ۱۹۹۳ء میں ہوا، اور اس سرزمین مقدس میں اسودۂ خاک ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا ابوالفیاض خلیل صاحب دھونسوی

محترم مولانا ابوالفیاض بن حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب کا شمار سرزمین ارکان کے ان چند صاحب فکر علماء میں ہوتا ہے، جنہوں نے خاک وخون میں لپٹے ہوئے وطن عزیز کو اپنے آنسوؤں سے دھونے کی کوشش کی، اوراس خزاں دیدہ گلشن میں پھر سے باد بہار لانے کی جدو جہد کی تھی، جہاں تک مولانا کو میں نے دیکھا کہ آپ ایک دل دردمند اور فکر ارجمند کے مالک عالم دین، سیاسی مبصر اور صحافی ہونے کے ساتھ شعلہ بیان خطیب بھی ہیں۔

مولانا ابوالفیاض خلیل صاحب ۱۶ / مارچ / ۱۹۴۹ء میں اپنی آبائی بستی دھونسے میں پیدا ہوئے، چونکہ موصوف کا پورا خاندان علماء اور دانشوروں کا خاندان رہا ہے، یوں ظاہر ہے کہ تعلیم کے حوالے سے آپ کو کسی قسم کی پریشانی اور الجھن نہیں ہوئی، یوں آپ نے ابتدائی اور متوسطہ کی کچھ تعلیم اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب کے ہاتھوں پائی، مزید متوسطہ کے علاوہ اعلی دینی تعلیم کے حوالے سے خود مولانا محترم کا بیان ہے کہ:

''میں نے ابتدائی اور متوسطہ کی دینی تعلیم اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پائی، بعد میں مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں داخلہ لیا، وہاں میں نے چار سالوں تک تعلیم حاصل کی تھی، اس درسگاہ میں متداول درس نظامیہ کی بعض متوسطہ کی کتابیں بھی پڑھیں، چار سال کے بعد میں ۱۹۶۵ء میں دوبارہ وطن واپس لوٹا اور مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں داخلہ لیا تھا، جہاں میں نے ایک سال بعض دیگر کتابیں پڑھیں، پھر ۱۹۶۶ء میں ہندو پاک کی جنگ بندی ہوئی تو میں اعلی تعلیم کے لئے پاکستان کے شہر کراچی پہنچا اور دار العلوم کراچی میں داخلہ لے کر ۱۹۶۷ء تک پڑھتا رہا، اس کے بعد اگلے سال ۱۹۶۷ء کے اواخر میں سرزمین پاکستان کی اور ایک معروف دینی اور علمی درسگاہ ٹنڈ اللہ یار جہاں میرے والد کے جگری دوست حضرت مولانا عبدالمالک صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک نیر تاباں بن کر چمک رہے تھے کے سامنے زانوئے تلمذ خم کیا، اوراس درسگاہ سے سند فراغت بھی حاصل کی، اس کے بعد میں دوبارہ کراچی پہنچا اور ۱۹۶۹ء کے اواخر

میں سرکاری اسکول سے مٹرک کا امتحان پاس کیا، بعدازاں لیاقت نیشنل ہسپتال میں داخلہ لیا اور چار سال پر محیط بڑی محنت اور تندہی سے پڑھ کر طبابت یعنی ڈاکٹری کی ڈگری بھی حاصل کرلی تھی''۔

مولانا نے تعلیم سے فراغت کے بعد کراچی میں ایک کلنک کھولی تھی، مگر اسے زیادہ دیر تک نہ چلا سکا، اور بعض وجوہات کی بنیاد پر وطن واپس لوٹنے کو مناسب سمجھا، چنانچہ آپ نے ۱۹۷۴ء کے اواخر میں وطن کی راہ لی تھی۔

وطن واپس آتے ہی آپ نے شادی کی سنت ادا کر لی، سرزمین ارکان کی معروف عالم دین ومنتظم حضرت مولانا اسد اللہ صاحب گرجنڈ یوی کی بھتیجی محترمہ زاہدہ بنت مظفر احمد چوہدری سے آپ نے شادی رچائی، جس میں اللہ تعالی نے بڑی برکت دی، شادی کے بعد چند مہینے گزرتے نہ گزرتے بعض حالات کے پیش نظر آپ کو ترک وطن کرنا پڑا۔

مولانا شاید چاٹگام میں کچھ عرصے تجارت میں بھی رہے ہوں گے، جس کے بارے میں مولانا کے اس بیان سے پتہ چلا ہے کہ:

''چاٹگام شہر کے سابق میور عوامی لیگی لیڈر جناب محی الدین چوہدری سے میرا تعارف رہا، ان کے ساتھ ظہور مارکٹ چاٹگام کی تاسیس میں میرا ہاتھ بھی رہا تھا''۔

مولانا محترم ۱۹۷۴ء میں سرزمین ارکان کے حوالے سے زیرزمین کام کرنے والی معروف تنظیم روہنگیا فدائین محاذ (RPF) میں شامل ہو گئے، آپ نے اس تنظیم میں شامل ہوکر بڑی تندہی سے کام کیا، اگرچہ آپ نے ۱۹۷۶ء میں حجاز مقدس کی راہ لی اور مکہ المکرمہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، لیکن سرزمین مقدس میں بھی تنظیمی کاموں کو آگے بڑھانے میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں چھوڑی، اور حضرت قائد محمد جعفر حبیب کے انتقال تک اس میں مسلسل جدو جہد کرتے رہے تھے، یاد رہے کہ آپ مرحوم قائد کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، اور قائد کا آپ پر بڑا اعتماد بھی رہا تھا۔

۱۹۷۵ء میں ارکان ہسٹریکل سوسائٹی (AHS) کی تاسیس ہوئی تو آپ اس میں شامل ہو گئے، چنانچہ اس سال سے لے کر تادم تحریر آپ اس جماعت کے فعال کارکن اور وفادار رہے ہیں، جہاں تک میں نے دیکھا کہ سوسائٹی کے رہنما جناب الحاج ابوالکلام صاحب خونیہ فاروی کے آپ بڑے قریبی اور معتمد خاص ہیں، دراصل و فا اسی کا نام ہے کہ دوست ہر حال میں دوستی اور وفا شناسی کا حق ادا

کرتے رہے، مولانا نے اس جماعت کے سائے تلے قوم وملت کی انگنت خدمات انجام دیں، اور اب بھی دے رہے ہیں، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر دے۔

مولانا ایک جاندار قلم کار بھی ہیں، آپ کی بعض تالیفات راقم السطور کی نظر سے گزریں، ان میں سے ایک تالیف ''سنہری باتیں'' جو مولانا نے از راہ کرم راقم السطور کو عطا کی تھی، ماشاء اللہ بڑی جاندار اور شاندار تصنیف ہے، جو پند ونصائح اور گوہر پاروں پر مشتمل ایک حسین جمیل گل دستہ ہے، مولانا نے بڑی تلاش وجستجو اور بڑی عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے اس کاوش کو منظر عام پر لایا ہے، مولانا علم کے بڑے رسیا ہیں، تعلیم کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

> ''تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لئے کتاب ایک اہم جز و ہے، تعلیم ایک ایسا شعبہ ہے جو کسی بھی ملک کے دیگر شعبوں کی بنیاد ہے، تعلیم کے ذریعے صرف افراد کی ہی نہیں بلکہ ایک قوم کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے، افراد کی ذہنی صلاحیتو کا نشوونما اور ان میں اعلی صفات پیدا کر کے انہیں ملک وقوم کی فلاح اور ترقی کے لئے تیار کرنا تعلیم کا بنیادی اور اولین مقصد ہے''۔

مولانا محترم مزید لکھتے ہیں کہ:

> ''علم کے ذریعے ہمیں مادی ہی نہیں بلکہ روحانی سکون بھی حاصل ہوتا ہے، تعلیم انسان کو شعور دیتی ہے، شعور کا مطلب دال روٹی کا حصول نہیں، بلکہ معاشرے کو اعلی کردار کے حامل افراد عطا کرنا ہے''۔

ماشاء اللہ مولانا ایک صاحب بصیرت صحافی بھی ہیں، قوم وملت کے دکھ بھرے حالات وواقعات پر مشتمل آپ کے چند مضامین راقم السطور کی نظروں سے گزرے، سعودی عرب سے نکلنے والا اردو یومیہ میں آپ نے وقت وقت پر بعض مضامین ''نامے'' کی شکل میں لکھے، ماشاء اللہ جو کچھ لکھتے ہیں بڑے شاندار لکھتے ہیں، اللہ تعالی مزید توفیق عطا کرے۔

مولانا بڑے خوش اخلاق، انسان دوست اور متعاون انسان ہیں، یکم اپریل/ ۲۰۱۳ء میں مولانا سے میں نے ان کی رہائش گاہ مکہ مکرمہ میں ملاقات کی، یوں تو آپ سے رہ رہ کر ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں، مگر اس ملاقات میں آپ نے جو اپنی زندہ دلی اور روشن خیالی کا مظاہرہ کیا، وہ نا قابل فراموش ہے۔

قوم وملت کے حوالے سے ہونے والی کسی بھی کوشش میں آپ کبھی بھی پیچھے نہیں رہے، میرے علم کے

مطابق درجنوں مرتبہ اس حوالے سے آپ نے بنگلا دیش کا سفر کیا، اور حجاز مقدس میں بھی جہاں تک دیکھا گیا کہ قومی مجلسوں میں دعوت ملتے ہیں حاضر ہو جاتے ہیں، ان مواقع میں راقم السطور کی ملاقاتیں آپ سے ہوتی رہتی ہیں۔

جون/ ۲۰۱۳ء میں منظمۃ التعاون الاسلامی (OIC) کی مرکزی دفتر جدہ سعودی عرب میں ارکان روہنگیا یونین (ARU) کا دوروزہ اجلاس منعقد ہوا، جس میں آپ نے ارکان ہسٹریکل سوسائٹی کی نمائندگی کی، یہاں آپ نے اپنے کارآمد مشوروں کے ذریعے بڑا کارنامہ انجام دیا، آپ کے کردار بڑی دیدنی تھے، مولانا اس عمر میں بھی فعال کردار ادا کرنا چاہتے تھے، ماشاء اللہ آپ ارادے کے پختے اور آپ کے خیالات روشن امیدوں سے مالا مال ہیں، اللہ تعالی فکر وجذبات سے مخمور قوم کے اس فعال کارکن عالم دین کی تمام امیدیں بھر لائیں اور آپ کی حیات کی برکت کی شکل میں آپ کے سایۂ عاطفت ہم جیسے غریبوں اور غریب الدیاروں پر تادیر باقی رکھے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا قاری ارشاد حسین صاحب قاسمی اودنگی

حضرت مولانا قاری ارشاد حسین بن مولانا نجم الدین صاحب جنوبی منگڈو کے گاؤں اودنگ میں تقریبا ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے، آپ نے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان روانہ ہوگئے اور ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، جہاں سے آپ نے ۱۹۴۴ء میں فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد آپ نے شعبۂ قراءت اور تخصص فی الافتاء میں داخلہ لیا، جو تین سال میں مکمل کیا تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ ۱۹۴۷ء میں اپنے وطن واپس آ گئے اور ۱۹۴۸ء میں مدرسہ عالیہ شقدارفارہ میں استاد مقرر ہوئے، اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں برمی دارالحکومت رنگون چلے گئے، وہیں ایک سال رہنے کے بعد مولمین پہنچے، وہاں آپ نے مولمین سے تعلق رکھنے والے جناب عبدالستار صاحب کی صاحبزادی نور عائشہ سے شادی کی۔

۱۹۵۰ء میں دارالعلوم صوفیہ تاموے Botataung میں آپ کو استاد مقرر کیا گیا، جہاں آپ نے بائیس سال تک خاص طور پر حدیث کا درس دیا، دریں اثناء ۱۹۶۱ء میں برمی ریڈیو اسٹیشن میں روہنگیا پروگرام کے کلیم اللہ صاحب آپ کی رہائش گاہ تشریف لائے، اور برما میں دیسی زبانوں کے پروگراموں کے تحت روہنگیا زبان کے پروگرام کی نشریات میں حصہ لینے کی درخواست کی تو برما براڈ کاسٹنگ سروس (BBS) کے روہنگیا پروگرام سے آپ منسلک ہوگئے، آپ ۱۹۶۵ء تک روہنگیا نشریات سے وابستہ رہے، جہاں وہ قرآن مجید کی تلاوت سے نشریات کا آغاز کرتے تھے، یاد رہے کہ جناب کلیم اللہ صاحب بوسیدنگ سے تعلق رکھنے والے روہنگیا تھے، جو برما کے ریڈیو اسٹیشن کے پہلے سرکاری براڈ کاسٹر اور روہنگیا زبان کے نیوز کاسٹر تھے، اور جو برما میں مقامی لوگوں کی زبان کے طور پر روہنگیا پروگرام کے لئے رنگون ریڈیو سے منسلک رہے تھے۔

حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کے متعلق صدیق مکرم حضرت مولانا محمد امین صاحب ندوی اپنے جاندار مقالہ میں لکھتے ہیں کہ:

''آپ خوش الحان قاری، اعلی پایہ کے عالم اور شیخ الحدیث تھے، عربی حروف میں لکھی جانے والی روہنگیا زبان میں قرآن مجید کے مترجم اور مفسر تھے، آپ کی قراءت برمی ریڈیو اسٹیشن (Burmese Broadcasting service (BBS) کے روہنگیا زبان کے پروگرام میں 17، 67، 26 اور 162 میٹر بینڈ سے نشر کیا جاتا تھا، اور یہ پروگرام برما کے دیگر خالص دیسی نسل کے اقلیتی اقوام کے پروگراموں کی طرح ۱۵/مئی/۱۹۶۱ء سے یکم/اکتوبر/۱۹۶۵ء کے درمیان نشر کیا جاتا تھا''۔

رنگون ریڈیو کے اس روہنگیا پروگرام کو یکم اکتوبر/۱۹۶۵ء میں فاشست فوجی حکمرانی کے دوران جنرل نیون نے غیر منصفانہ طور پر دیگر تین اقلیتی اقوام کی زبان کے ساتھ بزور طاقت بند کر دیا تھا، اس کے بعد ۱۹۸۲ء کے جابرانہ بدنام زمانہ قانون کے تحت روہنگیا مسلمانوں کی شہریت کے حقوق بھی چھین لئے گئے تھے۔

۱۹۷۲ء میں دارالعلوم صوفیہ میں اپنی خدمات مکمل کرنے کے بعد آپ مدرسہ نعمانیہ Preseden رنگون میں ایک سال کے لئے مدرس مقرر ہوئے، اس مدرسہ کے آپ بانی بھی ہیں، جب مولانا سعید اللہ صاحب اس کے ذمہ دار بنے تو انہوں نے اصرار کیا کہ اس کی بابرکت شروعات کے لئے کم از کم ایک سال کے لئے آپ یہاں تشریف لائیں۔

مولانا ۱۹۷۳ء میں مدرسہ فرقانیہ Theingyang رنگون میں حدیث کے بطور اعلی استاد مقرر ہوئے، جہاں آپ نے ارکان پھر سعودی عرب روانگی تک چھ سال بخاری شریف اور دیگر کتابوں کا حسن وخوبی کے ساتھ درس دیا۔

آپ ۱۹۸۰ء میں ارکان چلے آئے، اور حج اور عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے حجاز مقدس کا سفر کیا، جہاں وہ تقریبا چھ سال مدینہ منورہ میں رہے، اور ان دنوں میں وہ مستشفی صفاء المدینہ (قباء حی البحر، ابان الربعی، الجمعہ) کے قریب مسجد طیبہ میں امامت کے فرائض انجام دیئے، جو شارع الامام احمد بن حنبل میں حرم نبوی کے جنوب مشرق کی طرف دو کیلو میٹر کی دوری پر واقع ہے، مسجد سے منسلک المدرسۃ الفرقانیہ لتحفیظ القرآن الکریم میں بھی حفظ وقراءت کی تدریسی خدمات انجام دیں، نیز آپ

مدرسۃ دار الحدیث المدینہ باب مجیدی میں چار سال تک حدیث کی تعلیم وتدریس میں مشغول رہے، آپ کی خدمت حدیث نبویؐ کی قدر کرتے ہوئے شاہ فہد نے شرف باریابی سے مشرف کیا، اور خصوصی کرم فرماتے ہوئے آپ کو ایک خصوصی تمغہ بھی عطا کیا، جس سے آپ کو کافی سہولت ملی تھی۔

آپ ۱۹۸۶ء میں سعودیہ سے جب وطن واپس تشریف لائے تو مدرسہ عالیہ شقدار فارہ کے مہتمم حضرت مولانا اسداللہ صاحب نے آپ کو مدرسہ عالیہ میں شیخ الحدیث کے منصب سنبھالنے کے لئے اصرار کیا تو آپ تین سال تک شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوکر تشنگان علوم نبویؐ کو سیراب کرتے رہے۔

۱۹۸۹ء میں مولانا ارشاد حسین اپنے اہل محلہ کے اصرار پر اپنے آبائی گاؤں اودنگ واپس آگئے، اور مدرسہ اشرف العلوم اودنگ میں درس حدیث میں از سرنو مشغول ہوگئے، جس میں بطور خاص مسلم شریف کا درس آپ کا ذمہ رہا تھا۔

جب ریاست ارکان میں مسلمانوں کی حالت دن بدن ابتر ہونے لگی، ۲۵/ اگست ۲۰۱۷ء کو روہنگیا مسلمانوں کے خلاف رونما ہونے والے تشدد اور قتل عام کے دوران آپ کے گاؤں کو نذر آتش کرکے زمین بوس کردیا گیا، اور قابل ذکر تعداد میں سرکردہ مسلمانوں کو گرفتار کرکے قید کی حالت میں قتل اور ذبح کرکے شہید کردیا گیا تو آپ اپنے خاندان اور گاؤں کے زندہ بچ جانے والوں کے ساتھ اپنے مذہب اور جان بچانے کے لئے پڑوسی ملک بنگلا دیش میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے، اور کوکس بازار بنگلا دیش کے مہاجر کیمپ میں قیام پذیر ہوگئے۔

مولانا کے اس کے بعد کے حالات کے متعلق محترمی مولانا محمد امین صاحب ندوی رقمطراز ہیں کہ:

''جب ۲۹/ جولائی/ ۲۰۱۹ء کو وائس آف امریکہ سے روہنگیا پروگرام شروع ہوا اور روہنگیا ریفیوجی کیمپ کوکس بازار سے اس پروگرام کے متعین نمائندے مختلف قسم کے سماجی اور سیاسی خبریں وغیرہ کی رپورٹنگ شروع کی تو راقم الحروف نے ان کو توجہ دلایا کہ ۱۵/مئی/۱۹۶۱ء کو شروع ہونے والے رنگون ریڈیو کے روہنگیا پروگرام میں قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے مولانا قاری ارشاد حسین اس وقت ریفیوجی کیمپ میں ہیں، ان کا انٹرویو نشر کیا جائے، تو اس پر عمل ہوا، اس طرح

پوری دنیا میں پھیلے ہوئے روہنگیا مسلمانوں کو اس عظیم ہستی کے بارے میں علم ہوا اور ملاقاتوں کا تانتا بندھ گیا، انٹرنیٹ اور شوشل میڈیا وغیرہ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ شائع ہوا''۔

بنگلا دیش کے پناہ گزین کیمپ میں آنے کے بعد آپ نے ۲۰۱۲ء سے ترکی حکومت کی روہنگیا مسلمانوں کے بارے میں غیر معمولی خدمات کے پیش نظر صدر جناب رجب طیب اردوگان کے نام روہنگیا مسلمانوں کی حالت زار اور ان کی پناہ گزینی کے بارے میں خط لکھا، جس پر صدر صاحب نے اپنے نمائندوں کے ذریعے روہنگیا مسلمانوں کے مسئلہ کے حل کے لئے کوششوں کا بھرپور یقین دلایا، اور اس میں کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعاؤں کی ضرورت پر زور دیا، اور کچھ گرانقدر ہدایا اور تحائف بھی بھیجے، علاوہ ازیں چھ مرتبہ ترک نمائندے آپ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ مع خاندان ترکی چلے آئیں، لیکن آپ نے اپنے رشتہ داروں اور متعلقین اور ہم وطنوں کو چھوڑ کر جانا گوارا نہیں کیا۔

حضرت مولانا کے متعدد تصانیف اور تراجم ہیں، جن میں سب سے نمایاں منظوم فارسی کتاب ''کریما'' کا عربی حروف کی تاریخی روہنگیا زبان میں منظوم ترجمہ ہے۔

آپ نے ۱۸/ جنوری/ ۲۰۲۱ء بروز پیر کو اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور تقریبا ۱۰۶ سال کی عمر میں اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف کوچ کرگئے، آپ نے اپنے پیچھے ایک طویل تاریخ اور اپنے مذہب اور لوگوں کی خدمات سے بھرپور ریکارڈ اور پسماندگان میں آٹھ اولاد واقارب چھوڑا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالی آپ کی مغفرت کرے اور اعلی علیین میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔

مولانا کی صفات عالیہ کے متعلق حضرت مولانا محمد امین صاحب ندوی لکھتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا ایک قابل احترام عالم، متقی و پرہیزگار ایک شاندار مدرس اور غیر معمولی صلاحیات کے مالک استاد تھے، آپ نے ارکان اور برما کی متعدد اسلامی جامعات میں نہایت عمدگی کے ساتھ حدیث نبوی کی تعلیم دی، اور وہ عبادت اور تقوی کے اولین مقام پر فائز تھے، انہوں نے ساری زندگی قیام اللیل اور نماز تہجد

کی پابندی کی‘‘۔

مولانا کی اولاد:

(۱) حسینہ: کی شادی ارکان سے تعلق رکھنے والے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدرس و شیخ الحدیث مدرسہ صوفیہ رنگون سے ہوئی، جو وہیں قیام پذیر ہیں۔

(۲) مولانا حافظ ارشد حسین: سابق امام (منشی رو) جامع مسجد منگڈو۔

(۳) الحاج مولانا حافظ قاری امجد حسین: شیخ الحدیث مدرسہ مولمین برما۔

(۴) حافظ قاری راشد حسین: بالوخالی کیمپ کوکس بازار میں مقیم ہیں۔

(۵) مولوی حافظ رشاد حسین: منگڈو، ارکان میں مقیم ہیں۔

(۶) حمیدہ: جن کی شادی امین اللہ سے ہوئی، جو عرب امارات میں مقیم ہیں۔

(۷) انجینئر حافظ ساجد حسین: جو رنگون میں مقیم ہیں۔

(۸) حبیبہ: جن کی شادی مامون الرشید سے ہوئی، جو رنگون میں مقیم ہیں۔

حضرت مولانا امجد حسین صاحب شیتا فوریکوی

مولانا امجد حسین صاحب بن محمد امین جنوبی منگڈو کے معروف قصبہ شیتا فوریکہ میں پیدا ہوئے، اس علاقے میں آپ کا خاندان بڑا نامور ہے، حسب ونسب کے اعتبار سے اس خاندان کو بلی (پہلوان) کا خاندان کہا جاتا ہے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں ہوئی، متوسطہ کی دینی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں پائی، پھر اعلی تعلیم کے لئے پاکستان کا سفر کیا اور لاہور کی معروف دینی اور علمی درسگاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد مولانا وطن واپس آکے علاقے کے متعدد مدارس میں تعلیم دیتے رہے، آپ کا شمار علاقے کے بلند پایہ علمائے دین میں ہوتا ہے، عربی نحو وصرف کے بڑے استاد مانے جاتے ہیں، آج کے بہت سارے علمائے کرام اور مفتیان عظام آپ کے تلامذہ ہیں۔

مولانا محمد حنیف راغب فرندگی کی قیادت میں اتحاد المجاہدین ارکان کی بنیاد پڑی تو آپ اس تنظیم میں شامل ہو گئے تھے، آپ کے بیان کے مطابق بعد میں آپ اس تنظیم سے مایوس ہو گئے، پھر روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی دعوت پر آپ اس تنظیم میں شامل ہو گئے، اس تنظیم کے زیر سائے اپنے علاقے میں دعوت وتنظیم کا کام بڑی بے جگری سے سرانجام دیا، برمی حکومت کے ساتھ ساتھ بعض منافقین اور قوم کے غداروں سے پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا، بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ کو ہجرت کرنا پڑا تھا۔

۱۹۹۱ء میں آپ ہجرت کر کے بنگلا دیش آئے، سرحدی علاقے میں آپ نے مکمل جہادی تربیت حاصل کی، اور اپنی اولاد کو بھی عسکری تربیت دلا کر مجاہدین کے صف میں کھڑا کر دیا، چنانچہ آپ کی اولاد میں ابو یوسف سال ۱۹۹۴ء کے جہاد میں شریک ہو کر جام شہادت نوش کیا، چنانچہ جہاد کے حوالے سے آپ کا بیان ملاحظہ ہو کہ:

’’سچی بات تو یہ ہے کہ دین کی حقیقت خاص طور پر جہاد اسلامی کا مفہوم ہمیں روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) میں شامل ہو کر سمجھ میں آیا، اس تنظیم میں شامل ہونے سے پہلے یہی ہوتا تھا کہ ہم علماء تنظیم اور جہاد کے نام سے کبھی کبھار

کہیں جمع ہوجاتے تھے، جہاں زوردار تقریریں ہوتی تھیں، بس یہی ہمارا جہاد تھا، نہ کوئی جہادی تربیت اور نہ کہیں منصوبہ بندی، روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن میں شامل ہونے کے بعد جہاد کیا ہے سمجھ میں آیا، ہم نے اس تنظیم کو اپنے خیالات سے کہیں زیادہ فعال پایا، یہاں سے ہم نے باقاعدہ جہادی تربیت حاصل کی، اور میرے ساتھ میرے بیٹوں نے بھی اس کی تربیت حاصل کرلی، میرے ان بیٹوں میں ابو یوسف ۱۹۹۴ء میں جہاد میں شریک ہوکر جام شہادت نوش کیا، یوں مجھے ایک شہید کے باپ بننے کا اعزاز بھی حاصل ہے، ارایس او نہ ہوتی تو یہ رتبہ اور یہ اعزاز کہاں سے ملتا؟ جہاد کے حوالے سے دیگر منظمات تو ہیں، مگر حقیقی معنی میں جہاد کا انتظام ہے کہاں؟ سوائے دعاوی اور باتوں کے بتنگڑ کے وہاں کیا ملتا ہے"۔

مولانا ایک جلیل القدر مجاہد عالم دین اور صابر و شاکر بزرگ ترین انسان ہیں، جہاد اسلامی کے حوالے سے آپ کو ایک مفکر و مدبر انسان ضرور کہا جاسکتا ہے، ارایس او کے زیر اہتمام قائم مدرسہ ابن عباس کا آپ منتظم اور مدیر رہے، شاید اب بھی آپ اس مدرسہ کے مدیر ہیں، اللہ تعالی شہید ابو یوسف کے والد اور امت مسلمۂ ارکانیہ کے اس مدبر عالم دین کے سائے تادیر ہم پر باقی رکھے۔ آمین۔

حضرت مولانا امین اللہ صاحب نور اللہ فاروی

نور اللہ فارہ منگڈو کے چوہدری خاندان کے فرزند رشید مولانا امین اللہ صاحب کی ولادت ایک روایت کے مطابق ۱۸۸۹ء میں ہوئی، چونکہ آپ زمیندار خاندان کے فرزند ارجمند تھے تو آپ کی زندگی بڑی ناز ونعمت سے شروع ہوئی، والدین کے آپ بڑے چہیتے فرزند تھے، گھر میں کسی چیز کی شاید کمی نہیں تھی، یوں آپ کا نشوونما بڑی ناز پروردگی سے ہوا تھا، کہتے ہیں کہ بچپن سے ہی آپ کا مزاج بڑا معتدل اور سنجیدہ تھا، کھیل کود سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، لڑکوں کے ساتھ جھگڑا فساد کرنا تو کجا، کہیں لڑکوں کے مابین جھگڑا ہوجاتا تو آپ درمیان میں ہوکر اس جھگڑا کو ختم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا نے مکتب نشینی کے بعد ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے ایک مدرسۂ دینیہ میں پائی، بڑے ہوئے تو اعلی دینی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، وہاں آپ نے عرصۂ دراز تک تعلیمی زندگی گزاری اور فیض یاب ہوتے ہوئے وطن واپس آئے، آپ کے متعلق گرامی قدر محترم حضرت مولانا سیف اللہ صاحب بن مولانا عبد الجبار گدوسراوی کا بیان ہے کہ:

> "وطن واپسی پر آپ نے اپنے علاقہ کی ایک حسن سیرت لڑکی سے شادی کی، بعد از اں مدت دراز تک مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ کی جامع مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیئے، اور ساتھ ہی ساتھ بروز جمعہ جمعہ کا خطبہ بھی دیا کرتے تھے، آخری عمر میں آپ اسی مدرسہ میں قرآنی تعلیم کی خدمات میں مامور ہوئے، خوش آواز قاری القرآن ہونے کے ساتھ عالم باعمل بھی تھے، آپ زہد و ورع میں یکتائے روزگار مانے جاتے تھے"۔

حضرت مولانا محمد امین صاحب کو علاقے کے لوگ بڑی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، یہاں آپ کے قول کو قول فیصل مانا جاتا تھا، آپ نے اپنی مستعار زندگی میں کسی کو دکھ نہیں پہنچایا، زندگی بھر لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے رہے تھے، آپ کے اخلاف میں محمد اسماعیل کے علاوہ حافظ مولوی محمد عثمان قابل دید عالم دین ہیں، بہر حال مولانا محمد امین صاحب نے عرصۂ دراز تک تعلیم وتلقین میں اپنی زندگی گزار کر اسی سال کی عمر میں ۱۹۷۶ء میں وفات پائی، انا للہ وانا الیہ راجعون، آپ نور اللہ فارہ کی قبرستان میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا بشیر الدین صاحب نور اللہ فاروی

حضرت مولانا بشیر الدین صاحب کی پیدائش جنوبی منگڈو کی معروف بستی نور اللہ فارہ میں ہوئی، آپ کے سن ولادت باسعادت کے حوالے سے راقم السطور نے بہت سے ہم عصر علماء سے پوچھتا رہا تھا مگر تاریخ ولادت اب تک نہیں مل سکی، کہتے ہیں کہ آپ کے والد صاحب ایک دین دار اور علماء وصلحاء پسند بزرگ تھے، جہاں بھی پند ونصیحت کی محفل ہوتی وہ فوراً وہاں پہنچ جاتے تھے۔

حضرت مولانا بشیر الدین صاحب کی مکتب نشینی کے بعد ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں ہوئی، آپ نے اس مدرسہ کے معلمین سے خوب خوب استفادہ کیا، آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب نلبنوی، حضرت مولانا سلطان احمد صاحب اور حضرت مولانا نور احمد صاحب گدوسراوی شامل ہیں، کہتے ہیں کہ آپ کے جملہ اساتذۂ کرام اپنے اس شاگرد رشید کو بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور آپ بھی اپنے محسن اساتذۂ کرام کی فرمان برداری اور خدمت گزاری میں کوئی کمی ہونے نہیں دیتے تھے، بعد میں آپ اعلی تعلیم کی نیت سے ہندوستان گئے اور وہاں کے کسی دینی مدرسہ سے سند فراغت حاصل کرتے ہوئے وطن واپس آئے۔

مولانا بشیر الدین صاحب فراغت تعلیم کے بعد وطن واپس آئے تو علاقے کے چند مدارس کے ذمے داروں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ ان کے مدرسہ میں آکر محفل درس وتدریس کو رونق بخشیں، لیکن مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ کے ارباب بست وکشاد کے اصرار پر آپ اسی مدرسہ کے مدرس مقرر ہوئے، اس مادر علمی میں آپ نے عرصۂ دراز تک تشنگان علوم نبوت کو سیراب کرتا رہا، اول اول آپ کے حصے میں درسیات کی کتابوں میں اصول الشاشی، دیوان علی، نفحۃ الیمن، کنز الدقائق شامل تھیں، لیکن بعد میں آپ نے ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے درجۂ علیا کی کتابیں بھی پڑھائیں۔

حضرت مولانا بشیر الدین صاحب نور اللہ فاروی کے متعلق حضرت مولانا سیف اللہ بن حضرت مولانا عبد الجبار صاحب گدوسراوی کا کہنا ہے کہ:

> ''مولانا بشیر الدین صاحب ہمارے اس علاقے میں ایک ممتاز عالم دین تھے، جو فنونات میں کمال رکھتے تھے، علاوہ ازیں سیرت وسلوک کے حوالے سے بھی آپ کی زندگی اور طرز عمل قابل تقلید تھا، اللہ تعالی مغفرت فرمائے''۔

حضرت مولانا حسن علی صاحب قادر بیلی

وطن عزیز ارکان اہل زہد وتقوی اور اولیاء اللہ کی سرزمین ہے، ان اولیاء اور درویشوں میں ایک انسان کا نام ملتا ہے، جسے دنیا مولانا حسن علی کا دربیلوی کے نام سے جانتی ہے، مولانا کی پیدائش کے حوالے سے اتنی سی بات معلوم ہوسکی کہ آپ بستی قادر بیل جنوبی منگڈو میں پیدا ہوئے، اور آپ کے والد صاحب نہایت دین دار اور خدا ترس بزرگ تھے، ہر حال میں وہ علماء اور صلحاء سے نسبت قائم رکھتے تھے، علاوہ ازیں پند ونصیحت کے بڑے رسیا بزرگ تھے۔

مولانا نے اپنی بستی کے فرقانیہ میں مکتب نشینی کے بعد ابتدائی دینی تعلیم علاقے کے مدرسہ میں پائی، پھر اعلی تعلیم دینی کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، جہاں سے آپ نے درسیات کی تکمیل کی، کہتے ہیں کہ دوران تعلیم آپ کا ذہنی میلان تصوف وسلوک کی طرف ہوگیا، آپ کے متعلق مزید معلومات حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی کے بیان سے لیجئے کہ:

> ''حضرت مولانا حسن علی صاحب نے ابتدائی تعلیم وطن عزیز ارکان کے مدارس میں پائی، اس کے بعد متوسطہ واعلی دینی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، جہاں آپ نے دوران تعلیم کسی شیخ طریقت کے مبارک ہاتھ میں بیعت کی، اور اسی شیخ سے فیضیاب ہوکر وطن واپس آئے، وطن آتے ہی شادی کی سنت ادا کی، اور خانگی زندگی بسر کرتے رہے، اگر جذب کی حالت طاری ہوجاتی تو عریاں ہوجاتے تھے، تاہم اسی جذب کی حالت میں بھی عزیز واقارب کے اصرار پر لباس پہن لیا کرتے تھے، فرماتے کہ یہاں کے لوگ تو سارے کے سارے بیل بھینسا ہیں، ان کے سامنے ستر پوشی کی کیا ضرورت ہے، لباس پہننے کے لئے اصرار کیا جاتا تو بعض لوگوں کو دکھاتے کہ واقعی یہ لوگ بیل بھینسا ہیں (شاید کرامات کے ذریعے دکھا دیتے ہوں گے) شک نہیں ہے کہ آپ ایک درویش اور مستجاب الدعوات بزرگ عالم دین تھے، کہتے ہیں کہ منگڈو اور بوسیدنگ کے درمیان اس وقت چلنے والی ریلوے لائن آپ سے بے ادبی کی وجہ سے قدرتی طور پر بند ہوگئی تھی، آپ اسرار ومعرفت کا ایک گنجینہ اور ولی کامل مانے جاتے تھے، کہتے ہیں کہ آپ کی وفات بغداد یا بیت المقدس میں ہوئی، واللہ اعلم''۔

حضرت مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب لمبابیلی بوسیدنگی

خاندانی پس منظر:

سرزمین ارکان درحقیقت علماء وصلحاء، دعاۃ ومرشدین اور اولیاء اللہ کی سرزمین ہے، تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلا ہے کہ یہاں اور تو اور گزری صدی میں ایسے ایسے علماء پائے جاتے تھے، جو ارکان میں آج جیسے حالات نہ ہوئے ہوتے تو ان کا شمار دنیا کے ان بلند پایہ کے علماء میں ہوتا، جن کی فضیلت کا ڈنکا آج دنیا بھر میں بج رہا ہے، ارکان کے ان بڑے بڑے علمائے کرام میں ہم نے اپنی آنکھوں سے حضرت علامہ سلطان احمد صاحب فوئمالویؒ، حضرت علامہ سید الامین صاحب منگنماویؒ، حضرت علامہ شاہ مظفر احمد صاحب منگیز ویؒ (خلیفہ ومجازِ بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب گراخالوی معروف بہ محدث صاحب، حضرت مولانا مفتی سلطان احمد صاحب ریدوئیؒ وغیرہ کو دیکھا ہے۔
دور آخر میں ارکان کے جن بڑے بڑے علمائے کرام کو دیکھا تھا، ان میں سے ایک حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب بھی تھے، آپ اپنے وقت کے ایک عظیم المرتبت عالم دین، مفسر قرآن اور جلیل القدر محدث ونکتہ سنج اور معاملہ فہم فقیہ ہونے کے ساتھ حضرت مولانا حسین احمد صاحب (جن کا تذکرہ یہاں ہمارا مقصد ہے) کے والدِ گرامی ہیں، جنہوں نے کوئی نصف صدی کی مدت تک سرزمین ارکان میں علم وعلماء کی بجا طور پر خدمات کیں، جن کی خدمات کا تذکرہ خود ان کی زندگی میں بھی ہوتا تھا، پھر آج ان کے انتقال کے بعد بھی ہو رہا ہے۔ اور خدا کرے تو تا قیامت ہوتا رہے گا۔ حقیقت یہی ہے کہ آپ ایک ایسے عالم دین تھے، جن پر نہ صرف اپنے علاقے کے لوگ بلکہ ارکان کے دور دراز کے باشندے بھی رشک وفخر کیا کرتے تھے۔
مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے خاندان کو ہمارے علاقے میں ایک معزز اور ایک شریف خاندان مانا جاتا ہے، گو کہ دولت وثروت کے لحاظ سے اس خاندان کا شمار اس علاقے کے بڑے زمین دار خاندانوں میں نہیں ہے، لیکن سچ میں یہ خاندان شرفاء، نجباء اور علمائے کرام کا خاندان ہے، دور آخر میں اس خاندانِ عزت وشرافت میں چند ایسے علمائے دین اور بزرگانِ شرع متین

گزرے یا پیدا ہوئے، جن کا شمار سرزمین ارکان میں اپنے وقت کے بڑے اور چیدہ علمائے کرام میں ہوتا تھا، ان میں سے چند علمائے کرام کا تذکرہ کرنا اگرچہ مختصراً ہی سہی زیر نظر کاوش میں بھی ضروری سمجھا گیا ہے، جن میں سے ایک حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے والد گرامی ہیں، باقی دو شخصیات میں سے ایک حضرت مولانا عبدالہادی معروف بہ قاضی مولوی صاحب لمبابیلی، جب کہ دوسری شخصیت حضرت مولانا سعید اللہ صاحب لمبابیلی ہیں۔
یہاں ایک بات عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ غالباً حضرت مولانا قاضی عبدالہادی صاحب کی نسبت سے اس خاندان کا تعلق اس علاقے کے اور ایک نامور خاندان سے تھا، جس میں بھی وقت وقت پر بڑے بڑے علماء وصلحاء، دعاۃ ودرویش، قومی رہنماء ومحرکین تحریک آزادی اور مجاہدین پیدا ہوئے تھے، جن میں شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ عبدالباری صاحب کجافویؒ معروف بہ ''بڑے مولوی صاحب'' اور شیخ طریقت حضرت مولانا حافظ مخلص الرحمن صاحبؒ اور بانی تحریک آزادی حضرت مولانا جعفر حسین صاحب قوال معروف بہ ''مجاہد اعظم'' کے علاوہ مجدد تحریک آزادی حضرت محمد جعفر حبیبؒ قابل ذکر بلکہ ناقابل فراموش شخصیات اور بزرگان قوم وملت ہیں۔

ولادتِ باسعادت:

دور حاضر میں سرزمین اسلام ارکان کے معروف عالم دین اور نامور اسلامی اسکالر حضرت مولانا الحاج حسین احمد ابوالفضل صاحب کی ولادت ۱۹۵۵ء میں قصبۂ علی چنگ، بوسیدنگ کی بستی لمبابیل میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا الحاج مفتی ابوالفضل صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے جلیل القدر عالم دین، مفسر، محدث، فقیہ اور اصولی انسان تھے، جن کا تذکرہ سطور بالا کے علاوہ راقم الحروف کی تصنیف ''سرزمین ارکان کے درخشاں ستارے'' میں بھی قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔
مولانا کی والدۂ محترمہ کلثوم خاتون رنگیا دنگی، بوسیدنگی مرحومہ ایک نہایت نیک، خلیق، عابدہ، پارسا اور زاہدہ ہونے کے علاوہ علمائے اسلام اور طالبانِ علوم دینیہ سے محبت اور احترام کرنے والی خاتون تھیں، ویسے اللہ تعالی نے ان کے بطن میں مولانا حسین احمد صاحب کے علاوہ مولانا محمد جلیل صاحب جیسے قابلِ قدر علمائے ملت عطا کئے، مرحومہ اپنی عمر کے تقریباً آخری مراحل میں

نفسیاتی مرض کی شکار ہوگئی تھیں، جس کی وجہ سے ان کو اپنی زندگی میں بڑی سی بڑی تکلیفیں سہنی پڑیں، مگر ایک عجیب بات تھی کہ وہ ہر حالت میں علمائے دین اور طالبانِ علوم دینیہ کا پاس ولحاظ رکھتی تھیں، بہر حال وہ اپنی عمر کے آخری مراحل میں اپنے فرزند ارجمند حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی رہائش گاہ میں رہیں، مولانا اور آپ کی اہلیہ نے ان کی اچھی خاصی خدمات کیں، ایسی خدمات جن پر راقم سطور کو رشک آتا تھا، اس دوران ان کی خاصی تشخیص کی گئی اور علاج ومعالجہ بھی کیا گیا، افاقہ تو ہوتا تھا مگر بہت کم، ایسی حالت میں قدرت کو جو منظور تھا آخر وہی ہوگیا، کہ انہوں نے ۱۹۹۲ء میں وفات پائی، اور خاک چاٹگام میں مدفون ہیں، مرحومہ کی نمازِ جنازے میں کافی لوگاں نے شرکت کی، ہماری برادری کے تقریبا سارے نمایاں لیڈروں نے ان کی نمازِ جنارے میں حصہ لیا تھا۔

نشو ونما اور تعلیم:

مولانا حسین احمد صاحب کا نشو ونما اپنی بستی لمبا بیل اور اپنے علاقے میں ہوا، لیکن جہاں تک میرے علم وآگہی کا تعلق ہے، اس کے مطابق آپ کا نشو ونما گاؤں کے عام بچوں کی طرح نہیں ہوا تھا، کیوں کہ ایک طرف گھر کا ماحول ہی طبیعی طور پر علم وعمل، دین داری اور خدا ترسی کا تھا، تو دوسری طرف ظاہر ہے کہ جس گھر کا نگران اعلی اور رکھوالا حضرت مولانا مفتی ابو الفضل صاحب جیسے عالم دین، بالغ نظر اور درویش صفت انسان ہوگا، اس گھر میں مولانا حسین احمد جیسا انسان کا پیدا ہوکر اچھا خاصا نشو ونما پانا ایک طبیعی اور قدرتی امر ہے، ویسے آپ کا نشو ونما ایک دینی ماحول میں اور وہ بھی اپنے والد گرامی کے سایۂ لطف وعاطفت اور ربوبیت میں ہوا۔ غرض آپ کا بچپن اور لڑکپن ایک دینی، علمی اور اخلاقی ماحول میں گزرا، اس حوالے سے آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا مفتی ابو الفضل صاحب کا ایک بیان مجھے آج تک جوں کا توں یاد ہے کہ:

"حسین احمد کی ولادت ہوئی تو نہ جانے کیوں کہ دل ہی دل میں یہ خیال جاگزین ہوگیا تھا کہ میرے گھر میں ایک باسعادت بچہ پیدا ہو چکا ہے، اور خدا کرے تو یہ بچہ ایک دن ملت وقوم کے حوالے سے کام کا انسان بنے گا، اس لئے ہم نے اسے دیگر بچوں کی طرح نہیں پالا، اس کی دیکھ بھال میں خصوصی توجہ دی، اور وہ کچھ بڑا ہوا

تو میری امید کے مطابق اس کے ستارۂ اقبال کو کافی بلند پایا، یوں اس کی تعلیم و تربیت کے دوران اس کی خاصی نگرانی کی گئی تھی، تاکہ بستی اور علاقے کے عام بچوں کی طرح اس کا کوئی بھی وقت ضائع نہ ہونے پائے"۔

حضرت مفتی صاحب کا یہ بیان اس وقت کا ہے، جب مولانا حسین احمد صاحب فراغتِ تعلیم کے معا بعد جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے، دراں حالیکہ مفتی صاحب جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں شیخ الحدیث کے منصب جلیلہ پر فائز تھے، افسوس ہے کہ مفتی صاحب کے اس بیان کے چند سال بعد آپ کی وفات ہوگئی، کاش حضرت آج زندہ ہوتے تو اپنے بیٹے کی ترقی، کامیابی اور بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کو دیکھ کر آپ کا دل کتنا باغ باغ ہو چکا ہوتا۔

مولانا محترم کی تعلیم کا آغاز خود اپنے والد کے مبارک ہاتھوں اپنے گھر میں ہوا، اس کے بعد مکتب نشینی ہوئی، ایک طرف دینیات کی ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی اور بستی کے مکتب میں ہوتی رہی تو دوسری طرف عصری تعلیم بستی کے سرکاری پرائمری اسکول میں ہوتی رہی تھی، یوں بستی کے اسکول سے چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد بوسیدنگ میڈل اسکول میں بھی ایک دو سال پڑھتے رہے تھے۔

اس کے بعد شہر بوسیدنگ کی معروف دینی درس گاہ "جامعہ اسلامیہ عالیہ" میں داخلہ لیا، جس میں آپ کے والد گرامی سالہا سال سے بزم قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شمع فروزاں تھے، اور علوم دینیہ واسلامیہ کے حوالے سے باضابطہ طور پر یہیں سے آپ کے سفر کا آغاز ہوگیا، یوں اپنے عظیم والد کی زیر نگرانی آپ نے اس درس گاہ سے جماعت دوم تک کی تعلیم پائی۔

مذکورہ اس درس گاہ میں آپ کے والد صاحب کے علاوہ بڑے بڑے جید علمائے کرام مدرس تھے، جن میں: حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بانگلونوی، حضرت مولانا ولی احمد صاحب خیر مورہ فاروی، حضرت مولانا تمیز الرحمن صاحب بوسیدنگی، حضرت مولانا ابو سعید صاحب ہولی مرنگی، حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب تمنگ چنگی، حضرت مولانا نور احمد صاحب، صاحب بازاری، حضرت مولانا ابو الحسین صاحب کوائندنگی ناقابل فراموش ہیں۔

آپ کی تعلیم کے متعلق یہاں ایک بات کا تذکرہ شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ابھی جامعہ اسلامیہ

عالیہ میں مولانا حسین احمد صاحب جماعتِ نہم کے طالب علم تھے، اس دوران سرزمین ارکان کے مایۂ ناز عالم دین، داعی الی اللہ، شیخ طریقت و ماحی بدعت وخرافات حضرت مولانا شاہ محمد ادریس صاحب مہتمم دارالعلوم سعد اللہ سر (خلیفہ ومجازِ بیعت حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم معین الاسلام ہاٹہزاری، چاٹگام، بنگلا دیش) دینی ودعوتی خدمات کے بطور بوسیدنگ تشریف لائے تھے، تو حضرت مفتی صاحب نے اپنے لاڈلے اور چہیتے حسین احمد کو حضرت کا حوالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: آپ حسین احمد کو آپنے ساتھ لے جائیں، اور اپنی خاص نگرانی میں اس کی تعلیم وتربیت فرمائیں! لیکن مولانا محمد ادریس صاحب نے مفتی صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا: حسین احمد ابھی بہت چھوٹا ہے، ایک طرف والدین کی مسلسل جدائی تو دوسری طرف سفر کی صعوبت برداشت نہیں کر پائے گا، اسے تا حال آپ کے پاس رکھیں، میں اسے مولانا محمد شفیع (۱) کا حوالہ کرتا ہوں، جن پر میرا اعتماد ہے، جو اس کی تعلیم وتربیت کریں گے، اس کی نگرانی میں خدا کرے تو اس کی اچھی تعلیم اور تربیت ہوگی،

یہاں اس واقعہ کے حوالے سے خود مولانا حسین احمد صاحب کا ایک ٹیلفونک بیان ملاحظہ ہو کہ:

"جامعہ اسلامیہ عالیہ میں میرا جماعت نہم کا سال تھا، مولانا محمد ادریس صاحب تشریف

---

(۱) سرزمین ارکان کے جید اور باصلاحیت لیکن گمنام عالم دین، عابد وزاہد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کی پیدائش مردم خیز بستی کوائندنگ، بوسیدنگ میں ہوئی، آپ کا نشو ونما اپنی آبائی بستی میں ہوا، اور ابتدائی ومتوسطہ کی تعلیم علاقے کے دینی مدارس میں ہوئی، اس کے بعد بنگلا دیش کی معروف دینی، علمی اور روحانی درس گاہ دارالعلوم معین الاسلام ہاٹہزاری میں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ فراغت تعلیم کے بعد آپ وطن واپس آئے، اور علاقے کے چند دینی مدرسوں میں پڑھاتے رہے، جن میں جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے علاوہ مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ بوسیدنگ قابلِ ذکر درس گاہیں ہیں، آپ ہمارے علاقے میں ایک قابل مدرس ومعلم کی حیثیت سے بہت ہی مشہور تھے، سنا تھا کہ آپ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سعد اللہ سری قدس سرہ کے مرید اور مجازِ بیعت ہیں۔ نہ جانے کس وجہ سے کہ آپ ترک وطن کر کے پاکستان پہنچے، اور عرصۂ دراز تک وہاں کے مختلف دینی وعلمی مدارس میں پڑھاتے رہے تھے، حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی نیت سے حجازِ مقدس کا سفر بھی کیا، اطلاع کے مطابق وہاں چند سال رہے، اور بعد میں پاکستان چلے گئے، شنید ہے کہ تادم تحریر آپ حیات سے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دے، اور جہاں کہیں بھی ہوں سلامت سے رکھے۔ آمین۔

لائے، والد صاحب نے مجھے آپ کا حوالہ کیا، لیکن آپ نے میری عمر اور حالت پر ترس کھاتے ہوئے فرمایا کہ: حسین احمد ابھی چھوٹا ہے، میں اسے مولانا محمد شفیع صاحب کا حوالہ کرتا ہوں، جن پر مجھے اعتماد ہے، انشاء اللہ وہ اچھی تعلیم دیں گے، اور اس کی تربیت میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑیں گے، بعد میں انشاء اللہ دیکھا جائے گا"۔

مذکورہ واقعہ سے ایک طرف اندازہ ہوا ہے کہ حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب بذاتِ خود ایک عالم دین اور منجھے ہوئے مدرس ومعلم ہونے کے باوجود حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سے کتنی عقیدت ومحبت رکھتے تھے، تو دوسری طرف حضرت مفتی صاحب کو اپنے چہیتے بیٹے حسین احمد کی تعلیم وتربیت کا کتنا ہی خیال تھا۔ پھر اس واقعہ سے ایک بات سامنے آئی ہے کہ بعض نادان شاید کہ حاسدین ہوں کہ حضرت مفتی صاحب پر الزام دیتے نہیں تھکتے ہیں کہ "مفتی صاحب ایک غرور و پندار کا شکار انسان ہیں، دانش وران تو خیر دانش وران علماء تک کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، آپ کی نظر میں کوئی بھی آدمی جچتا نہیں ہے"، لیکن ظاہر ہے کہ حضرت مفتی صاحب لوگوں کے یہ اور اس قسم کے دیگر الزامات سے کلی طور پر بری اور پاک تھے، تاہم یہ بات صحت پر مبنی ہے کہ مفتی صاحب "**انزل الناس بقدر منازلهم**" کے قائل نہیں بلکہ اس پر عامل ضرور تھے، جس کا بین اور ناقابلِ تردید ثبوت خود مذکورہ واقعہ ہے۔

بہر حال مولانا حسین احمد نے دیگر اساتذۂ کرام کے تہ بتہ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب سے بھی پڑھا تھا، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ مولانا کو اپنے استاد مولانا محمد شفیع صاحب سے خاصی عقیدت ہے، ہمیشہ بلند وبرتر الفاظ والقاب سے یاد کرتے ہیں، آپ کے تذکرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا بڑے باکمال عالم دین اور بزرگ ترین شخصیت ہیں، جس کا اندازہ علاقے کے عام لوگوں تھا اور نہ بعض علمائے کرام کو۔ ادھر مولانا حسین احمد صاحب بھی اپنے والد بزرگوار حضرت مفتی صاحب کی طرح "**انزل الناس بقدر منازلهم**" کے نہ صرف قائل بلکہ اس اصول کے شدید پابند ہیں، ایسے انسان کی زبان سے تعریفی کلمات کا نکلنا مولانا محمد شفیع صاحب کے کمالات کی دلیل ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب نے جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ سے جماعت دوم تک کی تعلیم پا کر اعلی دینی تعلیم کے لئے بنگلا دیش کا سفر کیا، اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں داخلہ لیا، اور اسی دینی وعلمی درس گاہ میں

جماعتِ اولی ودورہ پڑھ کرسند فراغت حاصل کی،معلوم ہوا ہے کہ آپ دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں درجۂ دورۂ حدیث کے کل طالب علم میں دوسرے نمبر پر آئے، جب کے مولانا رشید نامی آپ کے ایک ساتھی نے نمبر اول کا پوزیشن حاصل کیا تھا،جس پر مولانا کو ہمیشہ شکایت کرتے ہوئے دیکھا گیا، اس حوالے سے کچھ حقیقت کی دریافت بھی ہو چکی ہے،لیکن یہاں من وعن بیان کردیا جائے تو اندیشہ ہے کہ تلخیوں کا سلسلہ شروع ہوجائے گا،جس سے گریز کرنا ہی ناگزیر ہے۔

جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں مولانا حسین احمد صاحب نے جن نامور علمائے کرام واساتذۂ عظام سے استفادہ کیا تھا،ان بزرگوں کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت مولانا امیر حسین صاحب معروف بہ میر سنؒ۔
۲۔ حضرت مولانا علی احمد صاحب معروف بہ بوعلی صاحب حضورؒ۔
۳۔ حضرت مولانا احمد صاحب معروف بہ امام صاحب حضورؒ۔
۴۔ حضرت مولانا انور العظیم صاحبؒ۔
۵۔ حضرت مولانا نور الاسلام صاحبؒ (قدیم)
۶۔ حضرت مولانا نور الاسلام صاحبؒ (جدید)
۷۔ حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب۔
۸۔ حضرت مولانا محمد ایوب صاحبؒ۔
۹۔ حضرت مولانا مظفر احمد صاحبؒ۔
۱۰۔ حضرت مولانا مفتی عبدالرحمن صاحبؒ۔

مذکورہ سارے کے سارے بزرگانِ دین وعلمائے شرع متین مولانا کے محسن اساتذہ ہیں، تاہم میری جانکاری کے مطابق آپ نے بطور خاص حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی سے استفادہ کیا تھا، حضرت ذوق کے ساتھ آپ کی وابستگی الحمدللہ تادم تحریر باقی ہے،اللہ کرے تو مزید باقی رہے گی۔

جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں مولانا حسین احمد صاحب نے جن اساتذہ سے استفادہ کیا تھا، ان میں سے اکثر اساتذہ خود راقم سطور کے بھی استاد ہیں،تو ضرورت اس بات کی تھی کہ ان اساتذۂ کرام

پر اجمالا ہی سہی کچھ نہ کچھ لکھا جائے،مگر ایک طرف خاطر خواہ معلومات کی کمی تو دوسری طرف طوالت کے خوف سے ان حضراتِ بزرگانِ دین پر یہاں قلم اٹھایا نہیں جارہا ہے، پر شنید ہے کہ آج کل جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں اس حوالے سے کام ہورہا ہے،خدا کرے کہ ان حضراتِ بزرگانِ دین کی سوانح حیات مرتب ہوکر منظر عام پر آجائے۔

پھر حال ہی کی بات ہے کہ استاد محترم حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی کے جاندار قلم سے اردو میں خود ان کی آپ بیتی ''نقوشِ زندگی'' چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے،راقم سطور کو ہدیہ میں ملی، من وعن الحمدللہ مطالعہ کیا،جس میں کام کی خاصی چیزیں دیکھنے میں آئیں، اللہ تعالی حضرتِ استاد کے قلم اور حیات میں برکت عطا فرمائے۔

بہرصورت اہل بنگلادیش میں سے آج کل بہت سارے قلم کار راقم کے سامنے ہیں،شکر ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر ابورضا محمد نظام الدین ندوی صاحب ایم پی کی زیر سرپرستی ندوی فضلاء جن میں راقم بھی شامل ہے کی ایک مضبوط ومنظم جماعت ضروری اور لازمی موضوعات پر کام کررہی ہے،توقع یہی ہے کہ آج نہیں تو کل یہاں کے بزرگانِ دین متین (جن میں سے الحمدللہ بہتوں کی سوانح حیات طبع ہوکر منظر عام پر آبھی چکی ہیں) کی سوانح وتذکرے سامنے ضرور آئیں گے۔

لیکن اس حوالے سے سرزمین ارکان تقریبا بانجپن کی شکار ہے، ویسے بھی ہم جیسی غریب اور مفلوک الحال قوموں کی قومی کشتیاں ہردم ناپید کنار سمندر کی موج وطلاطم اور گرداب وبھنور میں ڈگرکھاتی رہتی ہیں، یوں زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے حالات بڑے پریشان کن اور دگرگوں ہیں، تاہم خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ایسے مایوس کن حالات میں بھی ماضی قریب میں ہمارے دو فاضل دوستوں نے ہمارے بعض بزرگوں اور قومی خادموں کی سوانح حیات اور تذکرے پر کام کرکے نہ صرف مجھ ناچیز پر بلکہ پوری روہنگیا قوم کے اہل فکر ونظر پر بھاری احسان کیا ہے،جن میں سے ایک ہمارے معروف اور منجھے ہوئے صحافی اور جاندار اہل قلم مولانا سیف اللہ خالد صاحب مرحوم ہیں، جب کہ دوسرا ہمارے فاضل دوست، صاحب فکر وجہود اہل قلم مولوی حافظ محمد صدیق صاحب بارک اللہ تعالی فی حیاتہ ہیں، ان دونوں نے سرزمین پاکستان کے شہر کراچی سے اس موضوع پر قلم

اٹھا کر ہماری آنکھیں کھول دی ہیں، اور ہم یہ جان چکے ہیں کہ ہمارا تعلق بھی ایک ایسی قوم سے ہے، جس کے بزرگوں نے اپنے دین وملت اور اپنے ملک وقوم کی خدمات انجام دینے میں کسی بھی قسم کی کسر نہیں چھوڑی، سر دھڑ کی بازیاں لگائیں، زندگیاں کھپائیں اور اپنی جان تک کے نذرانے پیش کئے تھے۔ یوں میں اپنی اور اپنی قوم کی طرف سے ہمارے ان دونوں فاضل قلم کاروں کو داد تحسین اور گلدستۂ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

آب آمدم برسر موضوع، وہ یہ ہے کہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے ان ارکانی اساتذہ کرام پر کچھ لکھا جائے، جن کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ خم کر کے خوب خوب استفادہ کیا تھا، تو لیجئے حاضر خدمت ہیں۔

ابتدائی تدریسی خدمات :

۱۹۷۹ء میں جامعہ اسلامیہ پٹیہ سے فراغت کے بعد مولانا حسین احمد صاحب نے اور ایک سال کے لئے اسی جامعہ میں درجۂ تخصص فی الحدیث میں داخلہ لیا تھا، لیکن میری معلومات کی حد تک عید الاضحیٰ تک اس موضوع پر مطالعہ کر کے آپ نے اپنے نامور والد حضرت مولانا مفتی ابو الفضل صاحب کی طرح درس وتدریس کی راہ چن لی۔ اسی زمانے میں جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں آپ کے اساتذہ میں سے حضرت مولانا مظفر احمد صاحب مہیش خالوی اور حضرت مولانا محمد سلطان ذوق ندوی ذمے داران برائے تقسیم مدرسین تھے، انہوں نے آپ کو بگوراوالے ایک مشہور مدرسہ کی تدریس کے لئے تقریبا بات طے کر لی تھی، لیکن آپ کا ارادہ جامعہ اسلامیہ میں رہتے ہوئے مزید مطالعہ کا تھا۔

جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں:

۱۹۷۹ء کی ابتدا یا ۱۹۸۰ء کے اوائل کی بات تھی کہ جامعہ اسلامیہ ٹیکناف (کاکس بازار) کو معرف عالم دین ومعلم حضرت مولانا عبد الحق صاحب اکیابی (جو عرصے تک جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں درسیات کی اہم کتابوں کی تعلیم دے کر اپنے وطن جا چکے تھے) کی جگہ ایک باصلاحیت مدرس کی ضرورت پڑی تو اس مدرسہ کے ارباب بست وکشاد نے پٹیہ والوں سے رابطہ کیا، اور ایک مستعد مدرس کی فرمائش کی

تو آپ نے اپنے اساتذہ کی چاہت اور جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کے ذمے داروں کے اصرار پر خدمتِ علم دین کے لئے رضامندی کا اظہار کیا، تاہم وہ اس لئے بھی کہ:

۱۔ ظاہر ہے کہ مولانا طبعی طور پر ذہنی اور فکری اعتبار سے ایک سیاسی اور انقلابی مزاج کا انسان ہیں، تو آپ کا ارادہ تھا کہ آپ جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کے دوران تدریس ارکان کے کچھ ایسے ہونہار طلباء کو یہاں لا کر تعلیم وتربیت دیں گے، جو مستقبل قریب میں آپ کے ساتھ ملت وقوم کی بجا طور پر خدمات انجام دینے کے لائق ومستعد ہوں۔

۲۔ چوں کہ ٹیکناف کا یہ علاقہ مولانا کے اپنے وطن کے بالکل پڑوس میں واقع ہے، آپ کے مطابق ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ یہ اور اس کے ملحق تمام علاقہ جات کے علماء، دانشوران کے علاوہ زندہ دل اور فکرمند عوام کے اذہان کو ارکان کے حوالے سے ہموار کیا جائے، تا کہ یہ لوگ بجا طور پر انصار ہونے کا حق ادا کر سکیں۔

بہر حال آپ اس مدرسہ کے مدرس ہو کے آئے، جہاں آپ نے ایک سال بڑے حسن وخوبی کے ساتھ درس وتدریس کے فرائض انجام دئے تھے۔ یہاں ایک بات یاد رہے کہ جس زمانے میں آپ اس مدرسہ کے مدرس تھے، اسی زمانے میں یہاں آپ کے وطن کے چند علمائے کرام بھی مدرس ومنتظم تھے، جن میں مولانا محمد ہاشم صاحب بوسیدنگی، مولانا سیف اللہ بن مولانا عبد الجبار صاحب گدوسراوی، منگڈوی کے علاوہ مولانا محمد رضوان صاحب اکیابی اور مولانا عبد القدوس اکیابی ناقابل فراموش ہیں۔

البتہ یہ ایک اہم سوال ہے کہ مولانا اس ادارے میں جو امید وامنگ لے کے آئے، اس میں آپ کہاں تک کامیاب ہو سکے تھے؟ تو میں ذاتی طور پر اس سوال کے جواب دینے کا اہل نہیں ہوں، تاہم اس سوال کے حوالے سے ایک بڑی تکلیف دہ بات سامنے آئی کہ یہاں آپ کے چند دن گزرتے نہ گزرتے خود اپنوں کی شکل کے چند حاسدین کی بری نظریں آپ پر لگ گئیں، شنید ہے کہ انہوں نے آپ کے آگے مختلف قسم کے روڑے اٹکائے، اور آپ کے پروگراموں کو ناکام بنانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔

رنگیا خالی مدرسہ میں:

مولانا اگلے سال رنگیہ خالی (ٹیکناف) کے مدرسہ کے بانی ڈاکٹر قمر الزمان بریسالی (PHD) لنکن یونیورسیٹی (۱) کے اصرار کے علاوہ بڑی امید لے کر یہاں آئے، ڈاکٹر صاحب نے آپ کی بڑی قدر کی، اور ہر سہولیات بہم پہنچائیں، جہاں آپ نے ایک سال تعلیم دی، اس مدرسہ میں آپ کے آنے کی چند وجوہات تھیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں کہ:

۱۔ مولانا کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں سعودی سفارت خانے سے آپ کو یہ عندیہ ملا تھا کہ سفارت خانہ آپ کو تعاون کرنے پر رضامند ہے کہ آپ ارکان سے ہونہار طلباء کو یہاں لاکر ان کی تعلیم و تربیت کے پروگرام شروع کریں۔

۲۔ ساتھ ہی ساتھ اسلامی سنٹر کے مؤسس مہتمم قمر الزمان صاحب نے بھی نیک خواہش کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا کہ "مولانا! آپ اپنے اندر جو عظیم خواب رکھتے ہیں، اور جس نیک تمنا اور پاکیزہ ارادے کے ساتھ آپ جی رہے ہیں، اس کے لئے جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کی جگہ مناسب نہیں، اسی لئے آپ اسلامی سنٹر رنگیا خالی آئیں، اور یہاں مدرسی کی آڑ میں اپنے پروگرام کا آغاز کردیں، خدا کرے تو میں آپ کا ہر ممکنہ تعاون کرتا رہوں گا"۔

۳۔ علاوہ ازیں جماعتِ اسلامی کے بعض مقامی مگر بڑے لیڈروں (جن میں شاہ جہان چودھری نا قابل فراموش ہیں) نے بھی آپ سے باضابطہ طور پر ملاقاتیں کرکے یہ بات طے کرلی کہ اگر مولانا اپنے مذکورہ پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے حوالے سے اٹل ہیں تو جماعت اسلامی بنگلادیش آپ کو تعاون کرنے

---

(۱) معروف دانشور ڈاکٹر (PHD) قمر الزمان بریسالی معروف بہ فقیر صاحب علاقۂ بریسال کے رہنے والے تھے، شنید ہے کہ بعض نا قابل بیان وجوہات کی بنیاد پر آپ علاقۂ رنگیا خالی آئے، اور عرصۂ دراز تک علاقۂ ٹیکناف کے جنگلوں میں پھرتے رہے تھے، ایک فقیر انسان کی حیثیت سے یہاں مشہور ہوئے، بعد میں دار العلوم رنگیا خالی (اسلامی سنٹر) کی بنیاد رکھی، کہتے ہیں کہ آپ سے جماعت اسلامی بنگلادیش کے چند بڑے بڑوں کے علاوہ سعودی سفارت خانے کے اعلیٰ عہدے داروں سے قریبی تعلقات تھے۔ اللہ اعلم۔

میں کوئی بھی کسر نہیں چھوڑے گی۔

مولانا اسلامی سنٹر رنگیا خالی میں ایک جواں اور باعزم معلم تھے، اسی دوران آپ سے ملاقات کے لئے سرزمین ارکان کے عظیم قائد حضرت محمد جعفر حبیب مع ان کے دیرینہ ساتھی جناب سجاد حسین رواسوگری (مرحوم) مقیم ٹیکناف کبھی کبھار تشریف لایا کرتے تھے، حضرت قائد آپ سے مل کر بڑے خوش ہوتے اور آپ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے دعائیں دیتے تھے۔

اسی طرح ہمارے معروف لیڈر محترم ڈاکٹر محمد یونس صاحب بھی مولانا کی نیک نامی اور شہرت سن کر یہاں تشریف لائے، جن کے ساتھ پروفیسر محمد زکریا صاحب اور سعید الرحمن صاحب بھی تھے، انہوں نے بھی مولانا کی حوصلہ افزائی کی، اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا کو اسلامی سنٹر رنگیا خالی کا ماحول راس نہ آیا، وہ اس لئے بھی کہ یہاں کے علماء و طلباء حضرات علمائے دیوبند اور بطور خاص جماعت تبلیغ والوں کے خلاف بر ملا بکواس اور ہرزہ سرائی کرتے پھرتے تھے، جس کا علم آپ کو پہلے نہیں تھا، ورنہ آپ کی غیرت وحمیت وہاں جانے کی اجازت ہی کب دیتی؟

بہر حال یہاں کے دوران تدریس ایک دل چسپ واقعہ پیش آیا، وہ یہ تھا کہ اس زمانے شاید اب بھی ہو کہ بریلوی حلقے کے معرف ومشہور دو چاٹگامی عالم مولانا نور الاسلام ہاشمی اور مولانا عبید الحق نعیمی صاحبان نہلا (ٹیکناف) کے مدرسہ مجیدیہ میں کسی پروگرام کے سلسلے میں تشریف لائے، دورانِ خطابات انہوں نے بہانگ دہل یہ چیلنج کردیا کہ "سامنے آئے وہ جو کہتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیب نہیں جانتے تھے" چوں کہ اس علاقے کے علماء اور عوام کی بھاری اکثریت دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتی ہے اور دار السنہ نہلا جیسا ایک دینی مدرسہ یہاں قائم ہے، تو دیوبندی مکتب فکر کے علمائے کرام کے ساتھ عوام بھی مشتعل ہوگئے، آخر کار ان دونوں سے مناظرہ کرنے کے حوالے سے جامعہ اسلامیہ نہلا کے اساتذہ وطلباء کی نظریں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑیں تو بلانے پر آپ نہلا تشریف لائے، اور دھلیا نامی ایک صاحب کے گھر میں آپ کا ان دونوں سے مناظرہ ہوا، مناظرہ کیا بلکہ معرکہ ہوا، جس میں آپ کی واضح طور پر کامیابی کی صورت میں ان دونوں کو بری طرح ناکامی کا چہرا دیکھنا پڑا،

اور مولانا کے مطابق وہ ڈنگل سے ایسے بھاگے کہ ان کو پیچھے مڑنے تک کا موقع نہیں ملا تھا۔

جامعہ اسلامیہ دار السنہ نہلا میں: مولانا محترم کے اس مناظرہ کی کامیابی نے جامعہ اسلامیہ دار السنہ والوں (جن میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب نمایاں تھے) کی نظریں مزید آپ کی طرف کھینچیں، دعوت ملی تو آپ اگلے سال ۱۹۸۲ء میں دار السنہ تشریف لائے، جہاں آپ نے دو سالوں تک درس وتدریس کی خدمات بڑی کامیابی اور حسن وخوبی کے ساتھ نبھائیں۔

دار السنہ نہلا میں مولانا کی کافی علمی وتدریسی فتوحات ہوئیں، آپ نے یہاں درس وتدریس کے ساتھ النادی الثقافی کا افتتاح کیا، جس کا جلسہ ہفتے میں ایک مرتبہ منعقد ہوتا تھا، جس میں طلباء بڑے جوش و خروش سے شریک ہوتے تھے، علاوہ اس کے یہاں کے مخلص منتظمین، مدرسین اور طلباء میں آپ کی خاصی پذیرائی ہوئی، رہائش کے لئے جو کمرہ ملا تھا وہ بھی دیگر اساتذۂ کرام کے رہائشی کمروں کی بہ نسبت کافی نفیس اور خوش نما تھا، یہ دیکھ کر بعض حاسدین آپ کے پیچھے لگے، لیکن ان کا کام نہیں ہوا، بعد میں وہ لوگ بھی سرنگوں ہوگئے۔

جہاں تک معلوم ہوا کہ دار السنہ نہلا کے بزرگ ترین عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسحاق صاحبؒ آپ کو بہت پسند کرتے تھے، اور تو اور مولانا حسین احمد صاحب مدرسہ کی جامع مسجد میں کبھی کبھار طلباء سے عربی میں خطاب کرتے تو حضرت مولانا اسحاق صاحب طلباء کے درمیان کہیں بیٹھ جاتے تھے، اس سلسلے میں ایک دن مولانا حسین احمد صاحب نے عربی کے بجائے اپنی مادری زبان میں تقریر شروع کی تو حضرت شیخ فرمانے لگے کہ حسین احمد صاحب! آپ عربی میں تقریر کریں گے تو بیٹھتا ہوں ورنہ چلا جاتا ہوں۔

اس وقت کے مہتمم جناب فقیر منظور احمد صاحب جو کہنے میں اگرچہ ایک دانش ور تھے، لیکن وضع قطع، امانت ودیانت اور طرز زندگی کے اعتبار سے ایک بزرگ عالم دین سے کسی معنی میں کم نہیں تھے، جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ بھی مولانا کو دل سے چاہتے تھے، جنہوں نے اپنی رفاقت میں لے کر مولانا کو حجاز مقدس کا سفر (مولانا کے لئے پہلا) کرایا تھا، جس کی قدرے تفصیلات انشاء اللہ اگلی سطور میں آئیں گی۔

بایں ہمہ مولانا حسین احمد صاحب کی قسمت ہی ایسی نکلی کہ آپ جہاں بھی جاتے اور جہاں کہیں بھی ہوتے، بعض حاسدین آپ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، آپ کے انداز واطوار، رہن سہن، طرز زندگی اور میل جول پر نازاں ہونے کے بجائے بعض لوگ آپ کو حقد وحسد کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں، ابھی آپ دار السنہ نہلا کے مدرس تھے، شاید حاسدین میں سے کسی نے حضرت ذوقؔ ندوی صاحب کے کان بھر دئے ہوں کہ اچانک مولانا کے نام حضرت ذوق ندوی صاحب کا ایک خط آیا، جس کے دیگر مندرجات میں سے ایک جملہ یہ بھی تھا کہ: ''بعض لوگ تم کو مغرور سمجھ رہے ہیں، ذرا ہشیار رہنا'' شاید کہ اس جملہ کا مطلب یہ بھی ہو کہ میں جانتا ہوں کہ تم پندار وغرور کا شکار نہیں ہو، لیکن پھر بھی حاسدین کی نظروں سے بچتے رہنا۔

دراصل ٹیکناف کے علاقے میں س زمانے میں شاید اب بھی ہو کہ مذکورہ تینوں دینی درس گاہیں بڑی شہرت کی حامل ہیں، تو ان درس گاہوں میں مولانا کی کامیاب خدمات نے درس وتدریس کے حلقوں میں آپ کی شہرت ہوئی اور ہر کہیں آپ کی علمی لیاقت واستعداد اور مخصوص تدریسی انداز کا چرچا ہونے لگا تھا۔

اور تو اور اس علاقے میں اب بھی مولانا کے ایسے ایسے تلامذہ پائے جاتے ہیں، جن کی علمی استعداد اور فکری پرواز بذات خود اس بات کی دلیل وعکاس ہے کہ ان کے استاد ایک عالی مقام کے عالم، کامیاب مدرس اور مخلص معلم تھے، اس لئے تو ہے کہ آپ کے یہ تلامذہ آج بھی جہاں کہیں ہوں، اپنے لائق اور محسن استاد کو نہیں بھولتے، اور ہمیشہ اپنے اپنے انداز میں آپ کو یاد کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔

دار السنہ نہلا کے دوران مدرسی آپ سے ملنے کے لئے محترم ڈاکٹر محمد یونس باغکونوی، پروفیسر محمد زکریا تنگ بازاری اور سعید الرحمن رامو یا فاروی صاحبان آیا کرتے تھے، یہ اس زمانے کی بات تھی کہ ڈاکٹر محمد یونس وغیرہ روہنگیا فدائین محاذ (RPF) سے بچھڑ کر ارکان مسلم آرگنائزیشن (AMO) کی بنیاڈالنے کے لئے کوشاں تھے، یہ وہ تنظیم تھی جو بعد میں روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے نام سے مشہور ہوئی، شاید کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے یہاں دعوتی پروگرام لئے آتے ہوں گے، جنہوں نے ایک جلسے میں مولانا کی تقریر سے متأثر ہو کے کہا کہ: ''مولانا حسین احمد صاحب ہماری قوم میں ایک نایاب ہیرا اور جواں فلسفی ہیں''۔

جامعہ اسلامیہ دارالمعاف میں:

مولانا محترم نے جامعہ اسلامیہ دار السنہ نہلا میں تدریس کے ساتھ ساتھ تربیتی پروگراموں میں خاصی دل چسپی لی تھی، لیکن جہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے بلند مقاصد اور نیک آرزو کے حوالے سے یہاں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی، ویسے آپ نے ۱۹۸۴ء کے اواخر میں اندرون وطن جانے کا فیصلہ کرلیا، یوں وطن میں داخل بھی ہوئے، لیکن ظالموں کے مختلف مظالم کوہ گراں بن کر سامنے کھڑے ہوگئے تھے، ایسے میں آپ کے استاد حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی کی جانب سے دارالمعارف چاٹگام (جس کی بنیاد ابھی ابھی پڑی تھی) کی مدرسی کے لئے دعوت آئی تو آپ دوبارہ بنگلا دیش آ کے یہاں تقریباً ایک سال پڑھاتے رہے۔

لیکن دارالمعارف میں مولانا کی اس مرتبہ تدریسی خدمات زیادہ نہیں ہو پائیں، کیوں کہ اس زمانے میں آپ زیر زمین کام کرنے والی سیاست سے عملاً زیادہ دل چسپی لینے لگے تھے، اس وقت میں دارالمعارف کا طالب علم تھا، جہاں تک دیکھا کہ آپ ہماری زیر زمین کام کرنے والے انقلابیوں کے سامنے نمایاں ہو چکے تھے، اور تو اور روہنگیا سالیڈریٹی آرگنائزیشن (RSO) نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ اس تنظیم کے صدر دفتر میں بروز جمعہ درس قرآن دینے آئیں، جسے آپ نے قبول کیا تو اگلے چند مہینے تک اس کا سلسلہ جاری رہا تھا، اس حوالے سے اگلی سطور میں تفصیلات آئیں گی۔

مولانا کے درس وتدریس کے متعلق آپ کے تلامذہ میں دو مختلف آراء پائی جاتی ہیں، ان میں وہ تلامذہ جن کے اذہان صرف اور صرف درسیات کی کتابوں تک محدود تھے، اور جو ان کتابوں میں پائے جانے والے مباحث ہی سے دل چسپیاں رکھتے تھے، ان کی رائے یہ ہے کہ بسا اوقات مولانا محترم دوران درس کتاب کے اصل مباحث سے ہٹ کر فکری دنیا میں پرواز کرتے ہوئے غیر متعلقہ گفتگو چھیڑ دیتے تھے۔ لیکن بخلاف ان کے وہ تلامذہ جو علمی اور فکری اعتبار سے بلند حوصلے رکھتے، ان کی رائے میں آپ کا درس اس لئے بہت ہی مفید تھا کہ آپ کتاب کے لاطائل مباحث میں زیادہ الجھنے کے بجائے دوران درس تلامذہ کو فکری دنیا کے سیر کراتے تھے، جس کی وجہ سے فکریات سے دل چسپی رکھنے والے طلباء کے بہت ہی فائدے ہوتے تھے۔ اس حوالے سے اور

تو اور جن مدارس میں آپ نے تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں، ان کے بعض منتظمین کی شکایت بھی سنی گئی، ویسے مجھے معذرت کے ساتھ ایک باوثوق راوی کی زبانی روایت کرنا پڑ رہا ہے کہ خود راقم سطور اور مولانا محترم کے شفیق مربی واستاد، استاد الاساتذہ حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب دامت برکاتہم نے بھی اس قسم کی شکایت آپ کے متعلق کی تھی کہ:

> ''پڑھانے کے لئے مولوی حسین احمد کے حصے میں تفسیر جلالین شریف کا ایک حصہ دیا گیا تھا، سال گزر جانے کو تھا، لیکن چند صفحات سے آگے نہیں پڑھایا، وہ پڑھاتا کب تھا؟ دوران درس بس ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہتا تھا، بالآخر سال کے اواخر میں یہ کتاب اس کے حصے سے لے کر مجھے تمام کرنا پڑا، بڑی پریشانی ہوئی تھی''۔

حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب کی مولانا حسین احمد صاحب کے درس کے حوالے سے جو بات ابھی گزر چکی ہے، اس پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کافی گنجائش ہے، لیکن راقم ان پر قلم اٹھانے کو خلافِ ادب سمجھتا ہے، کیوں کہ حضرت ذوق مولانا حسین احمد صاحب کی طرح راقم کا بھی شفیق استاد ومربی ہیں، اللہ تعالی حضرت کی حیات میں برکت دے۔

ایک طرف مولانا حسین احمد صاحب دوران درس اپنے شاگردوں کا حوصلہ بڑھانے اور ان کے اندر تحصیل علم کے شوق پیدا کرنے کے لئے مناسب اور برمحل گفتگو چھیڑتے ضرور تھے، تو دوسری طرف اس بات میں شک کی گنجائش بھی نہیں ہے کہ دوران درس آپ کی بعض عالمانہ گفتگو اور مفکرانہ ارشادات درحقیقت اس بات کے غماز تھے کہ آپ اپنے تلامذہ کو فکری اعتبار سے اونچائی پر لے جانے کے لئے کوشاں تھے، تاہم یہ بھی ایک قابل لحاظ بات ہے کہ درس کی کتاب اپنے حصے میں لے کر اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچانا (بشرطیکہ آپ کے متعلق کی جانے والی بات سچائی پر مبنی ہو) یہ بھی کوئی مناسب کام نہیں ہوتا ہے، اس کا لحاظ بہر حال رکھنا چاہئے۔

افسوس ہے کہ آج کل مولانا جیسے تلامذہ کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے اساتذہ ملتے ہیں تو بہت کم، اور نہ ہی ہمارے مدارس میں حصول علم کا صحیح مذاق اور جذبہ رکھنے والے تلامذہ پائے جاتے ہیں۔ شاید ملتے ہوں گے۔ کیوں کہ آج کل کا دور جو ہے، یہ بس ایک مادی دور ہے، یہاں ہر کام مادی

نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے، اس کے ترازو میں ہر معاملات کو تولا جاتا اور چیز کو اس کی معیار سے پرکھا جاتا رہا ہے، ہر سو مادی مفادات کا دور دورہ ہے، وقت کے ساتھ خلوص وللّٰہیت کے جذبے ختم ہونے جارہے ہیں، غرض اس مشینی عہد میں ہر انسان ایک ایک مشین بن چکا ہے۔

بہر حال مولانا کے بہتوں تلامذہ آج کل میدانِ عمل وتطبیق میں سرگرم نظر آتے ہیں، یہ وہ تلامذہ ہیں کہ جنہوں نے ظاہر ہے کہ آپ سے جامعہ اسلامیہ ٹیکناف، اسلامی سنٹر رنگیا خالی، جامعہ اسلامیہ دار السنہ نہلا اور جامعہ اسلامیہ دار المعارف میں استفادہ کیا تھا، جن پر آپ کو ہمیشہ ناز کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان سب کی حیات دراز کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے لائق وفائق استاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملت عزیز کی مزید خدمات کی توفیق سے نوازے۔ ان میں سے آپ کے بعض نامور تلامذہ کے مختصر تذکرے خدا کرے تو اگلی سطور میں آئیں گے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا ندوی سے ملاقات:

مجدد القرن العشرین مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی سے مولانا حسین احمد ابو الفضل صاحب کا علمی اور فکری تعلق بہت پرانہ ہے، شاید یہ تعلق آپ کے جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے دوران تعلیم آپ کے استاد حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی دامت برکاتہم کے توسط سے پیدا ہوا ہو، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس تعلق میں آئے دن مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے دوران تعلیم اور اس کے بعد کے زمانے میں آپ نے مفکر اسلام حضرت مولانا ندوی بشمول دیگر ندویوں کی تصانیف پڑھ کر یہ دعوی کرنے کے حق دار بنے کہ ”میں نے ندوے کی اینٹ اینٹ کو پڑھ لیا ہے“۔

لیکن مولانا حسین احمد صاحب نے مارچ ۱۹۸۴ء تک حضرت مولانا ندوی کو براہِ راست نہیں دیکھا تھا، لیکن اللہ تعالی کا خاص کرم تھا حضرت ندوی ۱۹۸۴ء میں بنگلا دیس تشریف لائے، دوران سفر جامعہ دار السنہ نہلا کی بھی زیارت کی، ویسے یہاں مولانا حسین احمد صاحب کو حضرت ندوی سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوگئی تھی۔ بہر حال اس سفر کے حوالے سے خود حضرت مولانا ندوی لکھتے ہیں کہ:

”ادھر کئی سال سے بنگلا دیش کے دوستوں کے طرف سے بنگا دیش آنے کے لئے اصرار تھا، میری اردو عربی کی تصنیفات وہاں شوق سے پڑھی گئی تھیں، دار العلوم ندوۃ العلماء کے بھی کچھ فضلاء

تھے، اور خاص طور پر بنگلا دیش کے ایک نوجوان عالم مولوی محمد سلطان ذوقؔ جو چاٹگام کے جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں استاد تھے، اور جن کو ادب عربی کا اچھا ذوق ہے، اور خاص طور پر ادب اسلامی سے اور اس میں علامہ اقبال کے کلام اور اس میں میری عربی پیش کش ”روائع اقبال“ سے ان کو بڑی دل چسپی تھا، اور عرصہ سے وہ مجھ سے علمی وقلمی رابطہ رکھتے تھے، لکھنؤ بھی آچکے تھے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں طویل قیام بھی تھا اس سفر کے بڑے داعی تھے۔

آخر اس سفر کی تقریب نکل آئی، بنگلا دیش کے بعض اہم مدارس اور تنظیموں کی خواہش اور طلب اور اسلامک فاؤنڈیشن کی دعوت پر وہاں کا سفر طے کرلیا گیا، اور ۹ / مارچ / ۱۹۸۴ء کو رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ جن میں مولانا عبد الکریم پارک، مولانا ابو العرفان خان ندوی، عزیزی مولوی سید سلمان حسنی ندوی، اور میرے سفر کے عام رفیق ومعاون حاجی عبد الرزاق رائے بریلوی تھے، ۹ / مارچ / ۱۹۸۴ء کو جمعہ کے دن بذریعۂ ہوائی جہاز لکھنؤ سے کلکتہ ہوتے ہوئے ٹھیک مغرب کے وقت ڈھاکہ پہنچا، جناب بشیر الدین صاحب (مالک جمیل الدین لمیٹڈ ۳۶ / نیو اسکائن ڈھاکہ) کے یہاں قیام ہوا، جو ایک دین دار صاحبِ خیر تاجر اور اکثر علماء کے میزبان رہتے تھے۔

بنگلا دیش میں ۹ / مارچ / ۱۹۸۴ء سے ۱۹ / مارچ / ۱۹۸۴ء تک دس روز قیام رہا، اس سفر میں ڈھاکہ، چاٹگام، کوکس بازار، مومن شاہی (میمن سنگھ) اور سلہٹ کے مرکزی مقامات پر جانا ہوا، بڑے بڑے جلسوں میں خطاب ہوا، اور مدارس کا معاینہ کیا گیا، چاٹگام اور کوکس بازار کے دورہ میں نہلا تک جانا ہوا، جو برما کی سرحد پر واقع ہے، وہاں ہماری آمد کو سن کر برما کے بہت سے اہل ذوق اور اہل علم تشریف لائے، ڈھاکہ کے قیام میں سنارگاؤں بھی گئے، جو قدیم مسلم سلطنت کی آخری مشرقی سرحد تھی، یہیں سے شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی سڑک شروع ہوتی تھی، (جونیلاب، سندھ) تک جاتی ہے، اب یہ مقام پینام (PAINAM) کے نام سے ضلع ڈھاکہ میں شامل ہے“۔(۱)

اس سفر مبارک سے واپسی کے حوالے سے حضرت مولانا دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

(۱) ملاحظہ ہو: کاروان زندگی حصہ سوم، ص: ۵۵-۵۶

''۲۰ / مارچ کو ہوائی جہاز سے وفد کی کلکتہ واپسی ہوگئی، اس سفر میں مولوی سلطان ذوقؔ صاحب، موی عبید الحق صاحب، صدر مدرس مدرسہ عالیہ ڈھاکہ اور ان کے صاحب زادہ عزیزی مولوی سعود الحق ندوی اور مولوی محی الدین صاحب ایڈیٹر ''مدینہ'' ڈھاکہ کی خاص معاونت و رفاقت رہی، جزاھم اللہ خیر الجزاء''۔(۱)

بہر حال حضرت مولانا ندوی اس سفر کے دوران جامعہ اسلامیہ دار السنہ تشریف لائے تھے، جہاں اس زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب مدرس تھے، مولانا ندوی کی تشریف آوری ہوئی تو آپ کا شاندار استقبال ہوا، یہاں کے سالانہ جلسہ کے دوران آپ کو استقبالیہ دیا گیا، جس میں عربی میں ایک سپاس نامہ دیا گیا، جسے لکھنے اور مجلس میں پڑھنے والا کوئی اور نہیں بس مولانا حسین احمد صاحب ہی تھے۔

مولانا حسین احمد صاحب کا بیان ہے کہ: ''یہاں حضرت مولانا ندوی کی تشریف آوری پر مجھے بڑی خوشی ہوئی، کیوں کہ مجھے آپ کے دیدار کی آرزو مدت سے ستاتی رہی تھی، آج حضرت مولانا کی تشریف آوری پر میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی'' مولانا حسین احمد صاحب کے دیگر بیانات سے پتہ چلا کہ جبھی حضرت مولانا ندوی نہلا تشریف لائے آپ فرط مسرت سے باغ باغ ہو گئے تھے، مولانا کی واپسی پر جب آپ گاڑی پر سوار ہو رہے تھے، مولانا حضرت مولانا ندوی سے ایسے لپٹ گئے کہ آخر مولانا ندوی کو آپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنا پڑا کہ ''تم ندوے ضرور آؤ!''۔(۲)

بایں ہمہ مولانا حسین احمد صاحب نے حضرت مولانا ندوی کی زندگی میں ندوے کی زیارت کی اور ضرور کی، لیکن ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد، جس کی قدرے تفصیلات خدا کرے تو اگلی سطور میں آئیں گی۔

غرض بات یہ ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب حضرت مولانا ندوی کے بڑے شیدائی ہیں، مولانا ندوی

---

(۱) ملاحظہ ہو: کاروانِ زندگی حصہ سوم، ص: ۶۴

(۲) مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اس سفر کے متعلق مزید تفصیلات حضرت مولانا کی قابل قدر خود نوشتہ کتاب ''کاروانِ زندگی'' کے حصۂ سوم کے ساتھ مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی حفظہ اللہ کی ''نقوش زندگی'' ملاحظہ ہو۔

کی لٹریچرز، آپ کے علمی و فکری خیالات و نظریات، آپ کی بے لوث خدمات، حقیقت پسندی و متانت، اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ آپ کے انفاس عالیہ سے شدید متأثر ہیں، علاوہ ازیں آپ حضرت مولانا ندوی کو صدی کے سب سے بڑے مثالی انسان سمجھتے ہیں، جو میرے نزدیک بھی سراسر حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہے، کسی بھی مجلس میں حضرت مولانا ندوی کا تذکرہ آتا ہے تو آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، حتی کہ حضرت مولانا ندوی کے ساتھ آپ کی محبت اور محبت بھرے تأثر نے مجلس کو بھی اشکبار کر دیتا ہے، ہمیشہ حضرت مولانا کے نام اس عقیدت و محبت سے لیتے ہیں کہ حاضرین مجلس میں جو مولانا ندوی کو جانتے اور آپ کی طرف منسوب ہوتے ہیں، ان کے دل فرط محبت سے تڑپ کر رہ جاتے ہیں، اور جو مولانا ندوی کو اتنے نہیں جانتے اور آپ سے لگاؤ نہیں رکھتے وہ بھی محو حیرت ہو جاتے ہیں، مولانا حسین احمد صاحب نے میرے علم کی حد تک علماء تو علماء بہتوں دانش وروں کو بھی حضرت مولانا ندوی کی شخصیت، آپ کے انفاس عالیہ اور آپ کی دینی روحانی، علمی و ثقافتی اور دعوتی و انسانی خدمات سے متعارف کرایا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ہماری برادری کے بہتوں دانش وروں کو آپ نے حضرت مولانا کی کتابیں خرید کر ہدیہ دیں، جن میں سے بعض حضرات نے اعتراف بھی کیا ہے کہ حضرت مولانا کی کتابیں پڑھ کر ان کو بہت ہی فائدے ہوئے ہیں، اسی طرح مولانا حسین احمد کی گفتگو سے متأثر ہو کر ہماری برادری کے بہتوں دانش وران حضرت مولانا ندوی کی ذات و شخصیت اور آپ کی کتابوں کے شیدائی بنے ہیں۔

بہر حال حضرت مولانا ندوی جامعہ اسلامیہ دار السنہ تشریف لائے تو آپ کے قیام کے لئے مولانا حسین احمد صاحب کا کمرہ منتخب کیا گیا، آپ کو اسی کمرے میں ظہرانہ دیا گیا، اور مولانا آپ کے تکیہ پر سر رکھ کر تھوڑا قیلولہ فرمایا، تو مولانا حسین احمد صاحب کے دل فگار بیان کے مطابق یہ ان کی زندگی کا قابل فخر سرمایہ بن گیا ہے، اور کیوں نہ ہو کہ مولانا ندوی جیسے ایک انسان کا آپ کے کمرہ میں تشریف لانا اور آپ کے تکیہ پر سر رکھنا افتخار کا سامان نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟۔

پچھلی سطور میں جس طرح عرض کی گئی ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب نے حضرت مولانا ندوی کی آمد پر جو سپاس نامہ لکھا اور اسے بھرے جلسے میں پڑھ سنایا تھا، اس کا نسخہ تلاش بسیار کے باوجود آج تک نہیں ملا، اس حوالے سے میں نے خود مولانا سے پوچھا تو فرمایا کہ:

"افسوس ہے اس سپاس نامے کا کوئی نسخہ میرے پاس نہیں ہے، اس زمانے میں اس کی خاصی تقسیم ہوئی تھی، مولوی رفیق، مولانا قاری بدر الاسلام اور مولانا عقیل احمد قاسمی وغیرہ کے پاس نسخے تھے، شاید اس کا کوئی نسخہ دار السنہ نہلا کے دفتر میں بھی ہو"۔

ادھر اس بات پر راقم السطور کو بڑا تعجب ہوا ہے کہ استاد محترم حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب نے اپنی آپ بیتی "نقوش زندگی" میں حضرت مولانا ندوی کے اس مذکورہ سفر کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، ہر چیز بڑی تفصیل سے لکھی گئی ہے، جامعہ اسلامیہ دار السنہ نہلا کے مذکورہ سفر پر خاصی روشنی ڈالی ہے، لیکن اس میں بھی مولانا حسین احمد صاحب کے سپاس نامہ کے حوالے سے حضرت ذوق کا مبارک اور رواں قلم بالکل خاموش ہے، اس خاموشی پر کافی سوچ بچار کے باوجود آج تک کوئی منطقی نتیجہ نہیں نکال سکا۔

یہاں ایک بات کا تذکرہ میرے نزدیک بہت اہم ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب نے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی عدیم المثال شخصیت اوران کی گوناگوں صفات وکمالات، ان کی بے مثال دینی، ملی، ادبی، ثقافتی، فکری اور سیاسی خدمات سے بے حد متاثر ہیں، علاوہ ازیں میری معلومات کی حد تک آپ مولانا آزاد اوران پر لکھی گئی پرانی لٹریچرز کے صفحے صفحے سے نہیں بلکہ سطر سطر سے واقف بھی ہیں، بایں ہمہ ظاہر ہے کہ آپ نے آزاد کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ جب کہ آپ نے مفکر اسلام حضرت مولانا ندوی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے اور اپنی زندگی میں حضرت مولانا سے کم سے کم دو مرتبہ ملاقات کی سعادت بھی حاصل کی ہے، ایک طرف مولانا محترم کی آنکھوں کے سامنے حضرت مولانا کی تقریبا ساری کتابیں ہیں تو دوسری طرف حضرت مولانا کی شخصیت عالی مرتبت اور دینی وروحانی کمالات بھی۔ تو میرے خیال میں اگر چہ مولانا محترم ان دونوں عظیم شخصیات سے متاثر ہیں، لیکن مولانا آزاد کی بہ نسبت حضرت مولانا ندوی کی طرف آپ کے قلبی رجحان کا پلڑا کچھ بھاری سا نظر آتا ہے، یہ شاید اس لئے بھی ہو کہ:

۱۔ عالی نسبی: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تو ظاہر ہیں کہ حسنی سادات میں سے ہیں، جن پر کسی کی دو رائے نہیں، تو ایک سید سے محبت رکھنا مسلمانوں میں سے کون نہیں جانتا ہے کہ ایک مسلمان کا ایمانی تقاضا اور دینی فرض ہوتا ہے۔

۲۔ انفاس عالیہ: روحانی نقطۂ نظر سے حضرت مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، ویسے حضرت کے وہ انفاس عالیہ جنہوں نے ایک جہاں کے لوگوں کے دلوں کو آباد کیا ہے، اس کی

طرف ایک صاحب ذوق اور حساس انسان کے قلبی رجحان کا ہونا ایک فطری امر ہے۔

۳۔ علاوہ ازیں: مولانا حسین احمد اگر چہ دونوں عظماء کے شیدائی ہیں، لیکن آپ حضرت مولانا ندوی کو دینی وایمانی اور روحانی اعتبار سے ایک مثالی انسان سمجھتے ہیں، جب کہ مولانا آزاد کو بعض امور کے حوالے سے جن کا تذکرہ یہاں مناسب بھی نہیں کہ مولانا ندوی جیسے مثالی نہیں سمجھتے ہیں، بہرحال یہ تو میرے ذاتی خیالات ہیں، جن میں لغزش کی گنجائش ضرور ہے، خاکم بدہن اور گستاخی معاف۔

شادی وخانہ آبادی:

جامعہ اسلامیہ نہلا کی تدریسی خدمات کے دوران جنوری ۱۹۸۴ء میں مولانا حسین احمد صاحب کی شادی خانہ آبادی محترمہ عارفہ بیگم بنت سلطان احمد بانگونوی، بوسیدنگی سے ہوئی، یہ شادی بڑی سادگی سے ہوئی، جو دینی وشرعی نقطۂ نظر سے ایک بڑے عالم دین کے حسب حال تھی، اس شادی کی تقریب میں میاں بیوی کے خاندانوں کے بزرگوں کے علاوہ مولانا کے اساتذۂ کرام اور چند دیرینہ ساتھی بھی حاضر ہوئے تھے، سنا تھا کہ اس مبارک شادی کے حوالے سے مولوی ابوطاہر صاحب بانگونوی نے بڑی قابل داد خدمات انجام دیں، اور شادی کے کام کو انجام تک پہنچانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

مولانا کی رفیقۂ حیات:

کہتے ہیں کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی رفیقۂ حیات محترمہ عارفہ بیگم کی پیدائش بمقام جبار فارا میں ہوئی ہے، لیکن میری اطلاع اور جانکاری کے مطابق قصبۂ علی چنگ کی بستی بانگونہ،، بوسیدنگ میں ہوئی، اور بہت ہی کم عمری میں اپنے والدین کے ساتھ منتقل ہو کر جبار فارا بوسیدنگ گئیں اور یہاں ان کا نشوونما اور تعلیم ہوئی تھی۔

محترمہ عارفہ بیگم ماشاء اللہ ایک پڑھی لکھی اور بڑی خوش خصال خاتون ہیں، مولانا کی والدۂ محترمہ کے علی الرغم آپ کے خاندان اور گھرانے کے بعض بزرگوں کے کچھ قابل قدر بیانات سے اندازہ ہوا کہ محترمہ ایک عابدہ، پارسا، زاہدہ، مدبرہ اور کافی سنجیدہ خاتون ہیں، جنہوں نے اس مبارک شادی وخانہ آبادی سے لے کر تادم تحریر نہ صرف اپنے لائق وفائق خاوند کی بلکہ ان کے گھرانہ یعنی سسرال والوں کی قابل داد خدمات انجام دیں، اور اس حوالے سے کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی، علاوہ ازیں خانگی

زندگی کے اس طول طویل سفر کے دوران مجھے ذاتی طور پر بھی ان کے صبر وشکر کا خاصا اندازہ ہے، حتی کہ ان کے صبر وشکر کا عالم دیکھ کر خود مجھے رشک آتا تھا کہ ایک جلیل القدر عالم دین اور ایک خادم قوم وملت کی شریک حیات ہو تو اس شان کی، ورنہ ظاہر ہے کہ مولانا جس آن بان، شان وشوکت، نازک مزاج اور رنگا رنگ افتادِ طبع کی ہستی ہیں، ان کا ساتھ دینا اور بجا طور پر دے سکنا معمولی کام نہیں، بلکہ یہ ایک کرامت سے کم نہیں ہے، لیکن یہ محترمہ کی بلند حوصلگی اور قابلیت ہے کہ زندگی کے اس طویل سفر میں آپ اپنے لائق وفائق خاوند کا بڑی حسن اسلوبی سے ساتھ نبھائیں، اور بجا طور پر ساتھ نبھانے میں کامیابی حاصل کی، دراصل بات یہ ہے کہ محترمہ کی ان کامیابیوں اور کامرانیوں کے حوالے سے مزید قلم اٹھایا جائے تو داستان بڑی طویل ہوگی، جس کے لئے یہ عجالہ کافی نہیں ہے۔

محترمہ عارفہ بیگم کے مجھ ناچیز پر بھاری احسانات ہیں، جن کے بوجھ تلے میں اب تک دبا ہوا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ میں ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۸ء تک مولانا کے سایۂ لطف وعاطفت میں رہا، پھر اس کے بعد کبھی کبھار حاضری دینے اور کبھی کچھ مدت تک قریب رہنے کا موقع بھی ملا تھا، طالب علمی کے اس طویل سفر کے دوران مولانا کے تہ بتہ محترمہ کے جو احسانات مجھ پر ہیں ان کا احصاء کبھی بھی ممکن نہیں، دل چاہتا ہے کہ ان احسانات پر قلم اٹھاتا جاؤں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا ابتدا کہاں سے کروں اور انتہاء کس مقام پر ہو؟ تاہم ان تمام احسانات کے سمندر سے اس عجالہ میں سہی ایک موتی ضرور نکال لاتا ہوں، کہ جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ محترمہ کے ان احسانات کی نوعیت کیا تھی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ محترمہ اپنے لائق خاوند کی طرح کتنی عالی ظرف اور بلند مرتبہ کی خاتون ہیں۔

جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی جا چکی ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب نے ۱۹۸۴ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک مجھ جیسے ناچیز کو پڑھا چڑھا کر یا دوسرے الفاظ میں مجھے اپنے آغوشِ تربیت میں رکھ کر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ انڈیا بھیجنے کے لئے کسی قدر تیار کیا، اور تو اور اس تیاری کے دوران ان دونوں نے کتنی تکلیفیں برداشت کیں وہ بھی ایک الگ داستان ہے، جس کی تفصیلات سے قطع نظر ایک واقعہ کا تذکرہ یہاں کئے دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میرے ندوۃ العلماء کے سال اول مصارف کے حوالے سے مجھے بڑی پریشانی لاحق ہوئی تھی، کبھی دل چاہتا تھا پڑھائی چھوڑ چھاڑ کر

بنگلا دیش واپس چلا جاؤں، لیکن دل مانتا ہی نہ تھا، ایسے حالات میں صدیق مکرم مولوی نور الہدی قاسمی ندوی صاحب جو اسی زمانے میں ندوے پڑھتے تھے، کسی ضرورت پر بنگلا دیش گئے، انہوں نے چاٹگام میں مولانا حسین احمد صاحب سے ملاقات کی، یوں مولوی صاحب کی زبانی مولانا میرے حالات سے واقف ہو گئے تو مولوی صاحب کی واپسی پر مولانا نے اپنی شریکِ حیات کی ہار رہن میں رکھ کر میرے لئے پچاس ڈالر کا تحفہ بھیجا، اور ساتھ ہی ایک رسالہ بھی میرے نام لکھا، یہاں جس سے چند سطریں حاضر خدمت ہیں:

''آج زندگی کی پیاری چیزیں رہن میں چھوڑ کر تمہارے پیغام کا تیار ہوا، مگر چند دنوں کے اندر پورے سال کا توشہ پہنچا دیتا ہوں، خدا کرے کہ یہ خوش گوار سلسلہ دراز سے دراز تر رہے، ادھر تمہارے نونہال زندگی پر لوگوں کی خشک حسرت ہے۔ ع

حسرت ہے ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجا گئے۔

ناظرین کرام کو سطور بالا کے چند سطری بیان سے اندازہ ہو چکا ہوگا کہ مولانا اور آپ کی رفیقۂ حیات کے مجھ ناچیز پر کس آن بان کے احسانات ہیں؟ طالب علموں کے ساتھ معاملات اور ان کے ساتھ سخاوت کا برتاؤ اور دریا دلی کے مظاہرے کے حوالے سے ہماری لوگوں کے جو رجحانات تھے اور ہیں، ان سے اہل فکر ودانش بخوبی واقف ہیں، تو ہمارے ایسے حالات کے تناظر میں سوچا جائے تو کسی بھی اہل نظر کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ایک مفلس اور غریب الدیار طالب علم کو اس شان سے مدد کرنا، اور وقت وقت پر یاد رکھنا کس دلی رجحان کا عکاس ہے، جب کہ مولانا محترم اس وقت معاشی لحاظ سے بڑی مشکلات کے شکار تھے، جو سطور بالا کے مندرجات سے ظاہر ہیں، یہاں مجھے تعجب اس بات کا ہے کہ مولانا تو آخر مولانا ہی ہیں، جن کی دریا دلی اور فیاضی کی ایک الگ داستان ہے، رہی آپ کی رفیقۂ حیات کی دریا دلی اور وسعتِ ظرفی جو اس زمانے تک میری نظروں سے اوجھل تھی، مذکورہ فراخ دلی سے آشکار ہوگئی، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنے خاص فضل وعنایات سے ان دونوں کی حیات میں برکت دے اور ان کی یہ اور اس قسم کی فیاضی اور دریا دلی ان کی اولاد واحفاد کے حق میں کام آئے۔

محترمہ عارفہ بیگم کا خاندان میرے نانہال کے قریب میں عرصۂ دراز سے آباد تھا اور اب بھی ہے، اور

میرے ننہال والوں کے ساتھ اس خاندان کی رشتے داریاں بھی ہیں، اور تو اور محترمہ کے تایاؤں اور چچوں کے ساتھ میرے خاصے تعلقات بھی تھے، جہاں تک اس خاندان کے متعلق معلومات ہیں ان کی بنیاد پر عرض ہے کہ کہنے میں یہ خاندان ایک علمی خاندان تو نہیں ہے، تاہم ملت وقوم کے حوالے سے اس خاندان کے اکثر افراد خاصے درد مند ہیں، یہاں اس خاندان کے دیگروں کو چھوڑ کر صرف اور صرف ان کے والد مرحوم کے ساتھ ان کے تایاؤں اور چچوں کے متعلق اجمالا بالترتیب کچھ تذکرے یہاں حاضر مت ہیں:

۱۔ <u>بن یامین مرحوم</u>: مرحوم بن صاحب مرحوم محترمہ عارفہ بیگم کے تایا تھے، کچھ پڑھے لکھے بڑے تاجر تھے، بڑے سخی منش اور عابد انسان بھی، ہماری آنکھوں کے سامنے انہوں نے غریبوں، مسکینوں اور پریشان حالوں کی جو مدد کی، اس سے اندازہ ہو چکا تھا کہ آپ ایک فیاض انسان ہیں۔

۲۔ <u>احمد صاحب مرحوم</u>: محترمہ عارفہ بیگم کا یہ تایا عرصۂ دراز تک پولیس میں تھے، بڑے بہادر، نڈر اور قوم پرست انسان تھے، پولیس میں رہ کر انہوں نے قوم کی خاصی خدمت کی، شاید ہی کبھی کسی کا دل دکھایا ہوگا، زبان کے بڑے سچے تھے، زندگی میں ان سے بہت ہی شفقت ملی، صوم وصلاۃ کے نہایت پابند تھے، آپ نماز فجر میں ''سورۃ الفجر'' کی تلاوت بہت پسند کرتے تھے۔

۳۔ <u>جناب سلطان احمد صاحب مرحوم</u>: محترمہ عارفہ بیگم کے والد گرامی جناب سلطان احمد صاحب کی پیدائش اپنی آبائی بستی بانگونہ، بوسیدنگ میں ہوئی، بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول میں کچھ تعلیم پائی، کچھ بڑے ہوئے تو کاشتکاری سے دل چسپی لی، لیکن چند سالوں کے بعد نجی تجارت میں اترے، اور بوسیدنگ شہر میں دکان داری شروع کی، اللہ تعالی نے ان کی تجارت میں بڑی برکت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر بوسیدنگ کے ان مال دار تاجروں میں شمار ہونے لگے کہ جن کی شہرت اطراف بوسیدنگ کے علاوہ ارکان کے دار الحکومت اکیاب تک پہنچی ہوئی تھی، انہوں نے جبار فارہ بوسیدنگ میں اس زمانے کے لحاظ سے ایک خوب صورت مکان بنایا تھا، جس میں آپ کی اولاد کا نشوونما ہوا۔

لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا کہ اگلے چند سال گزرتے نہ گزرتے ان کی تجارت پر کسی کی نظر لگ گئی، اور خساروں پر خسارے اٹھاتے ہوئے ان کی تجارت زمین بوس ہو گئی تھی۔ عمر کے آخری چند سال

انہوں نے بڑی پریشانی کے عالم میں گزارے، بالآخر ان کو فالج کے مرض نے آدبوچا، جہاں تک یاد ہے کہ ۱۹۸۵ء کے دوران تشخیص ومعالجہ کے سلسلے میں چاٹگام آئے، مولانا حسین احمد صاحب نے ان کا مقدور بھر معالجہ کرایا، لیکن صحت یاب نہیں ہو سکے، علاج ومعالجہ کے بعد دوبارہ وطن واپس گئے، اور اسی پریشانی کی حالت میں ۱۹۸۷ء میں انتقال کیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

جناب سلطان احمد صاحب نہایت علماء دوست اور طلباء پسند بزرگ تھے، علاوہ ازیں ان کے خاندانی بزرگوں کی طرح بڑے سخی منش بھی، راقم سطور کے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کیا کرتے تھے، الحمد للہ دوران معالجہ مجھے بھی ان کی کچھ خدمت کرنے کی توفیق ہوئی تھی، اللہ تعالی ان کو مغفرت کے ساتھ جنت الخلد میں جگہ عطا فرمائے۔

۴۔ <u>ابوطالب صاحب مرحوم</u>: محترمہ عارفہ بیگم کا یہ چچا بڑے نیک آدمی تھے، ہمارے عنفوان شباب کے زمانے میں بوسیدنگ میں تجارت کرتے تھے، زبان قدرے کڑوی تھی، لیکن لوگ کہتے تھے کہ آپ دل کے بہت اچھے تھے، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ جناب ابوطالب صاحب بطور خاص اپنے علاقے کے لوگوں کو دل کھول کر مدد کیا کرتے تھے۔

۵۔ <u>ابوطیب صاحب مرحوم</u>: محترمہ عارفہ بیگم کا یہ چچا ابوطیب صاحب ایک اچھے اور کامیاب تاجر تھے، لوگوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے، جسے پسند کرتے اس کے سامنے دل چھیر کر رکھ دیتے تھے، جبھی میں ان کی نظر میں پڑتا، نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔

۶۔ <u>نور العالم صاحب مرحوم</u>: محترمہ کا چچا نور العالم مرحوم بڑے عالم دوست اور طلباء پسند انسان تھے، کاشتکار تھے لیکن نہایت دیانت دار، ان کی زبان اتنی میٹھی تھی کہ دل چاہتا تھا کہ کاش میری زبان اتنی میٹھی ہوتی، صوم وصلاہ کے بڑے پابند تھے، اور خلیق بھی۔

۷۔ <u>محمد ایوب صاحب</u>: محترمہ کا یہ چچا صوم وصلاۃ کے نہایت پابند ایک کامیاب تاجر ہیں، ساتھ ساتھ ان کے خاندان کے دیگر بزرگوں کی طرح نہایت دیانت دار اور سخی بھی، بڑے خوش اخلاق انسان ہیں، لوگوں کے دل دکھانے کی بات تو دور بلکہ دل کا خوش کرنا ان کی زندگی کی عادت ثانیہ ہے، زبان کے پکے اور خاصے سخی بھی، حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی سعادت سے سرفراز ہوئے،

حالیا اپنی آبائی بستی میں قدرے خوش حال رہائش پذیر ہیں، ملی خدمات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔
بہر کیف محترمہ عارفہ بیگم نہایت پردہ نشین خاتون ہیں، اور تو اور ہماری عام روایت کی طرح سسرال کے مردوں سے کبھی بھی بے تکلف نہیں رہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ پردہ کے خاص لحاظ رکھنے والی پورے اسلامی ذہن کی خاتون ہیں، اللہ تعالی وہ ان کی اولاد کو مزید توفیق عطا کرے۔

عارفہ بیگم کو جہاں تک میں نے اندازہ کیا کہ اپنی مریضہ ساس سے نہایت ہمدردی رکھتی تھی، ہماری عام روایات کے تناظر میں عرض ہے کہ ہمارے گھریلو معاشرے میں عام طور پر ساس کو بہو سے اور بہو کو ساس سے آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہے، بسا اوقات ساس کوئی نہ کوئی بات طنزیہ انداز میں بہو سے کہتی رہتی ہے، اسی طرح بہو بھی کسی نہ کسی رنگ میں ساس کو نشانۂ طنز بنائے رکھتی ہے۔لیکن مولانا کے گھر سے ایسی کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔تھوڑی بہت کوئی بات اس حوالے سے ہوئی بھی ہو تو وہ کسی کے سامنے کبھی نہیں آئی۔ بہر حال عارفہ بیگم نے اپنی بیمار ساس کی بڑی خدمت کی، بالآخر ان کی بیمار ساس انہی کی رہائش گاہ میں انہی کے ہاتھ پر ۱۹۹۲ء میں رحلت کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس عنوان کے آخر میں چلتے چلتے ایک بات بتاتا چلوں مولانا حسین احمد صاحب اپنی اہلیہ کی نہایت قدر کرتے ہیں، اور جہاں تک میں جانتا ہوں کہ محترمہ بھی اپنے لائق خاوند کی عزت ووقار کا خاصا خیال رکھتی ہیں، مولانا اپنے خاص اوقات میں راقم سطور سے دونوں کے درمیان ہونے والی عزت واحترام اور باہم قدردانی کی باتیں بڑے شگفتہ انداز میں کہہ سناتے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی دونوں کی باہمی محبت میں مزید برگ وبار لائے۔

مولانا کی دوسری اہلیہ:

حضرت مولانا حسین احمد صاحب ۲۰۰۲ء میں سعودی عرب گئے، ظاہر ہے کہ آپ اتنے سالوں تک بنگلادیش سے سعودی عرب آتے جاتے رہے تھے، لیکن آپ کا یہ سفر تادم تحریر وہاں کے لئے آخری سفر ثابت ہوا۔ آپ نے اس سفر کی ابتدا میں مکہ مکرمہ میں نجی تجارت شروع کی، آپ کے مطابق جس میں اللہ تعالی نے کافی برکت دی، اور بڑی قلیل مدت میں لاکھوں کی کمائی ہاتھ آئی تھی۔

مالی اعتبار سے کچھ فراوانی کے بعد غالبا ۲۰۰۷ء میں آپ نے دوسری شادی کی ٹھان لی، کافی تلاش وجستجو کے بعد وطن کے معروف قصبہ فوٹمالی میں رہنے والی ایک خاتون کی خبر ملی تو اس کے گھرانے سے رابطہ کیا گیا، ویسے گھرانہ بھی اپنی بیٹی دینے اور سعودی عرب بھیجنے کے لئے راضی ہو گیا، تو آپ نے اپنے ایک شاگرد کے تعاون سے اس خاتون کو سعودی لے جانے میں کامیابی حاصل کی، اور نکاح کی صورت میں آپ کا دوسرا گھر بس گیا تھا۔

مولانا کی یہ دوسری گھر بسائی کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کے لئے پہلی والی اہلیہ بھی آئی تھی، اس حوالے سے مولانا کا بیان تھا کہ: ''دونوں کے درمیان بہت محبت ہوگئی، دونوں ایک دوسری کو سگی بہن جیسی دیکھنے لگیں، ان کی آپس کی محبت دیکھنے کی قابل تھی، جو میری توقع سے باہر تھی''۔

محلہ خالدیہ مکہ مکرمہ میں مولانا کے اس دوسرے گھر میں آپ سے میری متعدد ملاقاتیں رہیں، دراں حالیکہ اس دوسری اہلیہ کے بطن سے پہلی صاحب زادی تسنیم پیدا ہوئی کوئی ڈیڑھ دو سال ہو چکے تھے، آپ کو ان کی اس دوسری اہلیہ کے حوالے سے کافی مطمئن نظر آیا، اور اس کے متعلق پوچھنے کی جرأت رندانہ کی گئی تو فرمانے لگے:

> ''دراصل یہ میری دوسری شادی ایک ضرورت اور مجبوری کی بنیاد پر ہوئی تھی، مبادہ اگر یہ شادی نہیں ہوئی ہوتی، تو ایک طرح کی میری جسمانی اور روحانی حالت آج تک دگرگوں ہو چکی ہوتی، اللہ تعالی کا کرم ہے کہ اس نے مجھے ایک مشکل سے بچا لیا''۔

بہر حال مولانا کی زندگی خوش وخرم گزر رہی تھی، اس اہلیہ کے بطن سے دو صاحب زادیاں تسنیم اور کوثر بھی پیدا ہو چکی تھیں، ایسے حالات میں قدرت کو کچھ اور منظور ہو گیا کہ آپ کی اس خوش حالی پر حاسدین کی نظریں لگ گئیں، اور مولانا بالکل غیر متوقع اور ناگہانی طور پر زیر حراست ہو گئے، تو آپ کی یہ اہلیہ وہاں کے حالات (جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں) اور مشکلات ومصائب کی شکار ہو گئی، اور بڑی مجبوری ومعذوری کی حالت میں اس نے ہماری برادری کے ایک صاحب سے شادی کر لی، ویسے وہ مولانا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ مولانا کوئی آٹھ نو سال بعد جیل سے رہا ہو سکے، صاحب زادیاں جو ماں کے ساتھ رہتی ہیں ماشاء اللہ کچھ بڑی سی ہو گئی ہیں، شنید ہے کہ ہمیشہ باپ سے ملنے آیا کرتی ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کی حیات دراز کرے، اور ان کی جتنی کمی ہیں، غیب سے پوری ہو جائیں۔

حجاز مقدس کا پہلا سفر:

جامعہ اسلامیہ دارالسنہ نہلا کی تدریسی خدمات کے دوران مولانا حسین احمد صاحب نے اس ادارے کے مہتمم دانش ور جناب فقیر منظور احمد/ ابوالمنظور صاحب (۱) کی معیت میں حجاز مقدس کا پہلا سفر کیا، جس میں آپ کو حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی سعادت نصیب ہوئی، اس حیثیت سے آپ کا یہ دورہ بڑا بارآور ثابت ہوا، ایک طرف اس سفر کی وجہ سے حجاز مقدس میں پائے جانے والے بعض اہل خیر حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں، تو دوسری طرف مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں رہائش پذیر روہنگیا برادری کے دل جلے افراد وشخصیات کو قریب سے دیکھنے ان سے سننے اور ان کو سنانے کا موقع ملا تھا۔

یہ تو ظاہری بات ہے کہ مولانا ایک جلیل القدر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فکری، سیاسی اور انقلابی سوچ رکھنے والے انسان ہیں، تو جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ نے اس سفر کے دوران وہاں پائی جانے والی روہنگیا برادری کے قوم وملت پر سوچ رکھنے والے اہم لوگوں سے ملاقاتیں کیں، اور ان سے روہنگیا قوم وملت کے مستقبل کے حوالے سے تبادلۂ خیالات کیا، اور قوم کے متعلق اگلے لائحۂ عمل پر غور کیا گیا تھا، اور مشورہ چاہا کیا کہ ملت وقوم کے ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

اس سفر کے حوالے سے بعد میں آپ کی باتوں سے جہاں تک اندازہ ہوا کہ ہماری برادری کے بعض دل جلے افراد نے جن میں قابل قدر علماء اور دانش وران تھے، آپ کو زیر زمین انقلابی میدان میں اتر نے اور اس کے لئے میدان ہموار کرنے کا مشورہ دیا۔

---

(۱) محترم جناب الحاج فقیر منظور احمد/ ابوالمنظور صاحب مرحوم نہلا، ٹیکناف کے رہنے والے تھے، خاندانی طور پر صاحب ثروت ہونے کے علاوہ صاحب اقتدار بھی تھے، کیوں کہ آپ اس علاقے کے معروف چیرمن جناب مرحوم عبدالغفور میاں صاحب کے سگے بھائی تھے، یوں تو کہنے میں آپ ایک دانش ور تھے، لیکن ان کا وضع قطع، چال چلن اور ڈھنگ وادا عالم دین جیسی تھی، انہوں نے اپنے طویل دور اہتمام میں اندرون مدرسہ اور باہر بھی بجا طور پر شاید ہی کسی عالم دین کو اس شکایت کا موقع دیا ہو کہ وہ ایک عالم نہیں بلکہ ایک دانشور ہیں، انہوں نے عرصۂ دراز تک اس ادارے کے اہتمام کی ذمے داریاں بڑے حسن وخوبی سے نبھائیں، ان کے زمانے میں اس ادارے کی ترقی کے ساتھ کافی شہرت بھی ہوئی تھی، آپ نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی بڑی قدر کی، اللہ تعالی ان کے مراتب بلند فرمائے۔

چند مہینوں کے لئے وطن واپسی:

غالبا مولانا حسین احمد صاحب کی مذکورہ حجاز مقدس کے پہلے سفر کے دوران یا بعد کے اور ایک سفر میں آپ کے خیر اندیش واستاد حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری مہتمم جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ سے ملاقات ہوگئی۔ یاد رہے کہ مولانا مظاہری صاحب اس زمانے میں مع اہل خانہ رنگون میں رہائش پذیر تھے، لیکن کبھی کبھار حجاز کے دورے پر نکلتے تھے۔ بہر حال مولانا مظاہری نے آپ کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ وطن واپس ہو کر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کی خدمت کریں، تو آپ نے مظاہری صاحب کی اس پیش کش کو اس لئے قبول کیا کہ آپ اندرون وطن جا کر درس وتدریس کی آڑ میں قوم کے اگلے مستقبل کے لئے افراد تیار کریں گے، یوں حجاز مقدس کے سفر سے واپسی کے فورا بعد آپ نے وطن کی راہ لی۔

مولانا نے وطن پہنچتے ہی اپنے آبائی پرانے گھر کو توڑ کر ایک نیا مکان بنالیا، تا کہ یہ مکان آپ کی رہائش کے لئے شایان شان ہو، اس نئے گھر کے بنانے کے دوران مولانا سے میری زندگی کی پہلی ملاقات ہوئی، جو آگے چل کر بڑی باثمر نکلی ہے۔

ایک دن کا واقعہ تھا مولانا اپنی بستی سے ہماری بستی میں اپنے اس بننے والا نیا مکان کے لئے بانس خرید نے آئے، آپ کے ساتھ آپ کے دیرینہ ساتھی مولوی ابوطاہر صاحب بانگونوی (مرحوم) بھی تھے، دونوں ہماری بستی کا رہنے والا سلطان احمد جو مولانا کے رشتے کا بھائی تھے کے گھر کے آنگن میں درخت کے جھنڈ میں قریب راہ کھڑے تھے، ادھر سے میں مدرسہ کو نکلا تو مدرسہ جانے کے راستے پر ان دونوں کو کھڑے کھڑے محو گفتگو پایا، میں قریب گیا تو مولوی ابوطاہر صاحب نے آپ سے میرا تعارف (بحیثیت ایک ہونہار طالبعلم) بڑے بلند الفاظ میں کرایا، تو آپ نے مجھے پا کر خوشی کا اظہار کیا، شاید اس خوشی کا سبب یہ بھی ہو کہ آپ جس نیک مقصد کے تحت وطن آئے ہیں اس کا پہلا ثمرہ میں ہی نکلا۔ اور اپنے مخصوص انداز میں میرے ساتھ کچھ ایسی گفتگو کی جو میرے خواب وخیال سے کہیں بلند تھی، اور لگا کہ آپ کی اس تھوڑی سی گفتگو میں میرے دل کی ساری دھڑکنیں چھپی تھیں، اور میں اپنی مراد کو پالیا، ویسے میں آپ پر فدا ہو کر مدرسہ جانے کا ارادہ تک چھوڑ دیا، اور سارا دن آپ کے ساتھ رہ گیا۔

اب مولانا اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد بشمول مولوی ابوطاہر صاحب گھر جانے لگے تو میں نے مولوی ابوطاہر صاحب کے واسطے سے آپ کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں، تو میری یہ خواہش سن کر آپ بڑے خوش ہوئے، یوں میں آپ کے ساتھ ہوگیا تھا۔

رات گئی تک مولانا ہم دونوں سے محو گفتگو تھے، رات کھانے کے بعد چائے کا دور چلتا رہا تھا، یہاں میں نے آپ کی زبان سے ایسی ایسی باتیں سنیں جو دراصل میرے بن چھیڑے ساز دل کی آواز تھیں، گویا یوں لگتا رہا تھا کہ میری بن چھیڑی تاروں پر آپ نے اپنی کارگر مضراب سے ضرب لگا رہے تھے، آپ کی ہر ایک باتیں میرے ذہن و دماغ کے راستے سے گزر کر دل کو چھو رہی تھیں، در اصل بات یہ ہے کہ آپ سے اس پہلی ملاقات میں جو باتیں میں نے سنیں، ان کے تأثر کی تفصیلات بیان کرنے سے میرا گونگا قلم سرے سے قاصر ہے۔

اگلے دن مولانا پھر ہماری بستی کو جانے لگے، وہاں آپ کی کچھ ضروریات تھیں، میں اور مولوی ابوطاہر صاحب آپ کے ہم راہ تھے، بعد عصر راہ چلتے چلتے میں نے آپ سے ڈرتے ڈرتے ایک سوال کیا کہ مولانا! شاعر مشرق علامہ اقبال کے درج ذیل شعر کا مطلب کیا ہے؟

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہے
قوم دنیا میں یہی احمد بے میم کی ہے

مولانا نے یوں تو راہ چلتے چلتے اس شعر کا مطلب و مفہوم اپنی دانست کے مطابق بیان کر دیا، لیکن مولانا کے بیانات میرے دل کو چھو نہیں رہے تھے، کیوں کہ میں بزعم خود اس کا مطلب سمجھنے والا تھا، ادھر مولانا بھی تو طلبہ کی نفسیات سمجھنے کے ماہر ہیں، تو میری حرکات و سکنات سے یہ سمجھ گئے کہ میں آپ کے بیان کردہ مطالب و مفاہیم سے خاطر خواہ خوش نہیں ہوں، ویسے آپ بھی کب چھوڑنے والے تھے؟ یوں آپ اگلے تین چار گھنٹے اس شعر کے مطالب و مفاہیم کے بیان کرنے میں صرف کر ڈالے۔

اس بار مولانا نے مذکورہ شعر کے مطالب و مفاہیم کے حوالے سے ایسی ایسی حقیقتیں کھولیں جو میرے خواب و خیال سے بھی کہیں بلند تھیں، اب میں مطمئن ہونے کے ساتھ آپ کی علمی استعداد اور فکری پرواز کا مزید فریفتہ ہوگیا۔

ویسے مولانا کی معیت میں چند دن گزر گئے، میں مدرسہ کی پڑھائی سمیت ہر چیز کو بھول کر آپ کا ہو چکا تھا، ایسے میں میں نے آپ سے گزارش کی کہ آپ مجھے باضابطہ طور پر کچھ پڑھانا شروع کر دیں، تو گزارش کی قبولیت کے ساتھ میری پڑھائی شروع ہوگئی تھی۔

مولانا نے میرے درس کی ابتدا ''مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی معروف کتاب ''روائع محمد اقبال'' سے کی، ساتھ ہی ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''رسول رحمت'' کے بھی کچھ مضامین پڑھانے لگے، ایک روز آپ نے اپنی طرف سے فرمایا کہ انشاء کی پڑھائی بھی بہت اہم اور ضروری ہے، ویسے انشاء کی پڑھائی بھی شروع ہوگئی تھی، اور یہ سلسلہ اگلے چند مہینوں تک مسلسل جاری تھا، جس سے میری علمی و ادبی، فکری اور قلمی زندگی میں وہ فائدے ہوئے جن کے بیان سے میرا قلم قاصر ہے۔

میرا جماعت دوم کا سال تھا، سالانہ امتحان قریب آرہا تھا، والدین اور اساتذۂ کرام کی طرف سے مسلسل دباؤ آرہا تھا کہ کیوں میں مدرسہ کی پڑھائی اور امتحان کی تیاریاں چھوڑ کر مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ ہوگیا؟ مگر میں کسی کی سننے کو تیار نہیں تھا، ایسے میں اچانک ہوا یہ کہ مولانا محترم چند دن کے لئے بنگلا دیش گئے، تو میں نے اس درمیانی خلا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امتحان کی تیاریاں کرلیں اور سالانہ امتحان میں شریک ہوگیا۔ ابھی امتحانات ختم ہونے کا قریب تھا، ادھر سے مولانا بھی آگئے، پھر میں آپ کی ذات سے ایسا وابستہ و پیوستہ ہوگیا کہ آج تک علیحدگی کے نام تک کہاں؟

حقیقت یہ ہے کہ مولانا محترم سے چند مہینے کی پڑھائی نے میری زندگی کو بدل ڈالا،، میرے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ، میرے انداز و اطوار کے علاوہ طرز گفتگو میں بھی خاصا بدلاؤ آچکا تھا، لوگ تو کہہ ہی رہے تھے، ساتھ ساتھ جس کا انداہ مجھے خود بھی ہو رہا تھا، ان ساری چیزوں کو دیکھ کر کچھ میرے دیرینہ ساتھیوں میں حقد حسد کا بھبوکا پوٹنا شروع ہوگیا تھا، اور تو اور خود مولانا کی زبانی یہ بات سن کر نہایت ہی افسوس ہوا کہ ''میرے ایک استاد نے آپ سے شکایت کی کہ مولانا حسین احمد صاحب! طاہر بڑا ادب نا شناس ہے، ذرا اس کا خیال رکھنا، اور کبھی اسے اپنے سر پر چڑھانے کی کوشش نہیں کرنا۔ ع

حسرت ہے ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا گئے۔

بہر حال یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب جامعہ دارالسنہ نہلا جیسے علم وعمل اور درس وتدریس کے ماحول کو چھوڑ کر اندرون وطن کیوں گئے تھے، سرزمین بنگلا دیش تو درس و تدریس کے حوالے سے بہر صورت ارکان سے زیادہ موزون تھی، جہاں عزت تھی، شہرت تھی، نیک نامی تھی اور امن تھا، اندرون وطن میں تو پریشانیاں ہی پریشانیاں تھیں، یہاں امن وسکون نام کے کسی عنقاء کا تذکرہ بھی کرنا ایک بہت بڑا جرم تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا محترم اگر چہ بظاہر اپنے محسن استاد حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری کی خواہش پر جامعہ اسلامیہ عالیہ میں پڑھانے کے لئے وطن واپس گئے تھے، لیکن حقیقت میں آپ کا وطن لوٹنا ایک عظیم خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے بطور تھا، جس کا تذکرہ اگر چہ کچھ دبے ہوئے الفاظ میں پچھلی سطور میں کیا جا چکا ہے، لیکن قدرے تفصیلات یوں ہیں کہ دراصل آپ اپنے وطن کے لئے ایک قافلۂ سخت جان کی تیاری کے لئے ہمیشہ کوشاں تھے اور ہیں، آپ نے ہماری تاریخ سے سبق لیتے ہوئے فیصلہ کرلیا تھا کہ مختلف خیالات، متنوع نظریات اور بھانت بھانت کے مکاتب فکر کے لوگوں کے اجتماع سے ایک بامعنی قافلہ کبھی بھی تیار نہیں ہوسکتا، اس قافلۂ سخت جان کی تیاری کے لئے مخصوص تعلیم وتربیت کے ساتھ ایک ہی خیال، ایک ہی فکر اور ایک ہی نظریہ کے حامل لوگوں کی تنظیم اور تربیت کی ضرورت ہے، جو آگے چل کر قوم کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے، اس لئے آپ نے کمر ہمت باندھ کر اندرون وطن جانے کا فیصلہ کیا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وطن کی زمین بڑی کٹھن اور سنگلاخ ہوچکی ہے، مذکورہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی راہ میں ہزار مشکلات کی دیواریں کھڑی ہیں، مصائب اور مشکلات کے سات سمندر پار کرنا بھی ہے۔

بہر کیف شاید مولانا کو پوری امید تھی کہ اس زمانے کے مہتمم حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب کے زیر اثر جامعہ اسلامیہ عالیہ کے ارباب بست کشاد کی جانب سے آپ کا بھرپور استقبال کیا جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوسکا، آپ نے بھی اس استقبال کا انتظار کیا، لیکن بے سود۔ تاہم اس انتظار کے دوران آپ کو علاقے کے بعض نامور مدارس کی جانب سے دعوت دی گئی تھی کہ آپ آئیں اور اپنی شخصیت سے رونق بخشیں، لیکن آپ نے قبول نہیں کی۔ اسی طرح علاقے کے بعض علماء، دانشوران اور خیر اندیشوں نے

گزارش کی تھی کہ آپ اپنے انداز کے ایک مدرسہ یا مکتب فکر کی بنیاد رکھیں، مگر آپ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے، آپ نہیں چاہتے تھے کہ ایک علیحدہ مدرسہ یا مکتب فکر کی بنیاد رکھ کر رسہ کشیوں کا دور دورہ شروع کردیں، جو عام حالات میں یہاں کی روایات ہیں، جو آپ کے افکار اور نظریات کی منافی ہیں۔

آخر کار چند مہینے گزرتے نہ گزرتے مولانا کو اپنے وطن کے ماحول اور فضاء سے ایک حد تک مایوسی اور نا امیدی کا احساس ہوگیا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے ناقص خیال میں جو بھی ہوا تھا وہ آپ کے لئے بہت ہی اچھا ہوا تھا، کیوں کہ آپ جس بلند خیال اور عالی پروگرام کے حامل ہیں اگر آپ جامعہ اسلامیہ عالیہ میں براجمان ہو بھی جاتے تو شاید آپ کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو پاتا، کیوں کہ وطن کی فضاء جس قدر مسموم ہوچکی تھی، اور بعد میں اس میں مزید جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کے تناظر میں یہ تحقق ہوا کہ وطن کی فضاء اور ماحول آپ کے لئے کبھی بھی سازگار نہیں ہوسکتا تھا۔

ظاہر ہے کہ مولانا ایک بلند وبرتر خیال کے آزاد طبع انسان ہیں، غلامی کی زندگی آپ کو کبھی قبول نہیں، ساتھ ساتھ ایک عظیم مبصر ہونے کے علاوہ ایک حریت پسند عالم دین بھی ہیں، اگر آپ اپنے وطن کو مزید سینے سے لگائے رکھنے کوشش کرتے تو خاکم بدہن وطن کی سرزمین میں ایک دوسرے حضرت مولانا دین محمد شہید فرنگی کی شہادت کا واقعہ پیش آسکتا تھا۔

ان تمام حقائق اور واقعات کو سامنے رکھ کر مولانا کے ذہن رسا نے اس بات کا فیصلہ کرلیا تھا کہ وطن کے لئے جو کرنا ہے وہ ضرور کرنا ہے، جس کے لئے وطن کی زمین بالکل سازگار نہیں ہے، اگر کچھ کرنا ہے تو دوبارہ ترک وطن کر کے بنگلا دیش جانا ضرور ہے، وہاں جا کر پروگرام کے مطابق کام کو آگے بڑھانا ہے، بہر کیف ایک قافلۂ سخت جان کی تیاری کی کوشش کرنی ہے، اس لئے آپ نے دوبارہ ترک وطن کی زحمت گوارہ کی، یوں دوبارہ بنگلا دیش چلے آئے۔

مولانا کے ساتھ ایک مختصر سفر:

مولانا حسین احمد کے ساتھ میری مذکورہ اس فکری وذہنی ہم آہنگی کے دوران آپ کے ساتھ مجھے ایک مختصر سا مگر مفید سفر کا موقع ملا تھا، ایک روز کا واقعہ تھا کہ آپ نے مجھے ساتھ لے کر قصبۂ فوئمالی کا دورہ

کیا، جہاں آپ نے وہاں کے معروف عالم دین حضرت مولانا عبدالاول صاحب مدیر جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم فوئمالی (۱) کے علاوہ دیگر چند نامور علمائے دین سے ملاقات کی، مولانا عبدالاول صاحب نے آپ کا شاندار طریقہ سے استقبال کیا، علاقہ کے بڑے بڑے علمائے کرام کی شمولیت میں اپنے گھر میں کھانے کی دعوت کی، اور بڑے سلیقے سے انتظام کیا، علماء سے بھری مجلس میں مولانا حسین احمد صاحب نے بعض ضروری قومی وملی امور پر مذاکرات کئے، اورآپ نے اپنے خیالات وافکار سے ان کو مطلع کیا، اس سفر میں آپ نے حضرت علامہ سلطان احمد صاحب کی زندگی کے حوالے سے طول طویل گفتگو کی، اور حضرات علمائے کرام سے ان کے حالات اور دل چسپ واقعات سنے، آخر میں مولانا عبدالاول صاحب کے سر یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ حضرت علامۂ زمان مولانا سلطان احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر قلم اٹھا کر دنیا کے سامنے پیش کریں۔

---

(۱) جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم دھودائنگ فوئمالی جو علاقۂ بوسیدنگ کی ایک مشہور ومعروف دینی وعلمی درس گاہ ہے، جہاں مشہور ومعروف عالم دین، مفسر ومحدث فقیہ زمان حضرت علامہ سلطان احمد فوئمالوی رحمۃ اللہ علیہ درس دیا کرتے تھے، تقریبا ۱۹۸۰ء سے پہلے بمقام جبار فارہ فوئمالی میں جامعہ اسلامیہ کے نام پر اور دھودائنگ فارہ فوئمالی میں مدرسہ مدینۃ العلوم کے نام پر دو الگ الگ درس گاہیں تھیں، دونوں کے درمیان خاصی رسہ کشی اور شدید اختلاف پایا جاتا تھا۔ اللہ تعالی حضرت مولانا محمد ادریس صاحب نور اللہ مرقدہ سعد اللہ سری کی قبر پر بارانِ رحمت برسائے کہ حضرت کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں دونوں درس گاہیں ایک ہوگئیں، اور دونوں کے سنگم کو جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم دھودائنگ دیا گیا۔ اس انظمام کے بعد یہ ادارہ علاقے بھر میں تعلیم وتدریس کے اعتبار سے مشہور ہوگیا تھا، ہم اپنے تعلیمی زمانے میں اس کی شہرت سن کر چاہتے تھے کہ وہاں جاکر بطور خاص حضرت مولانا سلطان احمد صاحب سے استفادہ کریں، لیکن بعد میں یاد نہیں ہے کہ کیوں اس استفادے کا موقع نہیں ہوا تھا؟ جس کا افسوس زندگی بھر رہا۔

جس زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب وہاں گئے تھے، اس سے چند سال پہلے حضرت علامہ سلطان احمد صاحب انتقال کر چکے تھے، حضرت مولانا عبدالاول صاحب کے علاوہ دیگر علمائے کرام سے مولانا نے قومی وملی امور پر کافی تبادلۂ خیالات کیا، اور دورہ بار آور ثابت ہوا، مولانا عبد الاول صاحب نے مولانا حسین احمد صاحب کا پرتپاک استقبال کیا، اور اپنے گھر میں کھانے کی دعوت کی، جس میں بڑے بڑے علماء شریک ہوئے، اللہ تعالی مولانا عبدالاول صاحب کی حیات میں برکت دے، آمین۔

جلسۂ عام میں مولانا کا ایک کامیاب خطاب:

غالبا ۱۹۸۴ء کے آخری مہینوں میں ہماری بستی بانگونہ کے مدرسے کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، جس میں اطراف کے عوام کے علاوہ کثیر تعداد میں علمائے کرام اور بزرگان دین حاضر تھے، جس میں مولانا حافظ محمد طیب صاحب چاؤ فرانگی (مجاز بیعت حضرت مولانا شاہ عبداللطیف صاحب کچھر بیلوی) بحیثیت خطیب تشریف فرما تھے، مولانا حسین احمد صاحب کو بھی اس میں مدعو کیا گیا تو آپ نے بھی تشریف لانے کی زحمت اٹھائی تھی۔

مولانا حسین احمد جس وقت جلسہ گاہ تشریف لائے اس وقت حافظ محمد طیب صاحب خطاب کر رہے تھے، اور { و ننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمومنين ولايزيد الظالمين الا خسارا } کی تفسیر وتشریح فرما رہے تھے، تو ابھی مولانا کی تشریف آوری ہوئی تو حافظ صاحب نے اپنی تقریر مختصر کر لی اور اسٹیج سے اتر کر قریب کی جامع مسجد میں پناہ لی تھی۔

اب منتظمین جلسہ نے مولانا سے گزارش کی کہ آپ اسٹیج پر تشریف لا کر اظہار خیال فرمائیں! تو آپ نے گزارش قبول کی اور بڑے دل نشین انداز میں خطاب فرمایا، دوران خطاب آپ نے آیتِ بالا کی تشرح وتفسیر اس انداز میں بیان فرمائی کہ حافظ صاحب کی تردید بھی ہوگئی اور آیت بالا کا مطلب ومفہوم بھی کھل کر سامنے آگیا۔

جلسۂ عام میں مولانا کا یہی بیان راقم کے لئے پہلا اور آج تک کا آخری بیان ثابت ہوا، آپ تو عام طور پر ایک منجھے ہوئے خطیب مشہور ہیں، سعودی عرب میں آپ نے دینی، دعوتی، علمی، فکری اور سیاسی کے علی الرغم مختلف موضوعات پر خطابات جلسۂ عام میں دے چکے ہیں، ۲۰۰۳ء کے بعد آپ نے بعض ضروری امور کے حوالے سے درجنوں جلسے منعقد کرا چکے ہیں، ان میں سے دو ایک جلسوں میں آپ نے مجھے بلایا بھی تھا، مگر افسوس ہے کہ حاضری ممکن نہیں ہوسکی تھی، تاہم ان جلسوں میں دیئے گئے بیانات کی چند کیسیٹ سننے کی توفیق ہوئی تھی، ان تمام چیزوں سے اندازہ ہوا ہے کہ آپ فی الحقیقت ایک عظیم اور کامیاب خطیب ہیں۔

جہاں تک پتہ چلا کہ مولانا طالب علمی کے زمانے سے عام جلسوں میں خطاب کرتے آرہے ہیں۔ اور

یہ ایک سچائیت پر مبنی بات ہے کہ آپ کے خطبے بڑے سلیقے کے ہوتے ہیں، دھواں دار ہونے کے ساتھ ساتھ گفتگو کافی مرتب ہوتی ہے، روانی اور تسلسل کے تہ بتہ وقت وقت پر طغیانی بھی ہوا کرتی ہے، آپ کے خطبے علمی مجالس میں ہوں یا عوامی جلسوں میں، آپ کی زبان شگفتہ اور صاف ستھری شستہ اور کسی قدر عام فہم بھی ہوتی ہے، آپ کے خطبے فکری ہوں یا سیاسی و ثقافتی آپ اپنی خداداد لیاقت و صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ان میں روحانی روشنی اور توانائی بھر دیتے ہیں۔

خطبے تو خطبے ہوتے ہیں، بسا اوقات مولانا کی عام گفتگو کے انداز بھی ایک طرح کا خطیبانہ ہوتا ہے، آپ کے اسی خطابانہ جوش و ولولہ سے آپ کے بعض معاصرین کو یہ تأثر لیتے ہوئے دیکھا سنا کہ آپ ایک طرح کے جذباتی انسان ہیں، لیکن میرا خیال ان حضرات کے خیالات سے تھوڑا مختلف ہے، اگرچہ آپ کا طرز خطابت یا انداز گفتگو میں جذبات کا رنگ بھرا ہوا ہوتا ہے، لیکن عام خطیبوں اور مقرروں کے برعکس آپ کی گفتگو اور خطابات کے ہر سوتے حقیقت و واقعیت پر مبنی ہوتے اور جن میں علمی اور فکری رنگ ہمیشہ چھایا ہوا ہوتا ہے۔

نہ صرف جلسۂ عام کے خطابات و تقاریر بلکہ مولانا کی عام مجالس میں بارہا مشاہدہ کیا گیا کہ آپ اپنے زور خطابت سے کام لیتے ہوئے سامعین کے دلوں کو مسخر کرنے کے ماہر ہیں، آپ کی تقاریر سامعین کے دلوں میں جادو کا کام کر جاتی ہیں۔ تاہم جہاں آپ کی خطابت میں اتنی تاثیر کی بات ہے، وہاں اس بات کا جائزہ لینا بھی بہت ضروری ہے کہ آیا آپ اپنی خطابت سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟

اس سوال کے جواب کے بطور مجھے صرف اتنی سی بات عرض کرنی ہے کہ عام طور پر خطیبوں کی تاریخ اور سوانح میں دیکھا گیا ہے کہ جو خطیب کسی ناروا اغراض و مقاصد کے تحت اپنی جادو بیانی سے کام لیتا ہے وہ بسا اوقات منہ پھٹ، بے لگام اور غیر ذمہ دار ہوتا ہے، وہ حق و صداقت اور انصاف و عدالت سے آزاد ہو کر گفتگو کرتا ہے، وہ سننے والوں کو تو متأثر ضرور کرتا ہے لیکن اسے بات کا سچا اور کام کا معتدل اور منصف نہیں کہا جاتا ہے، اس قسم کے خطیب کی باتوں میں حکمت کے بجائے عوام فریبی ہوتی ہے، اس کی خطابت میں کسی مظبوط و منظم فکر کے بجائے تناقص اور ناہمواری ہوا کرتی ہے، ہر کہیں اعتدال کے بجائے بے اعتدالیوں کا سماں چھایا ہوا ہوتا ہے، وہ محض دنیا والوں کے سامنے اپنے سکے جمانے کے

لئے چرب زبانی سے کام لیتا ہے، اس کی خطابت کی تأثیر سے سننے والوں میں کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہوتی ہے نہ ان کی زندگیوں میں کوئی مفید تغیر رونما ہوتا ہے، اور نہ اس کی خطابت سے کوئی صالح فکر یا صالح عملی حالت پیدا ہوتی ہے۔

جب کہ مذکورہ قسم کے خطیبوں اور مقرروں کے برعکس داعیوں، مبلغوں، صحیح اور معتدل فکر و مزاج کے رہنماؤں کی خطابت میں حکمت و دانائی کے علی الرغم معتدل اور مناسب نظام فکر ہوتا ہے، انصاف و صداقت سمیت کامل درجہ کا التزام ہوتا ہے، اس کی ہر بات نپی تلی ہوتی ہے، ان کی خطابت میں مخلوق خدا کی رہنمائی اور اصلاح و رشد کے سوا کسی دوسرے مقاصد و اغراض کا شائبہ تک نہیں ہوتا ہے، ایسے لوگ جو بھی کہتے ہیں ان کی زندگی اس کے عملی نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی ذاتی، خاندانی اور فاسد عصبیات سے دور ہوتی ہے، تو ظاہر ہے کہ ان خطیبوں اور مقرروں کی خطابات اور تقریروں سے جو اثرات مرتب ہوں گے وہ بڑے عمیق، دوررس اور نتیجہ خیز ہوں گے۔

مذکورہ اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب کو جنہوں نے قریب سے دیکھا، اور ان سے سننے کا موقع ملا، آپ کی خطابت کے متعلق ان کی دو مختلف اور متضاد قسم کی آراء سامنے آئیں، بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ آپ کی خطابت اور خطیبانہ گفتگو اول الذکر خطیبوں کی خطابت اور گفتگو سے ملتی جلتی ہے، جب کہ بعض لوگ جن میں راقم سطور بھی ہے کی رائے یہی ہے کہ آپ کی خطابت اور خطیبانہ گفتگو ثانی الذکر خطیبوں اور مقرروں جیسی ہے۔

رہی بات کہ دنیا میں اکثر ہوتا بھی کچھ ایسا ہے کہ جس انسان کو میدان عمل و تطبیق سے زخم سے چور ہو کر واپس آنا پڑتا ہے، اس کی باتیں جتنی بھی معتدل، مناسب اور حقیقت پسندانہ کیوں نہ ہوں، دنیا اسے گلدستے نہیں پہنایا کرتی ہے، جب کہ اس کے برعکس وہ آدمی گلدستوں کا لائق ٹھہرتا ہے کہ جس کی باتیں اگرچہ ناہموار، اغراض و مفادات سے پر کیوں نہ ہوں لیکن وہ دنگل سے فاتح ہو کر واپس آتا ہو، تو مولانا کے لئے یہ نوبت کب اور کہاں آئی ہے؟

یہ نوبت کب اور کہاں آئی کی جلو میں ایک لمبی چوڑی داستان ہے، جس کی تفصیلات پر اس عجالے میں جانا نہیں چاہتا ہوں، خدا کرے اور زندگی نے وفا کی تو وہ دن بھی ضرور آئے گا کہ اس داستان

کی تفصیلات لکھنے میں مزہ آجائے۔

مذکورہ خطابت کے حوالے سے مزید کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ظاہر ہے کہ یہ مولانا کا دور شباب تھا۔خوب صورت چہرہ اوراس پر سیاہ داڑھی، جاذبِ نظر شخصیت کے مالک، قرآن وسنت کے ماہر، اور علوم دینیہ پر کافی عبور، خطابت کی ابتداء سے آخر تک ایک طرح کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ نپے تلے الفاظ نے سامعین کو محوحیرت میں ڈال دیا تھا، آپ نے اپنی اس تقریر کو قرآن کریم کی آیاتِ مبارکہ، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آثار صحابہ واقوال ائمہ کرام اور سلف صالحین کے احوال سے استشہاد کرتے ہوئے مدلل کیا تھا، اور جہاں تک دیکھا گیا کہ جو کچھ آپ فرمارہے تھے، سارے سامعین بڑی توجہ اورنہایت انہماک سے سن رہے تھے، غرض آپ کی اس تقریر سے لوگ بے حد متاثر ہوئے تھے، ساتھ ہی ساتھ جس طرح عرض کی گئی ہے کہ اس تقریر میں آپ کی جسمانی خوب صورتی اور بھری جوانی نے بھی اپنا جلوہ دکھایا تھا، اور سچی بات تو یہ ہے کہ خود میرے ذہن پر اس تقریر کا اس قدر اثر پڑا کہ آج تک وہ ختم ہونے کا نام تک نہیں لے رہا ہے۔خدا کرے کہ آخری دم تک رہ جائے۔

مولانا کا مع اہل وعیال ترک وطن:

۱۹۸۵ء کے ابتدائی مہینوں میں مولانا حسین احمد صاحب اپنی اہلیہ اوراکلوتہ بیٹا (اس زمانے تک) محمد انور کو وطن میں رکھ کر بنگلا دیش آئے، اور چاٹگام میں اپنے خیرخواہ اور شفیق استاد ومربی حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی سے ملاقات کی۔

حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب اسی زمانے میں جامعہ اسلامیہ ضمیریہ پٹیہ کو خیر باد کہہ کر ایک نئی درس گاہ کی سوچ رہے تھے، جو ماشاء اللہ آگے چل کر جامعہ دار المعارف الاسلامیہ چاٹگام کی شکل میں نہ صرف علاقۂ چاٹگام بلکہ پوری سرزمین بنگلا دیش کی دینی درس گاہوں کے مابین اس کی بعض الگ خصوصیات کی وجہ سے زینت بنی ہوئی ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب اپنے استاد ومربی حضرت ذوقؔ کی شفقت اوران کی ذات وصفات اورعلم و فضل سے بے حد متاثر تھے اور ہیں، اور میرے اندازے کے مطابق استاد اور شاگرد کے مابین فکر ونظر

کے حوالے سے اکثر امور میں کافی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے، ویسے مولانا اپنے استاد کی خواہش پر اس اگلی ہونے والی درس گاہ کی مدرسی قبول کرلی، اور وطن جاکر اپنی اہلیہ اور بچے کو لے آئے۔

اب کی بار بنگلا دیش آتے ہی آپ نے جامعہ اسلامیہ دارالسنہ کی اس تنگ کوٹھی میں پناہ لی جس میں آپ وہاں کے دوران تدریس لے چکی تھی، پھر اگلے دو ایک مہینے کے بعد چاٹگام منتقل ہوگئے اور بمقام خطیبر ہاٹ (بودار ہاٹ) کے ایک مختصر سے مکان میں رہائش پذیر ہوگئے، ساتھ ہی ساتھ دار المعارف کی مدرسی بھی شروع کردی، آپ اس مکان میں ایک سال گزار کر چاندگاؤں والے رہائشی علاقہ بلاک بی کے ایک خوب صورت مکان (عابدہ منزل) میں منتقل ہوگئے تھے۔

تبدیلئ مکان کے حوالے سے مولانا کی شان دلچسپی سے خالی نہیں ہے، آپ جس طرح وضع قطع اور لباس وپوشاک کے اعتبار سے حقیقی معنی میں ایک نستعلیقی کیفیت کے عالم ہیں، اسی طرح رہائش اور طرز زندگی کے اعتبار سے بھی بڑے اچھے ذوق رکھنے والے انسان ہیں، آپ کے انداز زندگی اور اطوار بود وماند سے ہر کسی کو یہ شبہ ہوتا اور ہوسکتا ہے کہ آپ ایک صاحب ثروت ودولت مند انسان ہیں، لیکن حقیقت میں بات ایسی نہ تھی اور نہ آج بھی ہے، اس حوالے سے گفتگو کی جائے گی تو بات خاصی طویل ہونے کا اندیشہ ہے، تاہم اس بارے میں طول طویل گفتگو سے صرف نظر سردست اتنی سی بات عرض ہے کہ ایک طرف مولانا طبعا اور فطرۃ نظافت پسند اور نستعلیقی کیفیت کے نکلے ہیں، تو دوسری طرف آپ کا کہنا ہے کہ ایک عالم دین کو ہر حالت میں علم دین کا رکھوالا ہونا ناگزیر ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک عالم دین کی چال چلن، رہن سہن اور طرز بود وماند کی وجہ سے علم دین کی عزت خاک میں مل کر علم وعلماء کی عزت وسطوت کا جنازہ نکل جائے۔

بہر حال چاٹگام میں آپ کی رہائش پذیری کے ساتھ ہی ساتھ دار المعارف میں مدرسی شروع ہوگئی، پھر اگلے چند مہینے گزرتے نہ گزرتے حضرت ذوق نے آپ کو حجاز مقدس بھیجا، جہاں آپ نے تقریبا ایک مہینے تک دار المعاف کی فلاح کے حوالے سے کام کیا اور کافی سرگرمی کے بعد واپس آگئے تھے۔

حجاز مقدس کے اس سفر سے واپسی کے بعد کچھ حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ مولانا کو اس مدرسہ کی مدرسی چھوڑنا پڑا، جس کی قدرے تفصیلات انشاء اللہ تعالی اگلی سطور میں آئیں گی۔

ارایس او کے صدر دفتر میں درس قرآن کریم:

۱۹۸۶ء کے آخری مہینوں تک روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) مولانا سیف الاسلام صاحب شرف الدین بیلوی کی زیر صدارت کسی قدر عروج وشہرت کی منازل طے کر رہی تھی، اس سے پہلے یہ تنظیم دو دھڑوں میں منقسم تھی، ایک کی قیادت محترم اڈووکٹ نورالاسلام صاحب شیل خالوی، جب کہ دوسرے کی رہنمائی ڈاکٹر محمد یونس باغگونوی منگڈوی کر رہے تھے۔ ۱۹۸۶ء کے ابتدائی مہینوں میں نورالاسلام والا دھڑا روہنگیا فدائین محاذ (RPF) سے مل کر ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) ہو چکا تو ڈاکٹر محمد یونس اور مولانا سیف الاسلام صاحب کی قیادت میں روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) نامی ہماری قومی سطح پر ایک ہی تنظیم رہ گئی تھی، جس میں محترم جناب ڈاکٹر محمد یونس باغگونوی صاحب (نائب صدر) اور پروفیسر محمد زکریا صاحب تنگ بازاری (جنرل سکریٹری) کے علاوہ اظہار میاں تنگ بازاری اور سعید الرحمن وغیرہ مجلس عاملہ کے اراکین تھے۔

روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی تاسیس دراصل ۱۹۸۲ء سے بھی پہلے ہوئی تھی، لیکن با ضابطہ طور پر اس کا اعلان اسی سال ہوا تھا، پھر اسی سال سے لے کر ۱۹۸۶ء تک اس میں کیا کچھ ہو گزرا ان تمام تفصیلات سے قطع نظر (ا) یہاں صرف اتنی سی بات عرض ہے کہ ۱۹۸۵ء یا اس سے بھی کچھ مدت پہلے یہ تنظیم جماعت اسلامی کے زیر اثر ہو چکی تھی، جس کا خوش گوار سلسلہ اگلے چند سالوں تک جوں کا توں بحال رہا تھا، اور جماعت اسلامی کے ساتھ اس تنظیم کے تعلق سے روہنگیا مظلوم مسلمانوں اور ان کی قومی تحریک کو فکری اور سیاسی نقطۂ نظر سے آیا فائدہ پہنچا یا نقصان یہ ایک الگ موضوع بحث ہے، یہاں اس عجالے میں اس بحث میں الجھنا مناسب نہیں۔ تاہم اس کی قدرے تفصیلات راقم کی بعض تحروں میں موجود ہیں، مزید باتیں خدا کرے تو کسی فرصت میں ہوں گی۔

بات یہ ہے کہ ۱۹۸۶ء کے دوران روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) جماعت اسلامی کی زیر سرپرستی نہ ہو تو کم سے کم زیر نگرانی آگے قدم بڑھا رہی تھی، اس تنظیم کے صدر دفتر سے لے کر متعلقہ تمام شاخوں بشمول معسکر میں جماعت اسلامی کے تعلیمی و تربیتی پروگرام چل رہے تھے، یوں اس کے صدر دفتر جو اس زمانے میں بمقام سراج منزل (بودار ہاٹ) میں قائم تھا، کم سے کم اسبوعی بعد الجمعہ ایک

درس قرآن کا سلسلہ جاری تھا، جس میں عبداللطیف نامی ایک مولوی صاحب (جو اسی زمانے میں چاٹگام کے کسی علاقے میں رہائش پذیر اور جماعت اسلامی سے کافی متأثر تھے، جن کی گفتگو اور طرز کلام پر بعض سامعین کے تحفظات تھے) کے علاوہ کبھی کبھار پروفیسر محمد زکریا صاحب درس دیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب دارالمعارف الاسلامیہ کے مدرس تھے، اب ڈاکٹر محمد یونس اور تنظیم کے صدر محترم مولانا سیف الاسلام صاحب کے علاوہ دیگر چند کارکنان (ا) تنظیم کی نظریں آپ پر پڑیں تو انہوں نے کوششیں شروع کر دیں کہ کسی بھی طریقے سے آپ کو اس اسبوعی درس کے لئے آمادہ کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو اس بہانے سے جماعت اسلامی کے زیر اثر چلنے والی روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) میں شمولیت پر رضامند کیا جائے۔

بہر حال مولانا اس درس قرآن کے لئے آمادہ ہو گئے، اور ہر جمعہ بعد العصر آپ سج دھج کے شیروانی میں ملبوس درس کے لئے جاتے تھے، میں اسی زمانے میں آپ کی زیر سرپرستی و زیر نگرانی دارالمعارف الاسلامیہ کا متعلم تھا، اور روز جمعہ میرے لئے گویا عید کا دن ہوتا تھا، میں بعد جمعہ ہی آپ کی رہائش گاہ پہنچ جاتا اور بعد العصر متصلا آپ ہی کے ساتھ درس گاہ یعنی تنظیم کے صدر دفتر جایا کرتا تھا۔

مولانا اس درس میں حالات کے تقاضے اور وقت کی نزاکت کے پیش نظر ایسی ایسی باتیں زیر بحث لاتے جو علمی، فکری، ثقافتی، تمدنی، دینی اور سیاسی لحاظ سے کافی مفید تھیں، اور انداز بحث وطرز گفتگو بھی بڑا انوکھا، نرالا اور دل و دماغ کو چھونے والا ہوا کرتا تھا، قرآن و سنت، تعامل صحابہ، احوال تابعین واتباع

(ا) جہاں تک میں جانتا ہوں کہ اسی زمانے میں محترم محمد اقبال صاحب باغگونوی مقیم حال ولایات متحدہ امریکہ، محمد طاہر صاحب باغگونوی (برادر خورد محترم ڈاکٹر محمد یونس صاحب) اور جناب محترم احسان اللہ فوئمالوی (مرحوم) اس کار خیر میں پیش پیش تھے، یہ سب حضرات اسی زمانے میں روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے سینئر کارکنان تھے، اور بعد میں اس سے علیحدہ بھی ہو گئے تھے، جو اسی دوران مولانا حسین احمد صاحب کے قریبی دوستوں اور چاہنے والوں میں ہو چکے تھے، شاید مولانا کو ان دوستوں اور چاہنے والوں نے یہاں اس درس قرآن کریم کے لئے آمادہ کیا ہو، ورنہ بعد کے حالات اور واقعات نے یہ ظاہر کر دیا کہ اس درس کے حوالے سے آپ بڑے مخمصے کے شکار تھے، پھر مولانا کی اس درس قرآن کریم کے لئے رضامندی اور آمادگی شاید اس جماعت میں ضروری اصلاح کی نیت سے بھی ہوئی ہو۔

تابعین اور سلف صالحین کے علمی، عملی، اخلاقی اور فکری گنجینوں سے ایسی ایسی مفید چیزیں حاضر کرتے تھے جو ہم اور پوری روہنگیا قوم کے لئے وقت اور حالات کے پیش نظر بڑی کارآمد اور نہایت ضروری تھیں، مجھے تو یوں لگتا تھا کہ آپ کی ہر بات دل سے نکل کر دلوں میں پیوست ہو جاتی تھی، ویسے ہی اس درس سے دوسروں کا کتنا فائدہ ہوا وہ یقینی طور پر میں نہیں کہہ سکتا، لیکن میں اپنے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سے میرے علم وآگہی اور فکر وبصیرت میں حد درجہ اضافہ ہوا۔

مولانا کا درس اگرچہ عالمانہ، فاضلانہ اور مفکرانہ ہوتا تھا، جس میں سیاست وقیادت اور اس کی ضروریات کے حوالے سے کافی بلند پروازی کے ساتھ گفتگو ہوتی تھی، اور سامعین میں سے ہر سطح کے لوگ میرے ناقص خیال میں اپنے اپنے ظرف کے مطابق مستفید ہو سکتے تھے، وہ اس لئے کہ آپ کا موضوع بحث جتنا بھی کٹھن، پرخار اور سنگلاخ کیوں نہ ہو، آپ اپنے مخصوص انداز میں مخاطب کو اپنی بات سمجھانے میں یکتائے روزگار ہیں، گفتگو کے آخر میں سوالات کا جو موقع دیا جاتا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کی گفتگو سے ہر سطح کے لوگ مستفید ہو سکتے تھے، سامعین میں ڈاکٹر محمد یونس، پروفیسر محمد زکریا جیسے دانشوران اور مولانا سیف الاسلام اور مولوی عبد اللطیف جیسے علماء کے علاوہ مدارس اسلامیہ اور اسکولوں کالجوں کے طلباء ہوتے تھے، ہر ایک آپ کو اپنے اپنے انداز میں داد تحسین دیا کرتے تھے۔

روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) مولانا سیف الاسلام اور ڈاکٹر محمد یونس کی زیر قیادت ہونے کے باوجود جماعت اسلامی کی زیر نگرانی اور زیر اثر تھی، تو ظاہر ہے کہ درس وتدریس اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے جماعت کا ایک مخصوص نصاب ہوتا ہے، جو حضرت مولانا سید ابو الاعلی صاحب مودودی رحمۃ اللہ علیہ اور جماعت اسلامی کے چند دیگر بڑے بڑے علمائے کرام کی لٹریچرز پر مشتمل ہے، تو ان لٹریچرز کو سامنے رکھ کر یہاں تعلیم وتربیت ہوا کرتی ہے، ویسے یہاں بھی چاہت اور مطالبہ ہوتا تھا کہ ان لٹریچروں کو سامنے رکھ کر درس دیا جائے، لیکن یہاں والوں کا یہی مطالبہ مولانا محترم کے آزاد خیالات اور آپ کی بلند پروازی کا سراسر برعکس تھا۔

حقیقت یہ کہ مولانا محترم جیسے ایک بلند پایہ کے عالم دین کے لئے مخصوص فکر وخیات میں ڈھلی ہوئی لٹریچرز کی تھوڑی ضرورت بھی نہیں تھی، آپ تو ظاہر ہیں کہ قرآن وسنت سے براہ راست مستفید ہو کر

اخذ نتائج پر قادر ایک مستعد انسان ہیں، آپ معری قرآن کریم کو سامنے رکھ کر اپنے مطالعہ اور اخذ نتائج کے زیر سائے خطاب کیا کرتے تھے، جس پر بعض منجمد قسم کے لوگ اپنی خفگی کا کبھی برملا اور کبھی دبے ہوئے الفاظ میں اظہار کیا کرتے تھے، جس سے اور تو اور مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔

مولانا ہمارے اکابر میں سے بڑے بڑوں کی طرح مجدد ملت حضرت شاہ ولی اللہی مکتب فکر کے ایک خوشہ چین عالم دین ہیں، امت کے متقدمین ومتأخرین کے علوم ومعارف کے گنجینوں سے مستفید بھی، تو آپ نے ان علوم ومعارف سے یہاں گل کھلائے ضرور تھے، لیکن افسوس ہے کہ یہاں کے بعض کوتاہ نظر اور تنگ ظرف افراد ایک مخصوص حلقہ کے نظریات وافکار میں پوری طرح محبوس ہو کر اپنے آپ کو پابہ زنجیر کرنے پر تلے ہوئے تھے، ویسے دوران درس بسا اوقات مشاہدہ کیا گیا تھا کہ ان حضرات کی اس ذہنی پابہ زنجیری اور فکری غلامی کی وجہ سے خود مولانا محترم کی وسعت خیالی اور بلند پروازی کا خاصا نقصان ہوا تھا، جن کی وجہ سے میں بھی ایک حد تک پریشانی کا شکار ہو گیا تھا۔

مولانا محترم علمائے متقدمین ومتأخرین پر اپنے انداز میں رائے رکھنے والا انسان ہیں، آپ جس پر جو رائے رکھتے ہیں خود ان تمام آراء کی صحت اور عدم صحت پر گفتگو کرنے کی گنجائش ضرور ہے، تاہم ایک منجھے ہوئے عالم اس بات کے حق دار ہیں کہ وہ اپنے مطالعے کی بنیاد پر کسی عالم پر رائے رکھیں اور اس کا اظہار بھی کر دیں، ویسے آپ حضرت مولانا سید ابو الاعلی صاحب مودودیؒ پر بھی رائے رکھتے ہیں، اور عالمانہ ومبصرانہ انداز میں اظہار بھی کرتے ہیں۔

مولانا محترم کو حضرت مولانا سید ابو الاعلی مودودیؒ کی لٹریچرز پر ماشاء اللہ کافی عبور حاصل ہے، اسی طرح حضرت سید مودودی کے موافقین ومخالفین کی لٹریچروں پر خاصی نظر بھی، یوں آپ حضرت سید مودودی کے تفردات کے علاوہ ان کی بعض علمی وفکری چیزوں پر بڑے محتاط اور سلجھے ہوئے طریقے سے تنقید، تبصرہ اور گرفت کرتے ہیں (میرے ناقص خیال میں آپ کی گرفت اور تنقیدی نقطہ نظر بسا اوقات صحت پر بھی مبنی ہوتا ہے) لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مولانا محترم حضرت مولانا مودودیؒ کو گئی گزری صدی کے ایک عظیم المرتبت انسان مانتے اور ان کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں، اور امت مسلمہ کے بڑے بڑوں کی شخصیت اور کارناموں کی طرح ان کی ذات وشخصیت کے

ساتھ ان کے بعض کارناموں، کتابوں اور لٹریچروں کو امت کے لئے مفید سمجھتے ہیں، غرض آپ حضرت مولانا مودودی کے متعلق جو بھی باتیں کرتے ہیں ان سے ایسا لگتا ہے کہ آپ حضرت سید مودودیؒ کے نقطہائے بحث کی گہرائیوں میں پورے پورے اتر چکے اور ان کی مراد کو پا چکے ہیں۔

اس عنوان کے آخر میں یہ ایک بات بھی عرض کردوں کہ حضرت مولانا سید ابو الاعلی صاحب مودودیؒ نے اسلامی ریاست کے حوالے سے جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے، اور جو اسلامی ریاست ہی کو اسلام بنا ڈالا ہے، اس کے متعلق شاید مولانا حسین احمد صاحب کا بھی وہی نقطۂ نظر ہو، جسے بعض حضرات کے خیال میں اس سے پہلے ہیگل نے پیش کیا تھا۔ یعنی کلی ریاست کا تصور۔ ان حضرات کی نظر میں حضرت مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ نے اسلامی ریاست کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ ہیگل کے نظریۂ کلی ریاست کا چربہ ہے، مزید برآں ان کے خیال میں سید مودودی نے بس اسے اسلام پر فٹ کیا ہے۔ یہاں اس ضمن میں ایک بات یاد رہے کہ حضرت مولانا سید ابوالاعلی صاحب مودودی کے اس نقطۂ نظر پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی عالمانہ و مفکرانہ اعتراض تھا۔ شاید مولانا حسین احمد صاحب حضرت ندویؒ کے نقطۂ نظر کے موافقین میں سے ہوں، واللہ اعلم۔

ارایس او والوں سے وابستگی اور علیحدگی کے بعض اسباب:

میرے علم کے مطابق مولانا حسین احمد صاحب فراغتِ تعلیم کے معا بعد اس سوچ وفکر میں تھے کہ سرزمین ارکان اور وہاں کے مظلوم و کس مپرس مسلمانوں کی نجات اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے ایک بامعنی جماعت ناگزیر ہے، اور ان کی نظر میں یہ بامعنی کی جماعت اس وقت وجود میں آسکتی ہے جب اس کی افرادی قوت کی ایک منفرد انداز میں تعلیم و تربیت ہو، یوں آپ اس سوچ وفکر کو ذہن میں رکھ کر اندرون وطن بھی گئے تھے، جس کا تذکرہ پچھلی سطور میں گزر چکا ہے، پھر یہاں بنگلا دیش آکر آپ نے حضرت ذوقؔ ندوی سے اپنے آپ کو اس لئے پیوستہ کیا تھا کہ شاید حضرت ذوق کے زیر سائے کسی حد تک ہی سہی آپ اپنی مراد کو پالیں گے، مگر چند مہینے جاتے نہ جاتے آپ کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں کے ان حالات میں آپ اپنے مقصد میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

ایسے حالات میں یہاں مولانا سیف الاسلام صاحب شرف الدین بیلوی کی زیر صدارت روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کسی حد تک ابھر کر سامنے آئی، پھر آپ کو اس تنظیم کی جانب سے دعوت درس قرآن حکیم ملی تو آپ وہاں درس دینے پر آمادہ ہوئے تھے۔

مولانا جیسے ایک خاذق و حاضر دماغ انسان کو یہ ضرور علم تھا کہ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کس فکری سانچے میں ڈھل کر ابھر رہی اور یہ کس فکری و سیاسی نہج سے ارکان کے حوالے سے کام کرنا چاہتی تھی، بایں ہمہ آپ کو اللہ تعالی پر مکمل بھروسہ اور اپنی ذات پر کامل اعتماد تھا کہ اس تنظیم کے صدر دفتر میں درس قرآن کے ذریعے اس تنظیم کے کارکنوں کو عموما اور اس کے ارباب بست و کشاد کو خصوصا اس فکر و عمل کی طرف لے جاسکیں گے جو قرآن وسنت کے ساتھ زمینی حقائق کے پیش نظر وطن عزیز ارکان اور وہاں کے علماء وصلحاء کا مطالبہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ درس قرآن سے وابستگی کے چند مہینے گزرتے نہ گزرتے آپ کو اس سے علیحدہ ہونا پڑا، جس کے چند اسباب یہ ہیں کہ:

ا۔ مولانا کا خیال تھا کہ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) ماضی میں ہزار باہمی اختلافات اور انتشار وافتراق کی پگڈنڈیوں سے گزر کر ایک خاص انداز فکر میں ہی سہی ایک تنظیمی ڈھانچہ بننے جارہی تھی، جس پر توقعات کا وابستہ رکھنا کسی کا کوئی قصور ہی ہو نہیں سکتا تھا، لیکن چند دنوں کے بعد آپ کو یقین ہو گیا تھا کہ مولانا آزاد کے بقول ''جو ملک تقسیم کی بنیاد پر بنا ہو وہ تقسیم در تقسیم ہوتا رہے گا'' تو یہاں بھی معاملہ اس قول کے برعکس نہیں تھا کہ ''جو تنظیم انتشار خیالی و عملی کی بنیاد پر قائم ہوا ہو، اس میں آئے دن افراتفری، انتشار وافتراق کا دور دورہ ہی ہوتا رہے گا'' جی ہاں! اس تنظیم کا ماضی بھی افراتفری اور انتشار وافتراق سے عبارت تھا اور اس وقت تک (اور بعد میں بھی) اس کا حال بھی اس سے کوئی مختلف نہیں تھا، تو مولانا محترم کے ذہن رسا نے یہ حقیقت بہت قلیل مدت میں پالی تھی۔

۲۔ نظریاتی اختلافات کے علی الرغم (جس کی طرف جانا سردست مناسب نہیں) مولانا کو احساس ہو چکا تھا کہ اس تنظیم سے وابستہ رہ کر (اگر چہ درس کلام اللہ کی حد تک سہی) آپ اپنے سوچے سمجھے ہدف تک کبھی بھی نہیں پہنچ پائیں گے، اور تجربہ نے آگے چل کر ثابت بھی کر دیا تھا

کہ اس تنظیم کے متعلق جو جو خدشات آپ کو پہلے دن سے تھے وہ درحقیقت صحت پر مبنی تھے، یوں آپ نے اس کے ساتھ اور دیر کرنے کے بجائے اس سے کلی طور پر علیحدگی کو مناسب سمجھا، جس کے بعد آپ نے اپنے بعض دوستوں اور خیر اندیشوں کی شمولیت سے اپنے انداز کی ایک مستقل جماعت کی تشکیل کے لئے کوشش اور تگ ودو شروع کر دی تھی، جس کی قدرے تفصیلات انشاء اللہ اگلی سطور میں آئیں گی۔

مولانا حسین احمد صاحب ایک نئی جماعت کی فکر میں:

روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) سے کافی حد تک نا چاقی ہوگئی تو مولانا حسین احمد صاحب نے یہاں اپنا درس قرآن کا سلسلہ بند کر دیا، حتی کہ ان لوگوں سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی، اس صورت میں آپ کی جو قدر قلیل ہی سہی اس سے توقعات وابستہ تھیں وہ بالکل ختم ہوگئیں۔

اس تنظیم سے مکمل طور پر علیحدگی کے معا بعد آپ کو اپنے بعض دوستوں جن میں جناب محمد اقبال صاحب باغکونوی اور جناب محمد طاہر صاحب بن ماسٹر علی احمد صاحب باغکونوی کے علاوہ جناب احسان اللہ صاحب فوئمالوی پیش پیش تھے نے یہ مشورہ دیا تھا کہ کیوں نہ آپ ایک باضابطہ جماعت کی تشکیل کے لئے کوشش کیا کریں، ویسے آپ کو ان دوستوں کا یہ مشورہ پسند آیا تھا، یوں اس سلسلے کی ایک کوشش بھی کی گئی تھی، لیکن کچھ عرصہ گزرتے نا گزرتے آپ کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ جن دوستوں نے آپ کو یہ مشورہ دیا وہ بذات خود اس باب میں پتے کے نہیں ہیں، اس لئے آپ کی جدوجہد میں بروقت رنگ نہیں بھرا تھا، آپ کو اس دوران جہاں تک دیکھا گیا، کافی حد تک پریشان حال تھے، لیکن آپ اس کوشش میں مگن تھے کہ کسی بھی صورت میں ایک علیحدہ مگر بامعنی تنظیم کی بنیاد ڈالی جائے، جس کے لئے آپ نے سردھڑ کی بازیاں لگائی تھیں۔

اس سلسلے میں آپ نے ایک سے زیادہ مرتبہ حجاز مقدس کی زیارتیں کیں، جہاں آپ نے روہنگیا برادری کے بعض دل جلے اور ملت وقوم کے حوالے سے فکر مند حضرات کے علاوہ اپنے بعض احباب اور خیر اندیشوں سے ایک نئی تنظیم کے حوالے سے مذاکرات اور تبادلۂ خیالات کیا، جنہوں نے آپ کو کسی بھی حالت میں ایک نئی تنظیم کی تشکیل کا مشورہ دیا، اور عندیہ دیا تھا کہ وہ حضرات ہر حالت میں آپ کا بھر پور ساتھ دیں گے۔

محمد جعفر حبیب کی نماز جنازے میں شرکت:

۱۹۸۷ء میں ہمارے عظیم قومی قائدِ تحریک آزادی حضرت محمد جعفر حبیب (۱) کا اچانک چاٹگام میں انتقال ہوگیا تو مرحوم کی نماز جنازے میں محترم مولانا حسین احمد کی معیت میں میں نے بھی شرکت کی، ہم حضرت قائد کے جنازے کے ساتھ چاٹگام سے نائکان سری پہنچے، اور میت کی تدفین کے بعد غمگین سے غمگین ترین اور نہایت افسردہ خاطری کے ساتھ چاٹگام واپس لوٹے تھے۔

اس جنازے کے دوران مولانا نے حاضرین کے سامنے ایک زور دار خطاب کیا تھا، جس سے لوگ

---

(۱) دور آخر میں سرزمین ارکان کے عظیم مرد مجاہد حضرت محمد جعفر بن حبیب الزمان چوہدری بن ابوالخیر بن انور علی بن کرم علی بن محسن علی بن شاہ عبد اللطیف حجازی کی ولادت ۱۹۳۹ء میں بیولہ فارہ (کجافہ) علی چنگ، بوسیدنگ میں ہوئی، آپ نے اپنی آبائی بستی کے مکتب میں دینیات کی ابتدائی تعلیم پائی، ساتھ ہی ساتھ بستی کے پرائمری سرکاری اسکول سے تیسری جماعت کی تعلیم پا کر شقدار فارہ، منگڈو کے ہائی اسکول میں داخلہ لیا، جہاں سے ۱۹۵۲ء میں مٹرک کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد اعلی تعلیم کے حصول کے لئے بنگال کا سفر کیا، اور ڈھاکہ نٹرڈیم کالج سے ۱۹۵۹ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر کے برما کے دار الحکومت رنگون پہنچے، اور رنگون یونیورسیٹی سے ۱۹۶۲ء میں بی اے پھر ۱۹۶۴ء میں بی ایل کی ڈگریاں حاصل کیں، اس کے بعد:

۱۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک طالب علمی کے دوران یوتھ تحریک سے وابستہ رہے۔

۲۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک روہنگیا انڈی پیڈنٹ فورسس (RIF) کی روح رواں رہے۔

۳۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۳ء تک ارکان آزاد فوج (RNLP) میں نائب صدارت کے عہدے پر فائز رہے۔

۴۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۷ء تک روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کے عہدۂ صدارت پر فائز رہے۔

۵۔ ۱۹۸۷ء میں میڈیکل کالج ہسپتال چاٹگام، بنگلا دیش میں آپ کا غیر متوقع طور پر انتقال ہوگیا، اور سرحدی علاقہ نائکان سری میں آپ کی تدفین ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت محمد جعفر حبیب روہنگیا قوم کے ایک عظیم قومی ہیرو تھے، عرصۂ دراز تک روہنگیا انڈی پنڈنٹ فورس (RIF) کے علاوہ ارکان آزاد فوج (RNLP) کے نائبِ صدارت کے عہدے پر فائز رہے، آپ کے مبارک ہاتھوں سے ۱۹۷۳ء میں روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کی تاسیس کی شکل میں تحریک آزادئ ارکان کی تجدید واحیاء ہوئی۔ جس کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں تا حال باقی ہے، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر دے، اور بال بال مغفرت فرمائے، آمین۔

بڑے محظوظ ہوئے، اس خطاب میں آپ نے روہنگیا قوم کے اس وقت کے حالات پر عموماً اور قائد مرحوم کی زندگی اور ان کی خدمات وکارناموں پر خصوصاً بڑی دردمندی کے ساتھ اظہار خیال کیا تھا، ویسے بھی آپ ہماری برادری میں ایک مستعد عالم کی حیثیت سے جانے مانے ہونے کے ساتھ قوم کے فکری، سیاسی اور انقلابی حلقوں میں مشہور بھی، تو اس جنازے کے دوران روہنگیا قوم کے وہ سیاست دان جو اسی زمانے میں کسی سیاسی وانقلابی جماعتوں کے ساتھ وابستہ نہ تھے، ان کی خاص نظریں آپ پر لگیں، جن میں الحاج سلیم احمد بن نور الزمان خیر فاروی اور مولانا محمد کبیر بن حضرت مولانا راغب اللہ صاحب خواندنگی پیش پیش تھے، انہوں نے آپ کو ایک مجلس میں دعوت دی اور حالات حاضرہ پر طویل گفت وشنید کے بعد یہ بات طے پائی کہ اس وقت سرزمین ارکان اور وہاں کے مظلوم مسلمانوں کی نجات کے لئے ایک سیاسی وانقلابی پارٹی کی تشکیل ناگزیر ہے، چناں چہ اگلے چند جلسوں کے اندر ''روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن'' (RLO) کی بنیاد پڑ گئی، یوں یہاں سے آپ کے باضابطہ سیاسی وانقلابی سفر کا آغاز ہوگیا، اور درج ذیل حضرات پر مشتمل ایک مجلس عاملہ کی تشکیل عمل میں آگئی تھی:

۱۔ صدر: الحاج سلیم احمد صاحب خیر فاوی۔
۲۔ سکریٹری جنرل: الحاج مولانا محمد کبیر صاحب خواندنگی۔
۳۔ رکن مجلس عاملہ: الحاج انعام اللہ صاحب کیلادنگی۔
۴۔ رکن مجلس عاملہ: الحاج مولانا حسین احمد صاحب لمبابیلی۔
۵۔ رکن مجلس عاملہ: جناب محمد اسلام صاحب اکیابی۔

ان مذکورہ جلسوں میں شاید دیگر حضرات بھی شریک رہے ہوں گے، لیکن مذکورہ ان حضرات کے علاوہ کسی دوسرے کے متعلق معلومات فراہم نہیں ہوسکیں۔

ہندوستان کا سفر:

سن ۱۹۸۸ء میں ''روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن'' (RLO) کا باضابطہ اعلان ہو چکا تو ہر کجا اس کی صدائے بازگشت سنی جارہی تھی، روہنگیا برادری کے سیاسی حلقوں میں چہ میگوئیاں بھی شروع ہو چکی تھیں، کہیں سے اس کے حق میں آوازیں آرہیں تو کہیں سے اس کی مخالفت کی صدائیں بھی بلند ہورہی

تھیں، غرض ہر کجا ہلچل کا سماں نظر آرہا تھا۔

ایسے حالات میں یہاں ایک بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ کہ مولانا حسین احمد صاحب نے ارایل او کے دوران تاسیس لیڈروں کے سامنے ایک شرط رکھی تھی، جسے خود آپ کی زبانی سماعت فرمائیں:

''روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے دوران تاسیس میں نے متعلقہ لیڈروں کے سامنے ایک شرط رکھی تھی کہ میں اس نئی تنظیم میں باضابطہ طور پر شریکِ سفر ہونے اور اس قافلہ کے ساتھ سرگرم عمل ہونے سے پہلے ہندوستان کا سفر کروں گا، اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، انڈیا جاکر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ملاقات کے بعد آپ کے سامنے سرزمین ارکان کے حالات رکھوں گا، اور آپ سے جو اشارہ ملے گا اس پر عمل پیرا ہوں گا، ویسے بھی حضرت مولانا جیسی شخصیت سے میری امید ہے کہ آپ ہمارے حالات سے بخوبی واقف ہیں، ایسے حالات میں آپ ضرور ہماری رہنمائی فرمائیں گے''۔

بہر حال مولانا نے ہندوستان کے سفر کے لئے ضروری تیاری مکمل کرلی، اور آپ کے استاد ومربی حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی (۱) سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام ایک سفارش نامہ حاصل کیا، اور اپنی طرف سے حضرت مولانا ندوی کے نام ایک یادداشت لکھی، جس میں ارکان کے اس وقت کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، فکری اور ثقافتی حالات کو کھل کر بیان کیا گیا تھا۔

---

(۱) حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی دامت برکاتہم کی پیدائش جزیرۂ مہیش خالی، کوکس بازار میں ہوئی، میرے علم کے مطابق تقریباً چھ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ ارکان گئے، اور وہاں کے موجودہ دار الحکومت اکیاب میں مقیم رہے، بعد میں یہاں سے دوبارہ اپنے وطن واپس آئے۔ آپ نے جامعہ اسلامیہ پٹیہ سے سند فراغت حاصل کی، اور بعد میں اسی جامعہ کے عرصۂ دراز تک مدرس رہے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایماء پر جامعہ دار المعارف کے نام سے چاٹگام میں ایک قابل قدر ادارہ کی بنیاد رکھی، تادم تحریر آپ اس کے مدیر ہیں، آپ حضرت مولانا ندوی سے خاصے مستفید ہیں، اور بہت ساری قابل قدر کتابوں کے مصنف بھی، اور حال ہی میں آپ نے اپنی آپ بیتی ''نقوش زندگی'' شائع کی ہے، اللہ تعالی آپ کی زندگی میں برکت دے، آمین یارب العالمین۔

بہر حال ضروری تیاری کے بعد آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء پہنچے، جہاں ایک روایت کے مطابق آپ نے گیارہ روز قیام فرمایا، یہاں آپ کی سرگرمی کے حوالے سے خود آپ ہی کی زبانی کچھ باتیں حاضر خدمت ہیں:

۱۔ چوں کہ میں ایک پوری قوم کی جانب سے ایک تنظیم کا نمائندہ بن کر ندوے پہنچا تو میری خاص پذیرائی ہوئی تھی، مجھے ندوے میں قیام کے لئے جو جگہ ملی تھی وہ خاصی شاندار تھی، مولوی محمد امین ندوی نلبنوی جو اس زمانے میں ندوے کا طالب علم تھا، اس کا کہنا تھا کہ ''مولانا! آپ کو قیام کے لئے جو کمرہ ملا ہے وہ ایک عام کمرہ نہیں ہے، بلکہ یہ اس شان کا کمرہ ہے کہ جس میں ملکوں کے وزراء اور دیگر بڑی بڑی شخصیات کو ٹھہرایا جاتا ہے'' یاد رہے کہ اس زمانے میں مولانا عبدالعزیز صاحب بھٹکلی مہمان خانے کا منتظم تھے، انہوں نے مجھے بڑی شان سے ٹھہرایا، اور خدمت گزاری میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی تھی، اللہ تعالی ان کو جزائے خیر دے۔

۲۔ ندوے میں دوران قیام دونوں اوقات کے کھانے حضرت مولانا ندوی کے ساتھ حضرت کے دسترخوان میں کھانے کی سعادت نصیب ہوئی تھی، کھانے میں کافی لوگ حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت مولانا کے کھانے خود آپ کے ذاتی مصارف سے آیا کرتے تھے، لیکن آپ کھانے سارے مہمانوں کی معیت میں تناول فرمایا کرتے تھے، ہمیشہ کھانے میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور ان کے بھائی حضرت مولانا سید واضح حسنی ندوی تشریف فرما ہوتے تھے۔

۳۔ میرے دوران قیام روز بعد عصر حضرت مولانا ندوی کی رہائش گاہ کے آنگن (جو ندوے کی جامع مسجد کے بغل میں واقع ہے) میں عام زائرین سے ملاقات کے بطور حضرت جو تشریف فرما ہوتے تھے، اس میں مجھے روزانہ حاضری کی توفیق ہوئی تھی، جس میں علماء، طلباء کے علاوہ دور دراز سے آئے ہوئے مہمان اور آپ کے متعلقین کی بڑی تعداد ہوا کرتی تھی، لوگ آپ سے ملتے اور آپ کے ارشادات سنتے تھے، قبل المغرب تک یہ مجلس ختم ہوجاتی تھی۔

۴۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مجھے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی نے بلا کر حضرت مولانا ندوی سے آپ کے کمرۂ خاص میں اکیلے میں ملاقات کرایا، حضرت نے مجھ سے مخاطب ہو کر جو باتیں کیں، وہ

مجھے بہت کم یاد رہیں، کیوں کہ اس وقت میں خود کو ہی بھول چکا تھا، پھر حضرت مولانا کو اکیلے میں پا کر میرے دل کے دیرینہ جذبات کا جو طوفان امنڈ آیا تھا، اسے میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

۵۔ حضرت مولانا ندوی کے سامنے ایک یادداشت پیش کی گئی تھی، جس میں روہنگیا قوم کی حالت زار کے علاوہ کچھ اپنا ذاتی دکھڑا بھی درج کیا گیا تھا، اس کے بعد حضرت کے حکم سے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے میرے نام کی شمولیت کے ساتھ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے لئے ایک سفارش نامہ لکھا، جس میں حضرت مولانا ندوی کا دستخط ثبت تھا، اب گویا مجھے اجازت مل چکی کہ میں مؤخر الذکر تنظیم میں باضابطہ طور پر شامل ہو کر سرگرم عمل ہوجاؤں، ویسے میں اس سفر سے واپسی کے بعد اس تنظیم (RLO) میں باضابطہ طور پر شامل ہو گیا تھا۔

۶۔ اس زمانے میں حضرت مولانا ندوی کی گرانمایہ اور معرکۃ الآراء تصنیف ''المرتضیٰ'' چھپ کر منظر عام پر آ چکی تھی، اس کے چند نسخے جو خاص خاص شخصیات کو ہدیہ میں دینے کے لئے حضرت کے سامنے حاضر کئے جا چکے تھے، ان میں سے ایک نسخہ حضرت نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ''کلمۂ ہدیہ'' لکھ کر مجھے بھی عنایت فرمایا، یوں حضرت کے مبارک ہاتھوں سے اس ناچیز کا نام لکھا جانا، یہ میری زندگی کے لئے ایک بڑی سعادت کی چیز ہے۔

۷۔ میرے ندوے میں قیام کے دوران حضرت مولانا ندوی کی مشارکت (بلکہ آپ کی زیر صدارت) مسلم انٹلکچویل فورم کے زیر اہتمام ایک اجلاس گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، جس میں مجھے بھی دعوت شرکت ملی تھی، حاضری پر دیکھا کہ اس اجلاس میں ملک بھر کے بڑے بڑے علماء، دانشوران، سیاسی وفکری قائدین اور ثقافتی وسماجی عمائدین کے علاوہ چند وزراء بھی حاضر تھے۔ اس اجلاس میں شرکت کے بعد ندوے کے چند اساتذۂ کرام جن میں حضرت مولانا نذر الحفیظ ازہری ندوی صاحب ناقابل فراموش ہیں نے مجھ سے یہاں تک بتایا تھا کہ ''حسین احمد صاحب! آپ بڑے سعادت مند ہیں، کہ ادھر آپ کی تشریف آوری ہوئی تو ادھر لکھنؤ کی سرزمین میں حضرت مولانا ندوی کی مشارکت میں ملک کا اتنا بڑا اجلاس منعقد ہوا ہے''۔

تنظیم کی طرف سے سعودی عرب کا دورہ:

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دورہ سے واپسی پر مولانا حسین احمد صاحب کو فکری اور سیاسی حوالے سے کافی مطمئن دیکھا گیا تھا، اب آپ جان ودل سے روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی ترقی اور بہبودی کے کام میں مصروف ہو گئے تھے، اس تنظیم میں آپ کی دیگر سرگرمیوں کی تفصیلات سے قطع نظر اس تنظیم کے ارباب حل وعقد کی چاہت وخواہش پر آپ نے سعودی عرب کا دورہ کیا، جہاں ایک طرف ہماری برادری کے بعض اہل فکر کے علاوہ وہاں کے بعض فکری حلقوں سے ملاقاتیں کیں، اور اس نئی ابھرنے والی تنظیم کے متعلق ان کو مطلع وآگاہ کیا، تو دوسری طرف تنظیم کی معاشی حالت کو درست کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی بھی لگائی گئی تھی۔

مولانا نے اس دورے کے دوران روز نامہ ''عکاظ'' میں ایک تفصیلی انٹرویو دیا، انٹرویو لینے والا کوئیدرویش نامی صحافی تھا، آپ نے اس میں تنظیم کی بعض سرگرمیوں کے ساتھ سرزمین ارکان کی حالت زار کے علاوہ دیگر ضروری موضوعات پر کھل کر تفصیلی گفتگو کی۔

مولانا کے بیان والا یہ پرچہ میری نظر سے گزرا، شاید یہ پرچہ اب بھی میرے ذاتی اثاثہ میں موجود ہو، جسے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا تھا کہ آپ اسی زمانے میں اپنی تنظیم کے حوالے سے بڑے مطمئن تھے، اور ساتھ ساتھ اس تنظیم کے زیر سائے روہنگیا قوم کے مسائل حل کرنے اور اس مظلوم قوم کو مگھ اور برمی مظالم سے نجات دلانے کے حوالے سے بھی بڑے پر امید تھے، لیکن افسوس ہے کہ بعض لوگوں کی نادانی اور غرور وپندار نے آپ کی اس امید پر پانی پھر دیا تھا، اور بات بھی یہی ہے کہ دنیا میں ہر امید پوری کب ہوتی ہے؟ دراصل آپ کی سرگرمیوں کے متعلق تاریخ کا یہ تجربہ ہمارے لئے ایک درس عبرت ہے، جس سے ہمیں فائدہ اٹھانا ضرور چاہئے۔

مولانا محترم نے سعودی عرب کے اس سے پہلے اور بعد میں بھی بہتوں مرتبہ سفر کئے تھے، لیکن اس

---

(۱) مذکورہ ان تمام پارٹیوں کے علاوہ دیگر متحرک اور غیر متحرک جماعتوں کی مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی تصنیف ''سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں'' کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن۔

دورے کے دوران آپ نے جو سیاسی سرگرمیاں دکھائی تھیں وہ بڑی قابل قدر تھیں، جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ آپ نے اس دورے کے دوران عکاظ کے علاوہ بھی دیگر اخبارات میں پریس بریفنگ دی تھی، جس میں آپ نے ارکان کے حالات پر کھل کر گفتگو کی۔ اور ساتھ ہی ساتھ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے اہداف ومقاصد اور پروگراموں کو واضح انداز میں بیان کیا، اور دنیا کو بتایا کہ ارکان اور وہاں کے مسلمانوں کے حالات کے پیش نظر روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کیا چاہتی ہے۔

مولانا کا یہ بیان سامنے آتے ہی سعودی عرب میں پائی جانے والی روہنگیا برادری کے بعض حلقوں کی جانب سے موافق ومخالف مختلف ردعمل سامنے آیا تھا، دوستوں نے اس بیان کا دل کھول کر خیر مقدم کیا، لیکن بعض نادان بلکہ سازش کے شکار لوگوں نے اور وہ بھی بعض حضرات کی ایماء پر اس کی کھل کر مخالفت کی، جس کا اجمال کچھ یہ ہے کہ:

۱۔ مولانا کے دیرینہ ساتھیوں، احباب ورفقائے کار کے علاوہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے حامیوں نے اس انٹرویو پر خوشی کا اظہار کیا، جن کا کہنا تھا کہ آپ کا انٹرویو زمینی حقائق اور واقعیت پر مبنی تھا، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اس انٹرویو کے بعد مولانا محترم کے بعض مخالفین اور بطور خاص اس وقت کی ہماری بعض متحرک جماعتوں کے اراکین وکارکنان (شاید ان جماعتوں کے لیڈروں کے شہ پر ہو) آپ کی مخالفت پر کھل کر سامنے آئے تھے، جن کا دعوی تھا کہ آپ کا انٹرویو اور اس میں روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی طرف سے کیا گیا دعوی زمینی حقائق اور واقعیت کا سراسر برعکس تھا، ویسے ان مخالفین نے آپ کے خلاف ہر کجا واویلا مچایا، حتی کہ سرزمین امن وسکون میں آپ کا جینا تک دوبھر کر دیا تھا، لیکن آپ بھی ہار ماننے والے کب تھے؟ آپ نے ان مخالفین کا ڈھٹ کر مقابلہ کیا، حتی کہ سنا تھا کہ ان مخالفین میں سے بہتوں نے بعد میں تائب ہو کر آپ سے معافی بھی مانگ لی تھی۔

آپ کے مذکورہ انٹرویو پر میرا اتنا کہنا ہے کہ اگرچہ اس پر مخالف وموافق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، اور ہر ایک کو کہنے کا حق بھی حاصل ہے، لیکن ارکان اور یہاں کے مسلمانوں کے حوالے سے جتنی بھی باتیں کہی گئی ہیں، وہ تب بھی سچائیت اور واقعیت پر مبنی تھیں، اور اب بھی یہ جوں کا توں باقی ہیں۔

ارایل او اور اسلامک فرنٹ کے مابین کشیدگی:

مولانا محترم کی سعودی عرب کے سفر سے واپسی کے بعد ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) اور روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے درمیان شدید سے شدید ترین کشیدگی شروع ہوگئی تھی، جس میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا تھا، اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ فرنٹ کے بیس سے زائد مجاہدین جن کے سرغنہ مسٹر رشید احمد (باموںگ) معروف بہ مایو رشید اور عبدالقیوم والیاس تھے، بیس سے زائد جدید ترین اسلحہ جات سمیت روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) میں شامل ہو گئے تھے، مسٹر نور الاسلام صاحب نے اپنے ان اسلحہ جات کی بازیابی کے لئے سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی، فرنٹ کی جانب سے روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) والوں کو دھمکیوں پر دھمکیاں دی جارہی تھیں، لیکن ارایل کی روح رواں مولانا محمد کبیر نے فرنٹ کے چیلنجز کو قبول کرتے ہوئے صاف جواب دیا تھا کہ کسی بھی قیمت میں فرنٹ کو اسلحہ جات واپس نہیں کئے جائیں گے۔ بہر حال ان مجاہدین کے فرنٹ سے بچھڑ جانے اور ارایل او میں شامل ہونے کے کچھ خلفیات بھی ہیں، جو یہ ہیں کہ:

> ’’۱۹۸۸ء کے دوران عین رمضان المبارک میں ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے کچھ مجاہدین نے جناب محترم نور الاسلام صاحب (اس وقت کے اسلامک فرنٹ کے صدر) کی لاعلمی میں اتحاد المجاہدین کے معسکر پر حملہ کر دیا تھا، اور اس کے تمام سروسامان اٹھا کر فرنٹ کے معسکر میں لے جائے گئے تھے، جس کی وجہ سے ہمارے سیاسی وانقلابی حلقوں میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا تھا، یہ واقعہ جب ہو رہا تھا اس وقت مسٹر نور الاسلام صاحب سعودی عرب کے دورے پر تھے، یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تو مسٹر نور الاسلام صاحب اپنے دورہ کو مختصر کر کے بنگلا دیش واپس آگئے، اس کے معا بعد اتحاد المجاہدین کے معسکر کی زیارت کی اور سارے سامان مع کچھ زائد معاوضے کے واپس کر دینے کے علاوہ کھلے الفاظ میں معافی بھی مانگی تھی، اس کے بعد مسٹر نور الاسلام صاحب نے اپنے شر پسند مجاہدین سے کہا کہ تم سب اپنے اپنے اخلاق کو سنوارنے کے لئے ایک ایک چلہ جماعت تبلیغ

> میں لگا کے آؤ، لیکن افسوس ہے کہ ان شر پسند عناصر پر اس حکم کا الٹا اثر ہو گیا تھا، اور بجائے اس کے وہ عناصر چلہ کو جا کر اپنے اپنے اخلاق کو سنوارتے بلکہ اندر ہی اندر میں خود فرنٹ اور اس کے قائد پر برہم ہو گئے تھے۔ آخر کار ان شر پسندوں نے خفیہ طور پر روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے بعض سرکردہ لیڈروں سے رابطہ کیا، اور بات خفیہ طور پر طے کر لی کہ یہ شر پسند لوگ فرنٹ سے فرار ہو کے ارایل او میں شامل ہو جائیں گے، چناں چہ بعد میں ہوا بھی ویسا۔ جس کی وجہ سے دونوں تنظیموں کے مابین ایک وقت تک شدید کشیدگی جاری تھی‘‘۔

بہر حال ان شر پسند عناصر کے فرنٹ سے بچھڑ کر روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) میں شمولیت کی وجہ سے دونوں جماعتوں کے مابین سخت کشمکش شروع ہو چکی تھی، حتی کہ ایک دور ایسا بھی آیا تھا کہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) جس کا معسکر ٹینگ خالی کے مقام پر تھا کو تشویش لاحق ہو چکی تھی کہ فرنٹ والے کہیں اس پر حملہ نہ کر دیں، کیوں کہ اسی زمانے میں فرنٹ والے آئے دن اس تیاری میں تھے کہ کسی بھی طریقے سے ارایل او کے معسکر پر حملہ کر کے اسلحہ جات کی بازیابی کو ممکن بنایا جا سکے، لیکن بالآخر ایسی نوبت نہیں آئی تھی، اس کے بعد روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) اور ان شر پسند عناصر اور ان اسلحہ جات کا کیا حشر ہوا، اس کی قدرے تفصیلات ان شاء اللہ تعالی اگلی سطور میں آرہی ہیں۔

اتحاد المجاہدین کے مجاہدین کی ارایل او میں شمولیت:

ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے مجاہدین کی روہنگیا لیبریش آرگنائزیشن (RLO) میں شمولیت کے بعد مؤخر الذکر تنظیم کی ہماری قومی سطح پر کافی شہرت ہو چکی تھی، فرنٹ اگر چہ اس کوشش میں تھی کہ کسی بھی طریقے سے اپنے اسلحہ جات بازیاب کرنے میں کامیاب ہو جائے، لیکن آخر تک اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہو سکا۔

ادھر ارایل او کے وہ مجاہدین جو فرنٹ سے بچھڑے ہوئے تھے، انہوں نے دوبارہ یہ کوشش شروع کر رکھی تھی کہ اتحاد المجاہدین کے وہ سامان جو نور الاسلام صاحب نے واپس کر دیا تھا، انہیں اتحاد والوں سے کسی بھی قیمت پر چھین لیا جائے، اس حوالے سے ہمارے ممدوح مولانا حسین احمد صاحب نے

بڑی کوشش کی تھی، آپ نے اتحاد والوں کے معسکر میں سے چند سرکردہ لوگوں کو اپنا لیا تھا، جن میں آپ کے پھوپی زاد بھائی مولوی محمد حسین ساؤ فرانگی (نائب کمانڈر) اور الحاج محمد قاسم صاحب علی تانجوی نا قابل فراموش ہیں۔ مولانا حسین احمد صاحب اتحاد المجاہدین کے مجاہدین اور سارے سروسامان کو استقبال کرنے کے لئے بذات خود چاٹگام سے اوکیہ اور کوٹ بازار ہوتے ہوئے شونا فارا پہنچے، اتحاد والوں سے یہ کہا گیا تھا کہ اگر اتحاد المجاہدین اور اراایل او پورے انضمام کی شکل میں ایک ہوجائے تو ایک بڑی تنظیم قومی سطح پر وجود میں آجائے گی، جس کی وجہ سے نہ صرف ہم سب کا بڑا فائدہ ہوگا بلکہ یہ قوم کے لئے ایک بڑی خوش آئند بات ہوگی، اب مولوی محمد حسین اور حاجی محمد قاسم کی کوشش سے اتحاد کے تقریبا سارے مجاہدین (جو اس وقت بڑے پریشانی کے عالم میں معسکر میں دن رات گزار رہے تھے) اتحاد کے معسکر کو چھوڑ چھاڑ کر روہنگیا لیبریشن آر گنائزیشن میں شمولیت کے لئے راضی ہوگئے، یوں اتحاد کے سارے مجاہدین (دو ایک جن میں مولوی محبت علی خیرمورہ فاروی اور مولوی حشمت اللہ کو چھوڑ کر) مولانا حسین احمد صاحب سے شونا فارا کو آملے تو آپ نے ان ساروں کو ٹنگ خالی کے مقام پر لے گیا اور دو ایک روز تک ان کو ار ایل او کے ساتھ رکھ کر آہستہ آہستہ سب کو فارغ کر دیا گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے مذکورہ مجاہدین کو روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) میں لانے میں جس طرح مولانا محمد کبیر صاحب (سکریٹری جنرل اراایل او) کی کوشش تھی، ٹھیک اسی طرح اتحاد المجاہدین کے مجاہدین کو اراایل او میں لانے میں مولانا حسین احمد صاحب کی بارآور کوششیں شامل حال تھیں، اس حوالے سے ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر اتحاد المجاہدین کے معسکر کے اندر آپ کے پھوپی زاد بھائی مولوی محمد حسین صاحب نہیں ہوتے، تو شاید مولانا کو اتنی بڑی کامیابی ملی بھی ہوتی، یعنی اتحاد کے مجاہدین کو بہلا پھسلانے میں آپ کے شہ پر مولوی محمد حسین صاحب نے بڑا کردار ادا کیا تھا۔

اتحاد المجاہدین والوں سے وعدہ تو بہت کچھ کیا گیا تھا، لیکن یہاں بعد میں اتحاد والوں کے بیان کے مطابق ایک بھی وعدہ پورا نہیں کیا گیا، ان میں سے ایک کا بیان یہاں ملاحظہ ہو کہ:

''اتحاد المجاہدین کے معسکر سے فرار ہونے سے بہتوں دن پہلے مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ ہماری بات طے ہوچکی تھی، ہمارے ساتھ بہت کچھ وعدہ بھی کیا گیا تھا، آپ ہمیں استقبال کرنے کے لئے چاٹگام سے اوکیہ اور کوٹ بازار ہوتے ہوئے شونا فارا کے مقام تک آئے، اور ہم سب کو لے کر ٹینگ خالی کے مقام پر لے گئے تھے، لیکن بڑے افسوس کا مقام تھا کہ ہمارے ساتھ جو جو وعدہ کیا گیا تھا اس کا ایک بھی پاس ولحاظ نہیں رکھا گیا، چند دن جاتے نہ جاتے اراایل او والے سارے وعدے سے یک سر مکھر گئے تھے، یعنی ہمیں ان کے ساتھ چند دن رکھ کر ہم سے سارے اسلحہ جات چھین لئے گئے اور ہمیں حکمت ومصلحت کا نام دے کر معسکر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فارغ کر دیا گیا تھا، ویسے ہم چند دن ادھر ادھر مارے مارے پھیرتے رہے، بعد میں ہمارا پرسان حال تک کوئی نہیں رہا''۔

اراایل او میں خلفشاریاں:

۱۹۸۸ء کے اواخر میں روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) ایک طرح کی داخلی خلفشاری کی شکار ہو چکی تھی، تنظیم کے صدر اگر چہ جناب سلیم احمد صاحب خیر فاروی تھے، لیکن مولانا محمد کبیر صاحب خواندگی تنظیم میں ہر ایک اعتبار سے اپنے آپ کو نمایاں دکھانے پر تلے ہوئے تھے، اب مولانا حسین احمد صاحب کا جہاں تک سوال ہے کہ آپ تنظیم کے اندر میری اطلاعات کے مطابق جمہوری روایات کو فروغ دینے کے قائل تھے، لیکن مولانا محمد کبیر صاحب کسی کی بھی سننے کو تیار نہیں تھے، یوں مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا محمد کبیر صاحب کے درمیان رسہ کشی اور تناؤ شروع ہوگیا تھا۔

ایک طرف روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) مالی اعتبار سے سخت ترین پریشانی کی شکار تھی، تو دوسری طرف اس کے نمایاں ترین لیڈروں کے مابین اقتدار کی رسہ کشی کا دور دورہ شروع ہو چکا تھا، پھر ایسے حالات پر مستزاد ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کی طرف سے اراایل او پر دباؤ پر دباؤ دیا جا رہا تھا کہ وہ اس کے اسلحہ جات فورا واپس کر دے، جس کا اجمالی تذکرہ اوپر گزر چکا ہے، یعنی فرنٹ والے ہمیشہ اس تاک میں تھے کہ کسی بھی طریقے سے وہ اپنے اسلحہ جات کی بازیابی کو یقینی بنا

سکے، کبھی دھمکیوں پر دھمکیاں دے رہے تھے اور کبھی کبھار گھیراؤ پر گھیراؤ بھی کیا جارہا تھا۔

ایسے حالات میں روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے نمایاں ترین لیڈروں کے مابین جس یک جہتی اور ہم آہنگی کی ضرورت تھی اس کے برعکس اس میں فکری، سیاسی، ذہنی، عملی، کرداری غرض ہر ایک اعتبار سے افراتفری، تناؤ بلکہ رسہ کشیاں شروع ہو چکی تھیں، بالآخر مولانا حسین احمد صاحب نے اپنوں کے مابین پائے جانے والے اختلافات کو مزید طول دینے کے بجائے ایک قسم کی علیحدگی یا گوشہ نشینی ہی کو اپنی ذات کے لئے عافیت اور اپنے سیاسی مستقبل لئے مناسب سمجھا تھا، یوں آپ جنگل میں چند دن گزار کر ہمیشہ یعنی آج تک کے لئے زخم سے چور ہو کر چاٹگام چلے آئے تھے، آپ کی دنگل سے واپسی کے بعد اس تنظیم کی عملی باگ ڈور مولانا محمد کبیر صاحب کے ہاتھ میں چلی گئی تھی، یوں مولانا محمد کبیر صاحب ہی یہاں سیاہ سفید کے مالک بن گئے تھے، جہاں تک صدر صاحب کا تعلق تھا کہ آپ نے ہر چند ان دونوں شخصیات کے مابین مفاہمت کی کوشش کی، لیکن ان کو ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا تھا۔

ایک دل شکن قومی حادثہ:

مولانا حسین احمد صاحب کی روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن (RLO) سے ایک قسم کی کنارہ کشی کے بعد یہ تنظیم مزید پریشانی کی شکار ہو چکی تھی، اس سے پہلے ہماری برادری کے بعض لوگ سمجھتے رہے تھے کہ اور جو بھی کچھ ہو لیکن ہماری اس نئی نویلی ابھرتی ہوئی تنظیم میں چند بڑے بڑے پتے کے لیڈران موجود ہیں، جن کے درمیان اتحاد و اتفاق بھی پایا جاتا ہے، لیکن مولانا حسین احمد صاحب کی کنارہ کشی کے بعد اس تنظیم کے حوالے سے لوگوں کی آراء مختلف ہو چکی تھیں اور ہماری برادری کے اکثر لوگ جان گئے تھے کہ اس نئی جماعت کے اندر قیادت کا شدید سے شدید ترین بحران پیدا ہو چکا ہے۔

تنظیم کے صدر جناب الحاج سلیم احمد صاحب نے باوجودیکہ کوششیں کیں کہ لیڈروں کے مابین پائی جانے والی عدم ہم آہنگی کو ختم کر کے ان کے مابین اتحاد و یک جہتی کو بحال کیا جائے، لیکن جہاں تک اس وقت اندازہ کیا گیا تھا کہ مولانا محمد کبیر صاحب کے مخصوص افتاد طبع اور ایک حد تک ان کی سخت گیر ذہنیت صدر صاحب کی کوششوں کے سامنے سنگ گراں بن کر حائل تھی، انہوں نے ہر چند کوششیں کیں کہ مولانا محمد کبیر کی موجودگی میں مولانا حسین احمد صاحب کو

دوبارہ تنظیم میں واپس لایا جائے، لیکن جہاں تک میری جانکاری ہے کہ مولانا محمد کبیر صاحب نے جناب صدر صاحب کی ہر چند کوششوں کو ناکام بنا دیا تھا۔

یہاں ایک بات یاد رہے کہ تنظیم کے مجاہدین کے علاوہ خود صدر صاحب کو مولانا محمد کبیر صاحب سے زیادہ مولانا حسین احمد صاحب پر اعتماد اور بھروسہ تھا، آپ کی تنظیم سے کنارہ کشی کے بعد مجاہدین کے اندر بڑی حد تک مایوسی بلکہ اداسی چھا گئی تھی، تاہم ایسے حالات میں بھی مولانا محمد کبیر صاحب نے ہر چند کوششیں کیں کہ تنظیم کو ہر ایک اعتبار سے سنبھالا دے کر اسے مختلف بحرانوں سے نکالا جا سکے، لیکن افسوس ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا توں توں مجاہدین مختلف دلدل میں پھنستے گئے تھے، ایک طرف مجاہدین مالی بحران کے شکار تھے، تو دوسری طرف ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے دباؤ سے سخت پریشان، ایسے حالات میں ان کے لئے یہاں زمین بالکل تنگ ہو چکی تھی، حتی کہ ایک زمانہ ایسا آن پہنچا تھا کہ سرحد کے اس پار ان کے لئے بچنے کا کوئی بھی راستہ بچا ہی نہیں تھا، ایسے حالات میں انہوں نے برمی فوجی حکام سے رابطہ کیا، یوں عبد القیوم، محمد الیاس اور محمد ایوب وغیرہ کی قیادت میں متعلقہ سرحدی فوجی حکام کے سامنے انہوں نے اپنے سارے ہتھیار ڈال دیئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ارکانی مسلمانوں کی انقلابی اور تحریکی سرگرمی کے اس طویل دور میں ان مجاہدین کا ہتھیار ڈالنا ایک دل شکن اور مایوس کن واقعہ تھا، جو روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے دور قیادت میں رونما ہوا تھا، جسے بعض لوگوں نے اس تنظیم کے لیڈروں کی عدم صلاحیت اور ناعاقبت اندیشی سے بھی تعبیر کیا تھا، بہر حال لوگ اسے جس الفاظ سے بھی تعبیر کریں یا نا کریں، لیکن سچ تو یہی ہے کہ اس عظیم المیہ نے پوری قوم کو بے حد متأثر کیا تھا، اس واقعہ کے بعد مولانا محمد کبیر سمیت اس تنظیم کے سارے لوگ چاٹگام جا چھپے تھے، لیکن ہر طرف سے ان پر لعنت و ملامت کا بوچھاڑ شروع ہو چکا تھا، ہتھیار ڈالنے والے شر پسند عناصر تو ظاہر ہے کہ برمی فوجی حکام کے شیطانی جال کے شکار ہو چکے تھے، ان پر جتنی بھی ملامتیں کی جائیں تو بھی کم ہیں، لیکن اس تنظیم کے لیڈروں کی ذمہ داریوں کا جہاں تک سوال ہے کہ دراصل بات یہی ہے کہ اس زمانے میں ہماری برادری

کی سوچ بچار رکھنے والے حلقوں کا یہی کہنا تھا کہ اس قومی حاثہ کا پورا پورا ذمے داریوں تو عموما روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے تمام کے تمام لیڈران ہیں، تاہم مخصوص طور پر اس کی حقیقی ذمے داری مولانا محمد کبیر صاحب کے سر پر ہے، جن کی عدم صلاحیت، نا قابلیت اور مخصوص افتادِ طبع ہی نے اتنے بڑے حاثہ کو جنم دیا تھا، کاش ان کے اندر تھوڑے ہی تواضع رہے ہوتے، کہتے ہیں کہ قومی سطح پر اتنا بڑا احاثہ رونما ہی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالی ان کو معاف فرمائے۔ آمین۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے سارے لیڈران بشمول مولانا حسین احمد صاحب اس واقعہ کے ذمے دار ہیں، لیکن ان لوگوں کے خیالات کے برعکس میرے خیال میں آپ اس واقعۂ جانکاہ کے ذمے دار نہیں ہیں، کیوں کہ پچھلی سطور میں عرض کی جاچکی ہے کہ اس حادثہ کے بہتوں دنوں پہلے مولانا حسین احمد صاحب نے اس تنظیم سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی، اس لئے اس حاثہ کی ذمے داری میں آپ کو کسی بھی طرح لپیٹا نہیں جاسکتا، صرف یہی نہیں بلکہ اس حاثہ کے طویل عرصہ بعد میں نے اس تنظیم کے بعض لیڈروں جن میں الحاج سلیم احمد صاحب نا قابل فراموش ہیں سے طول طویل گفتگو کی تھی، جن کا کہنا تھا کہ کاش اگر اس وقت مولانا حسین احمد صاحب کو تنظیم سے کنارہ کش نہیں ہونا پڑتا، تو شاید روہنگیا قوم کے دور آخر کی تاریخ میں اتنا بڑا حادثہ رونما ہی ہوتا، اور تو اور اس زمانے میں اس تنظیم کے صدر سلیم احمد صاحب نے مزید یہاں تک بتایا تھا کہ:

> ’’ہمارے تقریبا سارے کے سارے مجاہدین اور ذاتی طور پر میں بھی مولانا حسین احمد صاحب کے چاہنے والوں میں سے تھا، ہم سب کو آپ پر اعتماد اور کافی بھروسہ تھا، لیکن مولانا محمد کبیر صاحب نے مولانا حسین احمد صاحب کے لئے یہاں کا ماحول ایسا بنا دیا تھا کہ کوئی گنجائش نہیں تھی کہ مولانا یہاں آکر کام کریں، کاش اس وقت آپ یہاں دوبارہ آسکتے تو شاید مجاہدین آپ کے گرد دلجمعی کے ساتھ جمع ہو جاتے، لیکن مولانا محمد کبیر صاحب کو یہ گوارہ ہی کب تھا؟ کیا کریں کہ ہمیں مولانا محمد کبیر صاحب کی ناعاقبت اندیشی، غرور و پندار اور ان کے مخصوص افتادِ طبع نے ہی دے مارا ہے، بالآخر جس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑا ہے‘‘۔

پھر بھی جہاں تک دیکھا اور اندازہ کیا گیا کہ اس حادثۂ جانکاہ نے مولانا حسین احمد صاحب کے دل و دماغ پر شدید سے شدید ترین دھچکا لگایا تھا، جس نے آپ کی سیاسی سوچ بچار پر شدید اثر ڈالا تھا، اس واقعہ کے بعد آپ سیاسی اور فکری اعتبار سے کافی حد تک کشمکش اور الجھن سے دوچار ہو چکے تھے، جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے کہ آپ جیسے فراخ دل اور وسیع النظر انسان کو امید تھی کہ اگر چہ وقتی طور پر اس تنظیم کے بعض لیڈروں کے مابین عدم اعتماد، عدم مفاہمت اور اختلاف کی بدلی چھائی ہوئی تھی، لیکن بہت ہی قلیل مدت میں یہ بدلی ضرور چھٹ جائے گی، مگر افسوس کہ آخر کار ایسا نہیں ہوسکا تھا۔

ادھر اس واقعہ کے عرصہ بعد میں نے مولانا محمد کبیر صاحب سے ڈھیر ساری ملاقاتیں کی تھیں، اس حوالے سے ان کے ساتھ طول طویل گفتگو کی گئی تھی، ایک مجلس میں گفتگو کے دوران میں نے آپ سے کہا کہ مولانا محترم! ارایل او کے بعض لیڈران اس حادثہ کا پورا پورا ذمہ دار آپ کو ٹھہراتے نہیں تھکتے ہیں، تو اس پر آپ کا کیا خیال ہے؟ تو آپ نے میرے اس سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ:

> ’’درحقیقت بات ہی یہی ہے کہ ان نکمے لوگوں نے اپنی اپنی ذمے داریوں کا حق بالکل ادا نہیں کیا تھا، صرف یہی نہیں کہ ان میں سے بعض لوگوں نے اپنی ذمے داریوں سے پہلو تہی بھی کی تھی، مصیبت آنے والی تھی اور آئی، جب کہ یہ لوگ ساری ذمے داری میرے سر پر تھونپ کر راہ فرار اختیار کرنے کو اپنی اپنی عافیت سمجھ رہے ہیں، اور میرے خلاف سازشوں پر سازشیں کرتے پھر رہے ہیں، در حقیقت بات یہی ہے کہ یہ لوگ سرے سے پتے کے نہیں تھے اور نہیں ہیں، انقلاب کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، جو ان نکموں کے ذریعے برپا ہوجاتا، میرا قصور ہی یہی تھا کہ میں نے ان پر کچھ بھروسہ کیا تھا، کاش اگر مجھے ان کی صلاحیت اور لیاقت کا اندازہ ہوا ہوتا، تو شاید آج میرے چہرۂ زیبا پر اتنا بڑا کلنک کا ٹیکہ لگا ہی ہوتا‘‘۔

بہر حال اس واقعہ کے بعد روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) اگلے کم سے کم تین سالوں تک

خاموشی اور سرد مہری کی شکار ہو چکی تھی، یہ وقعہ نہ صرف مولانا محمد کبیر اور سلیم احمد صاحب کے لئے بلکہ اس تنظیم کے ساتھ رشتہ رکھنے والے کسی بھی انسان کی سیاسی ،فکری اور انقلابی زندگی کے لئے ایک بدنما داغ ثابت ہو چکا ،مخصوص طور پر مولانا محمد کبیر اور سلیم احمد صاحب کے لئے ہماری سیاسی فضاء اور انقلابی ماحول کثیف سے کثیف تر ہو چکا تھا، یہ دونوں حضرات آج اس دنیا میں نہیں ہیں،ان دونوں کی زندگیوں میں اس واقعہ کے بعد روہنگیا سیاسیوں اور انقلابیوں کی کوششوں سے ایک سے زیادہ متحدہ فورم یا جماعتیں منظر عام پر آئیں،لیکن کسی بھی متحدہ فورم یا جماعت میں یہ دونوں مدعو نہیں تھے،اور کسی بھی متحدہ کوشش میں ان دونوں کے چہرے نظر نہیں آئے ،اس سلسلے میں اورتو اور ۱۹۹۸ء کے دوران ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) اور روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے دونوں دھڑے اور قوم کے بعض اہل علم ودانش کی مسلسل اور بار آور کوششوں کے نتیجے میں ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کی بنیاد پڑی،تو اس زمانے میں قوم کے اہم لوگوں کے انتخاب کے دوران بعض لوگوں نے ارایل او والوں کے نام بھی سامنے لائے تھے،جن میں مولانا محمد کبیر اور سلیم احمد صاحب پیش پیش تھے،لیکن مذکورہ دونوں جماعتوں کی قیادات اور ان کے علاوہ بھی بعض اہم لوگوں نے یک زبان ہوکر ان دونوں ناموں کو مسترد کردیا،اور کہا گیا تھا کہ ان دونوں کی وجہ سے ہماری تاریخ کے دورآخر میں وہ واقعہ پیش آیا جو ہماری تحریک آزادی کی تاریخ کے لئے ایک بدنما داغ سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے، دراصل راقم سطور جس کا نام بھی ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) میں شامل تھا، اور وہ اس نئی نویلی تنظیم میں شامل ہوکر قومی خدمات کے میدان میں پیش پیش تھا کی بھی یہی تمنا رہی تھی کہ اس نت نئی ابھرنے والی متحدہ تنظیم میں ارایل او سے مولانا محمد کبیر،سلیم احمد صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب بھی شامل ہوجائیں،اور راقم کی جانب سے اس حوالے سے کافی کوششیں بھی کی گئی تھیں،لیکن بعض ارباب حل وعقد کی جانب سے یہی جواب ملا کہ ’’پہلے ان لوگوں کو قوم سے واضح طور پر معافی مانگنی ہوگی ،اور اس کے بعد ہی سوچا جائے گا کہ آیا ان لوگوں کو اس نئی تنظیم میں شامل کرنا کہاں تک درست ہوسکتا ہے‘‘ مگر ان لوگوں کے پاس قوم سے معافی منگوانے کی گزارش لے کر جائے تو کون جائے؟ آخر ہوا وہی جو ہونا تھا، یعنی ان حضرات کی شمولیت کے بغیر ارکان روہنگیا نیشنل

آرگنائزیشن (ARNO) کا اعلان ہوگیا، تاہم یہ الگ بات ہے کہ اگر اس وقت ان حضرات کو اس نئی تشکیل پانے والی متحدہ تنظیم میں دعوت شمولیت دی بھی جاتی تو آیا وہ لوگ شامل ہوتے بھی کہ نہیں؟ اس سوال کے جواب کے بطور میری معلومات یہی ہے کہ وہ حضرات شامل ہی نہیں ہوتے ،جس کی طول طویل داستان ہے،سردست اسے چھیڑنا کوئی سودمند کام نہیں ہے۔

ارایل او کو احیاء کرنے کی کوشش:

روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے مجاہدین کے برمی فوجی حکام کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد ارایل او کے تمام لیڈران ایک قسم کے سیاسی اپاہج بن چکے تھے،مولانا محمد کبیر صاحب عملاً اس تنظیم سے علیحدہ ہوکے چاٹگام میں اللہ اللہ خیر صلہ کی زندگی بسر کررہے تھے،اور اس تنظیم کے صدر جناب سلیم احمد صاحب بھی محو حیرت میں چاٹگام میں دم واپسیں لے رہے تھے، ایسے حالات میں مولانا حسین احمد صاحب آگے بڑھے اور روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کو دوبارہ احیاء کرنے کی کوشش شروع کردی تھی،جس میں آپ قدرے کامیاب بھی ہوئے۔

یہ ۱۹۹۱ء کا زمانہ تھا، ادھر ارکان سے روہنگیا مہاجرین کی ایک بڑی تعداد بنگلا دیش آچکی تھی، روہنگیا مسلمانوں کے حوالے سے ہر کجا واویلا مچا ہوا تھا، اور تو اور بنگلا دیش میں ایک قسم کا ہنگامہ بپا تھا، کہ اب کیا ہوا اور کیا ہونے والا ہے، یہی سوال ہر ایک کے دل ودماغ کو گھن کی طرح کھارہا تھا، ہماری اس وقت بھی زیر زمین کام کرنے والی جماعتیں تھیں،لیکن مختلف امراض کی شکار بس ایک قسم کی منتظر فردا، کسی کے پاس کچھ صلاحیت تھی اور نہ قابلیت، ہر کوئی قوم کے مسائل اور مشکلات پر آنسو بہاتا تو تھا لیکن ایسے آنسو بہانے سے کیا فائدہ جسے کوئی دیکھے اور دیکھے بھی تو تڑپ کر اٹھنے کی اس کے پاس قابلیت تھی اور نہ استعداد؟

ظاہر ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب کا روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے بننے اور اس کے اعلان کرنے میں کافی کردار رہا ہے، ۱۹۸۸ء سے لے کر ۱۹۹۱ء تک کے ان چند سالوں میں کئے گئے جتنے بھی کردار رہے، وہ ظاہر ہے کہ آپ کے سامنے تھے، مولانا محمد کبیر اور آپ کے مابین جو اختلافات تھے وہ اب مولانا محمد کبیر صاحب کی تنظیم سے عملاً علیحدہ ہوجانے کے بعد ختم ہوگئے، چوں کہ مولانا کی

روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے ساتھ بڑی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں، اس لئے آپ نہیں چاہتے تھے کہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) دنیا سے کلی طور پر ختم ہوجائے، اس لئے اب یہی سوچ کر کہ قوم کے ایسے مشکل حالات میں ایک حساس اور دردمند انسان کے لئے کسی بھی قسم کی کوشش کئے بغیر صرف اور صرف منتظر فردا بن کر بیٹھے رہنا مناسب ہے اور نہ جائز۔

اب مولانا محترم نے جناب سلیم احمد صاحب سے ملاقات کی، جن کے ساتھ ماضی قریب و بعید میں آپ کے کسی بھی قسم کی سیاسی، فکری، انقلابی اور نظریاتی اختلافات نہیں تھے، اور یوں بھی جہاں تک دیکھا گیا تھا کہ مولانا اگرچہ یک عالم دین ہیں اور سلیم احمد صاحب ایک دانش ور، لیکن دونوں کے مابین کام اور کاز کے حوالے سے کافی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ مولانا جس آن بان کے عالم ہیں، ان سے ہماری عام قومی روایت کے مطابق جناب سلیم احمد صاحب سے کیا نسبت؟ لیکن بات یہ ہے کہ مولانا محترم جناب سلیم احمد صاحب کو ہر حال میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور اب بھی بڑی محبت اور احترام سے یاد کرتے رہتے ہیں، روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے دور میں ہو یا اس کے بعد، کہیں بھی آپ جاتے، جناب سلیم احمد صاحب کا خیال رکھتے تھے، اس حوالے سے ایک بات یاد آگئی ہے کہ ایک روز کا واقعہ تھا کہ مولانا محترم الحاج ابوالکلام صاحب خونیہ فاروی کی رہائش گاہ میں ایک اجلاس میں شریک تھے، بات چھیڑی ایک نئی تنظیم کی تشکیل کی، تو ایک مرحلہ پر الحاج ابوالکلام صاحب نے مولانا سے مخاطب ہوکر کہا تھا کہ ''ابھی سلیم احمد صاحب کی بات چھوڑیں، انہیں بھی انشاء اللہ کسی مرحلہ میں بلالیا جائے گا'' آپ نے یہ بات سنی تو حاجی صاحب پر کافی برہم ہوکے فرمانے لگے کہ محترم سلیم صاحب میری تنظیم کے قابل قدر صدر رہیں، ہم ان کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، کیا وہ اس انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ انہیں کسی مرحلہ میں بلالیا جائے گا؟ تو آپ کا یہی ردعمل دیکھ کر حاجی صاحب کہنے لگے کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت ساری تنظیموں کے لیڈران اور کار کنان دیکھے ہیں، لیکن مولانا حسین احمد صاحب جیسا وفادار انسان کبھی اور کہیں نہیں دیکھا۔

بہرحال مولانا محترم نے جناب سلیم احمد صاحب سے چند ملاقاتیں کیں اور بات طے کرلی گئی تھی کہ

روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کو دوبارہ احیاء کرلیا جائے، یوں آگے چل کر آپ نے اپنے چند دوستوں، شاگردوں اور ہم خیالوں پر مشتمل جناب الحاج سلیم احمد صاحب کی زیر صدارت ہوٹل نئی یو نائیٹڈ چاٹگام میں اجلاس منعقد کرایا تھا، جس میں درج ذیل حضرات نے شرکت کی:

۱۔ جناب الحاج سلیم احمد بن نورالزمان صاحب خیر فاروی، منگڈوی۔
۲۔ جناب مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب لمبابیلی، بوسیدنگی۔
۳۔ جناب مولانا سیف اللہ بن مولانا عبدالجبار صاحب گدوسراوی، منگڈوی۔
۴۔ جناب مسٹر احسان اللہ صاحب فوئمالوی، بوسیدنگی۔
۵۔ جناب مولوی احمد الرحمن صاحب کیاکتوی۔
۶۔ جناب مولوی محمد طاہر جمال ندوی صاحب بانگونوی، بوسیدنگی۔

یہ اجلاس وقفے وقفے کے ساتھ تقریبا ایک مہینے سے زیادہ عرصہ تک جاری تھا، جس میں روہنگیا مسلمانوں کے حالات پر بڑی امعانِ نظر اور سنجیدگی سے غور وخوض کیا گیا تھا، علاوہ اس کے اسی زمانے میں روہنگیا قوم کی نجات وفلاح کے حوالے سے قومی سطح پر انقلابی اور سیاسی کام کرنے والی جماعتوں کی کارکردگیوں اور سرگرمیوں پر بھی خاصی نظر ڈالی گئی تھی، اور بطور خاص ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ اور روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن اور ان دونوں جماعتوں کی قیادات کی استعداد اور صلاحیات اور ان کے افکار ونظریات پر خاصی بحث کی گئی تھی، آخر میں یہ ضرورت محسوس کی گئی تھی کہ قوم کے حالات حاضرہ کے پیش نظر مذکورہ ان جماعتوں کی سرگرمیوں اور کارکردگیوں کے ہوتے ہوئے بھی روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کو دوبارہ احیاء کیا جائے، یوں مؤخر الذکر اس تنظیم کی تجدید واحیاء، اس کے امکانیات اور ضروریات پر بھی کافی گفتگو اور مشورے ہوئے تھے، آخرکار یہ بات طے پائی تھی کہ جناب الحاج سلیم احمد صاحب کی سربراہی میں اس تنظیم کو دوبارہ احیاء کر کے قوم وملت کی خیرخواہی اور نجات کے لئے از سرنو کوششیں کرنی چاہئے۔

اس اجلاس کے اختتام پر یہ تجویز بھی پاس کرلی گئی کہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی جانب

سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور حضرت مولانا سیف اللہ صاحب سعودی عرب کا دورہ کریں، جو وہاں پائی جانے والی برادری کے ان افراد کو دوبارہ فعال کریں گے، جو ماضی قریب و بعید میں اس تنظیم کے کارکن رہ چکے تھے، علاوہ ازیں تنظیم کی بہبودی کے حوالے سے بھی ممکنہ حد تک کام سرانجام دیا کریں گے، جس کی بھی بے حد ضرورت ہے۔

تنظیم کی طرف سے سعودی عرب کا دوسرا دورہ:

اس مذکورہ اجلاس کے کئی دن بعد مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا سیف اللہ صاحب گدو سراوی روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی طرف سے حجاز مقدس پہنچے، عمرہ اور زیارت مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فراغت کے بعد بطور خاص مکہ مکرمہ میں انہوں نے چند اجلاس کئے، جن میں مولانا حسین احمد صاحب کے دیرینہ احباب اور تنظیم کے معاونین کے علاوہ روہنگیا برادری کے بہت سارے دل جلے لوگوں نے شرکت کی تھی، ان اجلاس میں آپ نے روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی تجدید و احیاء کے علاوہ قوم کے درپیش حالات پر کھل کر گفتگو کی، یوں ہماری برادری میں ان دونوں عالموں کی کافی پذیرائی ہوئی تھی۔

اس کے بعد مولانا حسین احمد صاحب اور آپ کے رفیق سفر مولانا سیف اللہ صاحب نے سعودی عرب کی بعض بڑی اور قدآور دینی اور فکری شخصیات سے ملاقاتیں کیں، اور بعض متعلقہ انجمنوں کے ارباب بست و کشاد سے ارکان اور روہنگیا مسلمانوں کے حوالے سے تبادلۂ خیال کیا، جن میں رابطۃ العالم الاسلامی کے سکریٹری جنرل سے ملاقات ناقابل فراموش ہے۔

لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اس دورے کے دوران بھی مخالفین نے مولانا اور آپ کے ساتھی مولانا سیف اللہ صاحب سے کھل کر مخالفت کی، لیکن مولانا بھی چھوڑنے والے کب تھے؟ کہ آپ اور آپ کے حامیوں نے ان مخالفین کا ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ دنگل سے اکثر بھاگ تو گئے اور جو بچے تھے انہوں نے آپ کے سامنے حاضر ہو کر توبہ کر لی، اس سلسلے میں یہ بھی ایک قابل ذکر بات ہے کہ مخالین کی اس شدید مخالفت کے دوران آپ نے جس دلیری اور بہادری کا ثبوت دیا تھا وہ بھی ایک یاد رکھی جانے والی بات ہے۔

ایک اور دل دوز حادثہ:

مولانا حسین احمد صاحب ادھر سرزمین مقدس میں پہنچ کر قومی اور تنظیمی سرگرمیوں میں جان کھپا رہے تھے، اور اس کوشش میں تھے کہ کسی بھی طریقے سے روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کو ہر ایک اعتبار سے مستحکم کیا جائے، اور اس کے سائے تلے قوم کو متحد کر کے قومی مشکلات کے پائدار حل کی کوشش کی جائے۔

مگر افسوس کا مقام ہے کہ مولانا کا سرزمین مقدس پہنچے ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی شاید ہو پایا ہو کہ ادھر چاٹگام میں آپ کی رہائش گاہ میں گھس کر چند غنڈوں اور ڈکیتوں نے غنڈہ گردی کے ساتھ ڈکیتی کی کوشش کی تھی، جس کی وجہ سے نہ صرف آپ اور آپ کے احباب و رفقائے کار کے دلوں پر شدید دھچکا لگا تھا، بلکہ اس انوکھے حادثہ کی وجہ سے اس وقت کے ہمارے سیاسی اور انقلابی حلقوں میں بھی بڑی حد تک ہلچل مچ گئی تھی۔

ان شر پسند عناصر، غنڈوں یا ڈکیتوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی، صرف تین تھی، جن کا سرغنہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کوئی اور نہیں تھا بلکہ مولانا محترم کا ایک عزیز، چھیتا اور روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کا ایک رکن تھا، جس کو کہیں سے یہ وسوسہ پیدا ہو چکا تھا کہ مولانا محترم معاذ اللہ ایک خائن انسان ہیں، جو قومی امور کے حوالے سے چندہ حاصل کر کر کے پیٹ کی پوجا کے ساتھ رنگ رلیاں بھی کرتے ہیں، علاوہ ازیں شیطان کے بہکاوے میں آ کر آپ کے اس چہیتے کو یہ شبہ بھی پیدا ہو چکا تھا کہ آپ قوم کے نام چندہ اصول کر کے خود کھاتے، پیتے اور رنگ رلیاں تو کرتے ہیں، لیکن آپ کو اپنے تنظیمی ساتھیوں اور کارکنوں کی تھوڑی بھی فکر نہیں ہوتی ہے۔

بہر حال تاریخ اور مہینہ مجھے ابھی یاد نہیں ہے، البتہ ۱۹۹۲ء کا واقعہ تھا کہ ان سر پھرے غنڈوں نے تقریبا صبح آٹھ نو بجے مولانا کی رہائش گاہ (جو اسی زمانے میں چاندگاؤں، چاٹگام کے رہائشی علاقہ بی بلاک میں واقع تھا) میں گھس کر ڈاکہ زنی کی ناکام اور نامراد کوششیں کی تھیں۔

پچھلی سطور میں جس طرح عرض کی گئی ہے کہ ان غنڈوں کا رہبر اور سرخیل کوئی اور نہیں تھا بلکہ وہ مولانا

حسین احمد صاحب کا ایک چہیتا تھا، جس کا آئے دن آپ کی رہائش گاہ میں آنا جانا رہتا تھا، یوں اس کی رہنمائی میں ان غنڈوں کو آپ کی رہائش گاہ میں گھسنے میں آسانی ہوئی تھی۔

بہر حال یہ غنڈے ابھی ڈکیتی کی کوشش کر رہے تھے کہ ادھر اللہ تعالی کے فضل و کرم اور خاص رحمت سے اس گھر کے مالک کو یہ علم ہو چکا تھا کہ اس کے گھر کے ایک رہائشی پر ڈاکہ زنی کی کوشش ہو رہی ہے، ویسے اس گھر کے مالک نے چاند گاؤں تھانہ کی پولیس کو فون کر دیا تو اللہ تعالی کی رحمت سے پولیس بھی بر وقت آ پہنچی تھی۔

ابھی پولیس جائے واردات پر پہنچی تو ان غنڈوں نے بھاگنے کی کوششیں کیں، مگر تینوں کے تینوں پکڑے گئے تھے اور تھانے میں ان کے خلاف کچھ ضروری کاروائیوں کے بعد ان تینوں کو چاٹگام ہائی کورٹ کا حوالہ کر دیا گیا تھا۔

لیکن یہاں نہایت تعجب کا مقام ہے کہ ابھی یہ غنڈے جائے واردات پر رنگے ہاتھوں پکڑے جا چکے تھے، اور پولیس نے ضروری کاروائیوں کے بعد کورٹ کا حوالہ بھی کر دیا تھا، لیکن ابھی شام ڈھلے دیکھتے ہیں کہ یہ تینوں غنڈے کہیں اور نہیں بلکہ چاٹگام کے اس رہائشی علاقہ چاند گاؤں میں اطمینان سے گھوم رہے ہیں، یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہاء ہو گئی تھی۔

بہر حال مولانا محترم کو اس حادثہ کی اطلاع ملی تو آپ کے نازک دل پر کیا کچھ گذرا ہوگا؟ یہ تو ظاہر ہے، آپ سفر کو گئے تھے اپنی مظلوم قوم کی نجات کے لئے، وہاں ہر کجا ہاتھ پیر مار رہے تھے اپنی قوم کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے، لیکن طرفہ تماشا دیکھئے کہ خود آپ کی رہائش گاہ پر اپنے ایک چہیتے کی سرکردگی میں یہاں ڈاکہ زنی کی کوشش کی جا رہی تھی۔

اس واقعہ کی اطلاع پاتے ہی مولانا نے اپنے رفیق سفر مولانا سیف اللہ صاحب کو حجاز میں چھوڑ کر واپسی کی راہ لی، اور اس واقعہ کے صرف اور صرف تین دن کے بعد آپ چاٹگام آ پہنچے تھے، یہاں چاٹگام پہنچتے ہی آپ نے اپنے انداز میں اس حادثہ کی تحقیق کی، لیکن کیا فائدہ، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا، ابھی صبر کے سواء کیا کچھ کرنا باقی ہے؟ اگر چہ مصیبت بڑی تھی لیکن مولانا نے اس موقع پر بھی صبر و ثبات کے ہتھیار تھامے اپنے آپ کو سرخرو کر دکھایا تھا۔

دار المعارف کی دوبارہ مدرسی:

اب کی بار روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی سرگرمیاں تقریباً رک جانے بعد مولانا حسین احمد صاحب ارکان کی سیاسی و انقلابی خدمات کے حوالے سے ایک برمحل پلٹ فارم کے متلاشی تھے، ایسے حالات میں شاید آپ کو فارغ سمجھ کر روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) جو اسی زمانے میں نہایت عروج پر تھی کے لیڈروں نے دوبارہ کوششیں شروع کر دی تھیں کہ کسی بھی حیلے بہانے کے ذریعے آپ کو اس مؤخر الذکر تنظیم میں شامل کر لیا جائے، لیکن مولانا اپنے اصول پر بالکل اٹل ہی تھے اور اس بات پر ڈھٹے ہوئے تھے کہ کسی بھی حالت میں جماعتِ اسلامی کی دعوت کو ارکان میں گھسنے اور پاؤں جمانے سے روکا جائے۔

ظاہر ہے کہ مولانا اس زمانے میں کافی ذہنی الجھن کے شکار تھے، لیکن خدمات کے حوالے سے میدان تو ایک نہیں، بلکہ لائق اور پتے کے لوگوں کے لئے سامنے بہت سارے میدان کھلے ہوتے ہیں، ویسے آپ کے لئے ابھی ایک انتخاب کا سوال تھا بس۔

مولانا کے ایسے حالات میں دار المعارف الاسلامیہ چاٹگام والوں نے آپ کو دوبارہ مدرسی کے لئے دعوت دی تو آپ نے اس دعوت کو لبیک کہنا مناسب سمجھا، اور وہاں کی مدرسی قبول کر لی تھی۔

لیکن ظاہر ہے کہ آپ کو سیاست و قیادت کا چسکا لگ چکا تھا، اب کی بار مدرسی کا مشغلہ تو تھا ہی، لیکن آپ کی نظر سرزمین ارکان کی سیاست اور سیاست و قیادت کے نام پر کام کرنے والوں پر جمی ہوئی تھی۔ بہر حال ایسے حالات میں آپ نے مدرسی کے ساتھ ہی ساتھ کچھ نجی تجارت بھی شروع کر رکھی، جس میں اگر چہ خاص کامیابی نہیں ملی، لیکن تجارت کی طرف بھی آپ کا رجحان ہو گیا تھا، یاد رہے کہ تجارت کے حوالے سے آپ کی بعض کوششوں کی تفصیلات اگلی سطور میں انشاء اللہ تعالی آئیں گی۔

اب کی بار دار المعارف کی مدرسی بھی آپ کو راس نہیں آئی، جس کے دیگر اسباب و وجوہات سے قطع نظر اس کا ایک سبب میرے ناقص خیال میں یہ بھی تھا کہ اب مولانا خالص ایک مدرسہ کے مدرس نہیں ہو سکتے تھے، ایک طرف آپ کے سامنے سرزمین ارکان کے حالات ایک خاص انداز میں انگڑائیاں لے رہے تھے تو دوسری طرف آپ کو اپنی قومی و ملی ذمے داریاں ستا رہی تھیں، اور آپ کے صبر کو دستک

دے رہی تھیں کہ حسین احمد! کیا تجھے تیری قوم اور تیری ملت اس بات کی اجازت دے رہی ہے کہ تم بس ایک مدرسہ کی مدرسی پر مکتفی ہو جاؤ؟ اور ایک عام مدرسہ کے مدرسوں کی طرح ایک بے خبری کے عالم میں اپنی مظلوم قوم وملت پر گزرے ہوئے حالات وواقعات کو سرے سے بھول جاؤ؟؟

بہر صورت اب مولانا دارالمعارف الاسلامیہ کے مدرس بن چکے تھے، جس میں میرے ذاتی خیال میں قومی نہیں بھی تو آپ کی ذات کے حوالے سے کچھ فائدہ ضرور ہوا تھا، اب کی بار یہاں کے مدرسی کے دوران چند ذہین وفطین تلامذہ آپ کے گرد جمع ہو گئے، جن سے آپ اپنے خوابیدہ آرزو کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مدد لے سکتے تھے۔

دراصل بات یہی ہے کہ مولانا اب بھی اپنے یہ اور اس سے پہلے کے چند تلامذہ پر ایک بڑے کام کے حوالے سے پر امید ہیں، لیکن مشکل یہی ہے کہ ایک طرف آپ کے سارے تلامذہ سرزمین بنگال اور ارکان کے علاوہ دنیا کے دیگر گوشوں میں منتشر اور بکھرے ہوئے ہیں، تو ایک بڑے اور انقلابی کام کے لئے ان کو ایک جگہ پر جمع کرنا اور کرسکنا آسان کام نہیں ہے، علاوہ ازیں خود مولانا بھی آج کل ایک طویل مسافرت کی زندگی گزار رہے ہیں، یوں اتنے بڑے کام کے حوالے سے کہا جائے تو آپ کی عمر اور عمر کے ساتھ صحت کا حال بھی کچھ اچھا نظر نہیں آتا، لیکن پھر بھی آپ کے ایسے حالات میں آپ کا حوصلہ بہت بلند نظر آتا ہے، جس پر آپ کو جتنی بھی داد دی جائیں تو بھی کم ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی اس بلند حوصلگی کو مزید توانا کر دیں، اور صحت کے ساتھ عمر میں بھی برکتیں عطا کریں، آمین۔

یہاں دارالمعارف الاسلامیہ کی تاسیس کے حوالے سے ایک بات بہت اہم ہے کہ ظاہر ہے کہ اس ادارہ کا بانی حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی ہیں، لیکن جن دو ایک حضرات نے اس کی تاسیس کے لئے حضرت ذوقؔ کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی اور شروع شروع میں فکری وعملی اعتبار سے ساتھ بھی دیا تھا، ان میں سے ایک مولانا حسین احمد صاحب بھی ہیں، لیکن آج یہ بات جو زبان پر آ گئی تو کہاں تک مصلحت پر مبنی رہی ہے؟ یہ ناظرین کرام ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

مولانا حسین احمد صاحب کی اس بار کی مدرسی کے دوران حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب سے کچھ ناچاقیاں بھی ہو گئیں، اس سلسلے میں استاد اور شاگرد کے درمیان

تلخ کلامیوں پر مشتمل دو طرفہ مراسلہ کا دور دورہ بھی شروع ہو چکا تھا، اور تو اور حضرت ذوق نے اپنے شاگرد مولانا حسین احمد صاحب کے متعلق دل برداشتہ ہو کر ایسے ایسے جملے کسے تھے، جنہیں دہرانا ناچیز کے لئے مناسب ہے اور نہ جائز، تاہم ان میں سے ایک جملہ ہی ناظرین کرام کے لئے کافی ہے کہ جسے خود مولانا حسین احمد صاحب نے بیان کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر حضرت ذوقؔ نے میرے بارے میں اپنے ایک مراسلہ میں یوں لکھا ہے کہ: ''اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ تم اتنے بڑے کم زاد ہو تو تم کو مدرسے میں استاد بنانا تو کجا میں اپنا شاگرد تک نہیں بناتا''۔

دراصل ہمارے اس دیار کے علمائے کرام کا عجیب حال ہے، بسا اوقات مدارس میں بارہا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ مدارس کے ماحول میں استاد اور شاگرد دونوں معلم ہوں تو جبھی شاگرد تلامذہ کے مابین نمایاں ہو جائے تو خود استاد کی آنکھیاں بھی چندیا جاتی ہیں، تو دارالمعارف بھی تو آخر اس علاقے کا ایک مدرسہ ہی ہے، اس حوالے سے یہاں بھی ایک واقعہ ہوا، جسے مجھے ایک صاحب نے بڑے پر لطف انداز میں بیان کیا ہے کہ:

> ''دارالمعارف الاسلامیہ میں ایک روز النادی الثقافی کا جلسہ منعقد ہوا، جس میں حضرت ذوقؔ ندوی اور مولانا حسین احمد صاحب پینل میں حاضر تھے، جلسہ کا ناظم مولوی جشیم الدین ندوی (مرحوم) تھا، حضرت ذوق کی حاضری میں جناب ناظم جلسہ نے مولانا حسین احمد صاحب کو خطاب کے لئے ان الفاظ میں دعوت دی کہ'' اب ہمارے سامنے ایک عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے'' یہ سنا تو حضرت ذوق اس جلسہ سے اٹھ چلے گئے تھے، ویسے حضرت کے یوں ہی چلے جانے پر حاضرین مجلس میں سے بعض لوگوں نے یہی تاثر لیا کہ حضرت کو یہ برداشت نہیں ہوئی تھی کہ مولانا حسین احمد جو خود حضرت ذوق کے شاگرد ہیں، یہ بھی کوئی عاشق رسول ہو سکتے ہیں، واللہ اعلم حقیقۃ الحال''۔

تاہم یہ ایک حقیقت پر مبنی بات ہے کہ حضرت ذوق ندوی اپنے قابل ومستعد شاگرد پر کبھی کبھار

برملا اظہار فخر بھی کیا کرتے تھے، اس حوالے سے مجھے ایک بات ایک صاحب نے بتایا کہ ایک روز النادی الثقافی میں حضرت ذوق بحیثیت صدر اجلاس حاضر تھے، خطابات انگریزی میں ہو رہے تھے، آخر میں مولوی جشیم الدین ندوی صاحب (جو ناظم جلسہ تھا) نے مولانا حسین احمد صاحب کو دعوت خطاب دی تو آپ اسٹیج پر آئے اور چند منٹ انگریزی میں خطاب کیا، اب جلسہ کے اختتام پر حضرت ذوق اپنے کمرے چلے گئے، اور اپنے بعض تلامذہ سے فرمایا کہ دیکھو! ماشاء اللہ حسین احمد نے انگریزی میں کیسا ہی خطاب کیا ہے؟

حضرت مولانا حسین احمد صاحب بھی اپنے فائق الاقران استاد پر بڑے نازاں تھے اور اب بھی ہیں، اس حوالے سے ایک واقعہ یاد آیا کہ غالبا ۱۹۸۵ء کی بات تھی کہ میں نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی معیت میں حضرت ذوق سے چاٹگام میں پہلی بار ملاقات کی، اس ملاقات کے بعد واپسی پر مولانا حسین احمد صاحب نے مجھ سے اس ملاقات کا تأثر پوچھا تو میں نے اپنے انداز میں اپنا تأثر بتادیا، اس کے بعد مولانا نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: حضرت ذوق ندوی کے چہرۂ زیبا پر میں کیا بتاؤں کہ ''کانه طلعت الشمش علی وجهه''۔

مولانا حسین احمد صاحب حضرت مولانا محمد سلطان ذوق ندوی کو اپنے زمانے کے ایک برکۃ العصر انسان سمجھتے تھے، اس حوالے سے ایک واقعہ بھی یاد آیا کہ مولانا حسین احمد صاحب ابھی روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی مجلس عاملہ کے رکن تھے تو کسی ایک فاعل خیر نے آپ کو تنظیم کے لئے دس ہزار ڈالر کا ایک چیک دیا تو آپ نے اس چیک سمیت حضرت ذوق کے سامنے حاضری دی، اور یہ چیک حضرت ذوق کے ہاتھ پر دیتے ہوئے کہا کہ:

> ''حضرت ! یہ چیک مجھے میری تنظیم کے لئے ایک فاعل خیر کی جانب سے ملا ہے، میں اسے لے کر آپ کے سامنے اسی لئے آیا ہوں کہ آپ میرے ساتھ میری تنظیم کے حق میں دعائیں دیں، تاکہ میں اپنی مظلوم قوم کے لئے اس تنظیم کے زیر سائے مزید کام کرسکوں، ایسا کام جو میری قوم اور ملت کا شایان شان ہو''۔

مولانا کے چند وفا شناس تلامذہ:

حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی تدریسی زندگی بڑی طویل تو نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس قصیر المدتی دوران مدرسی میں آپ کے بہت سارے تلامذہ پائے جاتے ہیں، جن میں سے چند حضرات کے نام اور ان کی کچھ ضروری معلومات یہاں فراہم کی جارہی ہیں:

ا۔ مولوی حمید اللہ کوکس بازاری:

مولوی حمید اللہ صاحب کوکس بازاری نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے رنگیا خالی کے مدرسہ (اسلامی سنٹر) میں استفادہ کیا تھا، مولوی صاحب کے متعلق جہاں تک سنا اور اس کے حوالے سے اندازہ ہوا کہ وہ بڑے ذہین وفطین طالب علم تھا، اس کے حوالے سے خود اس کے استاد کا بیان ہے کہ مولوی حمید اللہ ماشاء اللہ بڑے وفا شناس آدمی ہے، ہر حال میں میری یاد رکھتا ہے، اللہ تعالی اس کی حیات دراز کرے آمین۔

۲۔ مولوی محمد حسن بوسیدنگی صاحب:

صدیق مکرم مولوی محمد حسن بن حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب کی پیدائش محلہ ریلوے بوسیدنگ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے لائق والد سے پاکر مدرسہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، یہ اس وقت کی بات تھی کہ جب اس کے والد گرامی اسی ادارہ میں ناظم برائے امور تعلیمات تھے، تو ابھی اس نے دو ایک جماعت کی تعلیم پائی کہ اس کے والد نے مع اہل خانہ بنگلا دیش کی طرف ہجرت کی، اور ٹیکناف میں سکونت اختیار کرتے ہوئے جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں مدرس مقرر ہوئے تھے۔

مولوی محمد حسن نے جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کے علاوہ جامعہ دار السنہ نہلا میں متوسطہ تک کی تعلیم پائی، اس نے ہمارے ممدوح مولانا حسین احمد صاحب سے جامعہ نہلا میں استفادہ کیا، تاہم یہ ایک الگ بات ہے کہ مولوی حسن نے حضرت مولانا سے بعد میں بھی کافی استفادہ کیا تھا مخصوص طور پر اس زمانے میں زیادہ استفادہ کیا جب مولانا محترم ۲۰۰۳ء کے بعد سعودی عرب کے ہو چکے ہیں۔

مولوی محمد حسن بڑے زیرک عالم ہے، ذہین تو ہے ہی، ساتھ ہی ساتھ اخذ کے مادے بھی کافی حد تک ہیں، مولوی صاحب نے اپنے استاد کا خوب خوب ساتھ نبھایا، سعودی عرب میں مولانا کے قیام کے

دوران آپ کی تحریکی اور دعوتی سرگرمیوں میں مولوی حسن پیش پیش تھا، اس نے ہر موقع پر اپنے استاد کی خدمت کی، اور خیر خواہی کے ساتھ پیش آتا رہا تھا۔

مولوی حسن صاحب سعودی عرب میں عرصۂ دراز تک روہنگیا برادری کے حوالے سے بننے والی انجمن "**لجنة برماوية**" کا رکن رہا، اس حوالے سے بھی اس کی بڑی سی بڑی خدمات تھیں، تاہم یہ الگ بات ہے کہ بعض حضرات اس پر طرح طرح کے الزامات تھوپتے نہیں تھکتے ہیں۔

مولوی محمد حسن راقم کے بھی بڑا خیر خواہ دوست ہے اور بڑا دیرینہ ساتھی بھی، جدہ میں بڑی طویل مدت تک راقم کے ساتھ رہتا تھا، ہم دونوں قومی خدمات کے حوالے سے ایک ہی ساتھ کام بھی کرتے تھے، ماشاءاللہ کافی صاحب بصیرت اور صائب رائے انسان ہے۔

۲۰۱۷ء کے بعد مولوی حسن سعودی عرب سے بنگلا دیش چلا آیا، یہاں آکر اس نے ایک دوسری شادی بھی کر لی، کوکس بازار کے علاقے میں رہائش پذیر ہے، شنید ہے کہ آج کل سابرانگ، ٹیکناف کے مدرسہ میں مدرسی کی خدمت کر رہا ہے، ماشاءاللہ عالم ہونے کے ساتھ ادیب اور شاعر بھی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کی حیات دراز کریں، آمین۔

۳۔ مولوی محمد شعیب نکھوروی:

مولوی محمد شعیب کی پیدائش شمالی منگڈو کے معروف قصبہ نکھورہ میں ہوئی، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم اپنی آبائی بستی نکھورہ میں پائی، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ نہلا میں مولانا حسین احمد صاحب سے خوب خوب استفادہ کیا، جامعہ اسلامیہ پٹیہ سے فراغت حاصل کی، مولوی صاحب آج کل جدہ میں مع اہل خانہ مقیم ہیں، اپنے استاد حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے بڑے خیر خواہ ہیں، اللہ تعالی اس کی عمر اور صحت میں برکت دیں، آمین۔

۴۔ مولوی شعیب الدین بانسکھالوی:

مولوی شعیب الدین بانسکھالوی کی پیدائش جنوبی چاٹگام کے معروف علاقہ بانسکھالی میں ہوئی، اس نے مولانا حسین احمد صاحب سے جامعہ دارلمعارف الاسلامیہ میں استفادہ کیا، مولوی صاحب نے بعد میں جامعہ ام القری میں تعلیم حاصل کی اور اس دوران بھی حضرت مولانا سے استفادہ کرتا رہا تھا، جس کا

سلسلہ تادم تحریر بدستور جاری ہے۔

مولوی صاحب نہایت ذہین وفطین طالب علم ہے، اور بڑے ہشیار اور زیرک عالم بھی، اس نے اور تو اور اپنے استاد کی خدمت کرنے میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی، استاد کو بھی اس پر بڑا فخر وناز ہے، مولوی صاحب آج کل جامعہ اسلامیہ عالمیہ چاٹگام کے لکچرر ہے اور وہاں کی جامع مسجد کے خطیب بھی، دعا ہے کہ اللہ تعالی مولوی صاحب کی حیات دراز کرے، آمین۔

۵۔ مولوی حسین احمد صاحب ڈھاکوی:

مولانا حسین احمد صاحب ایک بہت بڑا عالم دین ہیں، ڈھاکہ کے کسی علاقہ میں شنید ہے کہ کسی ایک بڑے مدرسہ کے محدث اور مفسر قرآن کریم ہیں، ان کے استاد حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے مطابق اپنے استاد کے بڑے خیر خواہ انسان ہیں، انہوں نے مولانا محترم سے جامعہ دارالمعارف الاسلامیہ میں استفادہ کیا، شاید آپ سے ابوداؤد شریف پڑھی تھی۔

مولانا محترم اپنے لائق شاگرد کے بڑے مداح ہیں اور فرماتے ہیں کہ میرے تلامذہ میں مولوی حسین احمد ڈھاکوی بڑے وفا شناس عالم دین ہیں، علاوہ ازیں وہ ہر حال میں اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں دعا چاہتے ہیں، اس ضمن میں ایک بات یاد آگئی ہے کہ مولانا محترم نے ایک روز مجھ سے فرمایا کہ میرا شاگرد مولوی حسین احمد صاحب ہر حال میں مجھ سے دعا چاہتے رہتے ہیں، لیکن ایک تم (راقم) ہی ہو کہ اس کی ضرورت تک محسوس نہیں کرتے؟ اس کے جواب میں میں نے بولا کہ بن مانگے ملنے والی چیز کیوں مانگی جائے؟ میں جانتا ہوں کہ آپ ہر حال میں اپنی دعاؤں میں مجھے یاد فرماتے ہیں، جس کا آپ نے بار ہا تذکرہ بھی فرمایا ہے، اس لئے آپ سے دعاؤں کی درخواست نہیں کی جاتی ہے، میرے اس جواب پر آپ ہنس پڑے اور بہت ساری دعائیں بھی دیں۔

۶۔ مولوی محمد شاکر بانسکھالوی:

مولانا حسین احمد صاحب کے ایک خاص شاگرد مولوی محمد شاکر کی پیدائش بانسکھالی، جنوبی چاٹگام میں ہوئی، وہ ۱۹۸۶ء کے دوران جامعہ احمدیہ سنیہ مراد پور میں پڑھتا تھا، نہ جانے کس ذریعے سے کہ اس کے ساتھ مولانا محترم کا تعارف ہوا، بعد میں وہ آپ کے اتنے قریب ہوگیا کہ لگتا تھا کہ وہ آپ کا کوئی

شاگرد نہیں بلکہ ایک چھوٹا اور عزیز ترین بھائی ہے، بڑے وفادار اور وفا شناس انسان ہے، اس نے مولانا سے کسی مدرسہ میں باضابطہ طور پر تو پڑھا نہیں تھا لیکن آپ کی رہائش گاہ میں جتنا کچھ پڑھا بہت ہی خوب پڑھا تھا، مولوی صاحب کے قریبی دوستوں میں ایک اور صاحب مولوی محمد زبیر بھی ہے، دونوں اکثر ایک ہی ساتھ رہا کرتے تھے۔

۷۔ <u>مولوی قاضی محمد زبیر بوال خالوی:</u>

مولوی محمد زبیر بوال خالی چاٹگام میں پیدا ہوا، ۱۹۸۵ء اور اس کے بعد بھی جامعہ احمدیہ سنیہ مراد پور کا طالب علم تھا، مولوی محمد شاکر کے قریبی دوستوں میں سے تھا، اور اب بھی ہے، مولانا محترم سے اس کا تعارف ہوا تو اس نے آپ سے خوب خوب استفادہ کیا اور جب سے تعارف ہوا تب سے لے کر اب تک وفا شناسی کا پورا پورا ثبوت پیش کیا، مولوی زبیر آج کل بوال خالی چاٹگام کے علاقہ میں عہدۂ قضا پر فائز ہے، اس علاقے میں قاضی محمد زبیر صاحب کے نام سے معروف ہے، چند مہینے پہلے مجھے قاضی صاحب کی جانب سے دعوت زیارت ملی تو میں اس سے ملنے بوال خالی گیا، اس کے شاندار دفتر میں اس سے ملاقات ہوئی تھی، بڑے احترام واکرام سے پیش آیا، جہاں تک اندازہ ہوا کہ اس علاقے میں اس کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ماشاء اللہ بڑے خلیق، شریف اور متواضع عالم ہے، اللہ تعالی حیات دراز کرے، آمین۔

۸۔ <u>مولوی حافظ فیض احمد سابرانگی:</u>

مولوی حافظ فیض احمد حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ایک ہے، اس کی پیدائش سابرانگ ٹیکناف میں ہوئی، مولانا محترم سے جامعہ اسلامیہ نہلا میں استفادہ کیا، مولانا حسین احمد صاحب کے مطابق بڑا ذہین وفطین طالب علم تھا، آج کل کراچی، پاکستان میں مقیم اور وہاں کے ایک مدرسہ کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہے، عرصۂ دراز تک اپنے استاد سے کسی قسم کا رابطہ نہیں تھا لیکن حال ہی کی بات ہے کہ اس نے آپ سے رابطہ کیا، آئے دن استاد شاگرد کے مابین طول طویل گفتگو ہوتی رہتی ہے، اس نے اپنے استاد کو یہ عندیہ بھی دے چکا ہے کہ وہ اب کی بار مولانا کے میشن کا ساتھ دے گا، اور مولانا کو بھی اس پر کافی مطمئن نظر آرہا ہے، اللہ تعالی مولوی صاحب کو توفیق سے نوازے۔

۹۔ <u>مولوی خورشید عالم منگڈوی:</u>

مولوی خورشید عالم منگڈوی بھی مولانا حسین احمد صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ایک ہے، اس نے آپ سے جامعہ اسلامیہ نہلا میں استفادہ کیا، مولوی صاحب بعد میں کراچی، پاکستان پہنچا، آج کل وہاں کے ایک مدرسہ میں اعلی درجہ کے مدرس ہے، مولانا محترم کے بیان کے مطابق وہ طالب علمی کے زمانے میں کافی ذہین وفطین تھا، استاد شاگرد کے درمیان عرصۂ دراز تک کسی قسم کا رابطہ نہیں تھا، لیکن حال ہی میں اس سے رابطہ ہو گیا، اپنے استاد کے مشن کا ساتھ دینے کا عندیہ دے چکا ہے، اللہ تعالی مولوی صاحب کو توفیق عطا کرے، آمین۔

۱۰۔ <u>مولوی صادق حسین ساتکانوی:</u>

مولوی صادق حسین ساتکانوی نے مولانا حسین احمد صاحب سے جامعہ اسلامیہ دار المعارف میں خوب خوب استفادہ کیا، مولانا کے بیان کے مطابق مولوی صاحب جید طالب علم اور اب عالم دین ہے، ساتکانیہ کے ایک مدرسہ میں حدیث کا مدرس ہے، شنید ہے کہ ابوداؤد شریف پڑھاتا ہے، آپ اپنے شاگرد کو "میرے صادق حسین" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں، یہ لفظ بذات خود اس بات کا غماز ہے کہ مولوی صاحب ایک جید عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے استاد کا بڑا وفادار بھی ہے، مولانا محترم خاصے پر امید ہیں کہ اگلے ممکنہ کام کے حوالے سے مولوی صاحب آپ کا بھرپور ساتھ دے گا، اللہ تعالی مولوی صاحب کی حیات دراز کرے، اور کام کی توفیق عنایت فرمائے۔

۱۱۔ <u>مولوی انعام الحق ساتکانوی:</u>

مولوی انعام الحق صاحب نے مولانا محترم سے دار المعارف الاسلامیہ میں استفادہ کیا، آپ کے بیان کے مطابق جید اور کافی حساس طالب علم تھا، آج کل ایک مدرسہ کا مدرس ہے، مولانا اپنے لائق شاگرد پر بہت کچھ امید رکھتے ہیں، خدا کرے کہ آپ کی امید بھر آئے، آمین۔

۱۲۔ <u>مولوی عبید الحق کیاکتوی:</u>

مولوی عبید الحق صاحب کیاکتو ارکان میں پیدا ہوئے، انہوں نے مولانا محترم سے دار السنہ نہلا میں استفادہ کیا، آپ کے بیان کے مطابق کافی جید طالب علم اور اب عالم دین ہیں، نہلا کے دوران تعلیم

مولوی صاحب اپنے استاد کے بہت ہی قریب رہتے تھے، اور اس کے بعد والے زمانے میں بھی اپنے استاد کے بڑے خیر خواہ نظر آئے، فراغت کے بعد وطن واپس گئے، حال کی بات ہے کہ وہ اپنے علاقے کے ایک دینی مدرسہ کی اعلی درجات کا مدرس ہیں، کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ مولوی صاحب کے لئے ان کے استاد نے حرمین کی زیارت کے لئے ویزہ اور ٹکٹ بھیجنا چاہا تھا، لیکن بعض وجوہات کی وجہ سے یہ کام اگر چہ نہیں ہو سکا مگر اس کوشش سے یہ بات عیاں طور پر نظر آتی ہے کہ آپ کا یہ لائق شاگرد آپ کے کتنے قریب اور چہیتا ہے، اللہ تعالی ان کی حیات دراز فرمائے۔

۱۳۔ مولوی شفیع الاعظم ہاٹہز اروی:

مولوی شفیع الاعظم ہاٹہز اروی نے مولانا محترم سے دارالمعارف میں استفادہ کیا، مولانا کے مطابق جید طالب علم تھا، اور شاید مستعد مطلوب علم بھی، نہ جانے آج کل مولوی صاحب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟

۱۴۔ مولانا امیر حسین ٹیکنافی:

مولانا امیر حسین صاحب کی پیدائش ٹیکناف میں ہوئی، انہوں نے مولانا محترم سے دار السنہ نہلا میں پڑھا، فراغت کے بعد شاید چاٹگام یونیورسیٹی سے ڈگری حاصل کی، آج کل مہیش خالی کے کسی سرکاری مدرسہ کے پرنسپل ہیں، مولانا کے مطابق بڑے ذہین اور نہایت حساس طالب علم تھے، اور مستعد و با صلاحیت عالم دین بھی۔

۱۵۔ مولوی اختر حسین اوکیاوی:

مولوی اختر حسین صاحب اوکیاوی نے مولانا محترم سے دار السنہ نہلا میں استفادہ کیا، آپ کے بیان کے مطابق بڑے جید طالب علم تھا، ان کے بعد کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، خدا معلوم کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں؟۔

۱۶۔ مولوی ممتاز الدین ناکون خالوی:

مولوی ممتاز الدین ناکون خالوی (ٹیکناف) نے مولانا محترم سے شاید دار السنہ نہلا میں استفادہ کیا، بڑے شریف اور کافی جید طالب علم تھا، اس کے بعد کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ خدا معلوم کہاں اور کس حالت میں ہے؟۔

۱۷۔ مولوی نور احمد ٹیکنافی:

مولوی نور احمد صاحب ٹیکنافی نے حضرت مولانا محترم سے جامعہ اسلامیہ دار السنہ نہلا میں استفادہ کیا، کہتے ہیں کہ وہ بہت ذہین طالب علم تھا، اور اب مستعد مطلوب علم بھی، آج کل سابرانگ ٹیکناف والے مدرسہ کے مدرس ہیں، اللہ تعالی عمر اور صحت میں برکت عطا کرے، آمین۔

۱۸۔ پروفیسر مولانا امیر حسین نہلوی:

پروفیسر مولانا امیر حسین صاحب نے مولانا محترم سے رنگیا خالی والے سرکاری مدرسہ (اسلامی سنٹر) میں خوب خوب استفادہ کیا، آپ ایک جید طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے حساس اور فعال عالم دین بھی ہیں، علم دین کے حصول کے ساتھ ساتھ عصری علوم میں بھی کافی درک رکھتے ہیں، مولانا کے بیان کے مطابق پروفیسر صاحب آج کل چاٹگام کی کسی ایک یونیورسیٹی میں لکچرر ہیں، شاید پروفیسر بھی ہوں، استاد کو اپنے لائق شاگرد پر بڑے نازاں نظر آتا ہے، ماضی میں آپ سے کافی رابطے میں تھے، نہ جانے آج کل یہ رابطہ بحال بھی ہے کہ نہیں، اللہ تعالی ان کی عمر اور صحت میں برکت عطا کرے، آمین۔

۱۹۔ مولوی حافظ صالح احمد عاشقہ فاروی:

مولوی حافظ صالح احمد صاحب عاشقہ فاروی، منگڈوی نے مولانا محترم سے جامعہ اسلامیہ دار السنہ میں استفادہ کیا، مولوی صاحب اپنے استاد کے بڑے چہیتے تھے، کہتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں بڑے ذہین و فطین تھے، نہ جانے آج کل کس حال میں ہیں؟۔

۲۰۔ مولوی عبد الرحیم رنگیا دنگی مرحوم:

عزیزم مولوی عبد الرحیم صاحب رنگیا دنگی، بوسیدنگی مرحوم مولانا محترم کا حقیقی ماموں زاد بھائی ہے، دارالمعارف الاسلامیہ کے علاوہ مرحوم نے آپ سے مختلف مقامات میں خوب خوب استفادہ کیا، عرصۂ دراز تک ساتھ رہا، مولوی عبد الرحیم جسمانی اعتبار سے قد کا چھوٹا اور رنگ کا کالا تھا، جس کی وجہ سے مولانا محترم اس کے ساتھ شاید دل جوئی کے لئے ہو کہ مذاق کیا کرتے تھے، جید طالب علم تھا، اور نہایت بلند اخلاق کا مالک بھی، فراغت کے بعد وطن واپس گیا، مختلف مدارس میں پڑھاتا رہا تھا، ترقی کر کے ابوداؤد شریف تک کی تعلیم دی، اللہ تعالی کو کچھ اور منظور تھا کہ مولوی صاحب نے بھری جوانی کے عالم میں داعی اجل کو لبیک کہہ دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تجارت کے حوالے سے مولانا کی جدوجہد:

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب کوئی تجارت پیشہ آدمی نہیں ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ہرانسان کو اپنی زندگی کے گزارے کے لئے ایک پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی انسان کی کوشش میں کامیابی کا مدار وانحصار اللہ تعالی کی مرضی پر ہوتا ہے، انسان ہزار کوشش کرتا اور کرسکتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی کوشش میں ضرور کامیاب ہوجائے گا، تاہم کوشش ضرور کرنی ہوتی ہے، اورکوشش کے بغیر بھی انسان کامیاب کب ہوتا ہے۔

روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی تجدید واحیاء کے لئے مولانا نے بڑی کوشش کی تھی، لیکن آخر کار مختلف اسباب کی وجہ سے آپ کو اس حوالے سے ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا، اب آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ چند سالوں کے لئے میدان تجارت میں اتر کر کوشش کی جائے، تو ایسے حالات میں آپ نے ایک بیان میں کہا تھا کہ:

> ’’میں نے اپنی قوم کی بہبودی اور نجات کے حوالے سے سیاسی اور انقلابی میدانوں میں اپنی بساط بھر کوشش کی، آخر زندگی کے گزارے کے لئے بھی ایک وسیلہ کی ضرورت ہوتی ہے، ویسے اب میں نے عزم کرلیا کہ اگلے کم سے کم پانچ سالوں کے لئے تجارتی میدان میں اتر کر کوشش کرکے دیکھوں گا، کامیابی تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے، انسان کی چاہت تو ہے لیکن کامرانی کا انحصار اللہ تعالی کی مرضی پر ہے۔ مدت ختم ہوتے ہی دوبارہ قومی امور کے حوالے سے میدان میں واپس آؤں گا، خدا کرے کہ میری دوبارہ واپسی میں کوئی بھی چیز حائل اور رکاوٹ نہ بن جائے،(مفہوم نہ کہ پورے الفاظ)

تجارت کے عزم کے ساتھ مولانا نے کتاب فروشی کے میدان کو چنا تھا، باہر سے کتابیں منگواتے اور چاٹگام سمیت بنگلا دیش کے مختلف مقامات جن میں مختلف علمی ادارے بھی تھے اور کتابوں کی مختلف دکانیں بھی تھیں میں بیچا کرتے تھے، لیکن میرا جہاں تک اندازہ ہے کہ آپ اس کتاب فروشی کے میدان میں اتنے کامیاب نہیں ہوسکے جتنی امیدیں آپ کو تھیں، علاوہ ازیں ظاہر ہے

کہ آپ کے پاس ذاتی کوئی دکان نہیں تھی اور نہ اس نوعیت کا کوئی ادارہ، اس لئے آپ کو خرید و فروخت کے حوالے سے کافی مشقتیں برداشت کرنی پڑی تھیں، ایسی مشقتیں جو آپ جیسے ایک نازک طبع انسان کی برداشت کی باہر تھیں۔

کتاب فروشی کے میدان میں متوقع امیدیں بھر نہ آئیں تو آپ نے ۲۰۰۲ء کے دوران سعودی عرب کی راہ لی، جہاں آپ کو چاہنے والے بہتوں تھے، اور میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنے ان چاہنے والوں پر کافی بھروسہ بھی تھا، اور آپ کو امید تھی کہ اپنے ان خیرخواہوں کے سہارے تجارت کے کسی اور میدان میں کامیابیاں ہوں گی۔

آپ نے اس بار مستقل طور پر مکہ مکرمہ میں قیام کیا، اور چند مہینے گزرتے نہ گزرتے آپ نے اپنے بعض خیر اندیشوں کے سہارے جوار حرم پاک میں دکان فروشی کی تجارت شروع کی، تاجروں سے دکانیں لیتے اور اپنی مرضی کی قیمت پر دوسروں کو بیچ دیتے تھے، ویسے پہلے پہلے اس تجارت میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تھی، لیکن بعد میں ماشاء اللہ امید سے کہیں بڑھ کر اس میں کامیابیوں سے آپ ہم کنار ہوچکے تھے۔

مگر افسوس ہے کہ مولانا کی اس تجارت میں بعض ان خیرخواہوں جن پر آپ کو کافی اعتماد اور بھروسہ تھا، ان کی بے ایمانیاں، بدعہدیاں اور بے زبانیاں آڑے آئیں، حتی کہ یہ چیزیں اتنی آگے بڑھیں کہ جن کی وجہ سے آپ کو اس تجارت سے نہ صرف ہاتھ دھونا پڑا بلکہ آپ کی زندگی کو وہ پریشانیاں لاحق ہوئیں جو کبھی بھی متوقع نہیں تھیں، اور ان بدعہدوں نے آپس میں مل کر آپ کو وہ تکلیفیں پہنچائیں جو کم سے کم آپ کو ان سے کبھی بھی امید نہیں تھیں۔

جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس تجارت میں مولانا کی آئے دن کی ترقی نے آپ کو دے مارا، ان بدعہدوں کی آنکھیں آپ کی آئے دن کی کامیابی کو دیکھ کر چندیا گئیں، پر آپ کی چند مہینوں کی کوشش سے اتنی بڑی کامیابی ان کے خواب وخیال سے کہیں باہر تھی، اب ان کو حقد وحسد نے اتنا مجبور کردیا کہ وہ آپ کی جائز طور پر کمائی ہوئی دولت کو ڈاکہ زنی کی راہ سے ہڑپ کر جائیں، ظاہر ہے کہ آپ ایک حیثیت سے بڑے سیدھے سادھے اور عہد و پیمان کا پاس ولحاظ

رکھنے والے انسان ہیں، یوں آپ کو کیا پتہ تھا کہ اپنوں کی شکل وصورت میں یہ سارے لوگ اتنی بدعہدیوں پر اتر آئیں گے، اور آپ کی تجارت کے آگے روڑے اٹکاتے ہوئے ڈاکہ زنی کی راہ سے آپ کی جائز طور پر کمائی ہوئی دولت کو ہڑپ کر جائیں گے؟

ان بدعہدوں نے آپس میں مل کر مولانا کے خلاف نام نہاد مقدمہ دائر کر دیا، اور جعلی دستاویزات اور جھوٹے گواہوں کے سہارے آخر کار آپ کو پھانس ہی لیا، اور کم سے کم اگلے آٹھ نو سالوں کی مدت کے لئے جیل خانے کی اندھیاری میں غرق کر دیا گیا تھا۔

یہ بدعہد حیلے باز کتنے بڑے ظالم تھے وہ بھی تھوڑا ملاحظہ کیجئے کہ ادھر مولانا کو جیل خانے میں ڈال دینے کی کامیابیوں کے بعد ان کو اب بھی یقین تھا کہ آپ کسی بھی طریقے سے باہر آنے میں کامیاب ہو جائیں گے، اس لئے انہوں نے آپ کی گلوخلاصی کی راہ پر مختلف روڑے اٹکا دیئے، کہ ہماری اطلاعات کے مطابق سعودی عرب میں پائی جانے والی روہنگیا برادری کے چند ایسے نام نہاد علماء کی تصدیقات ان بدعہدوں نے حاصل کر لیں کہ جن میں یہ لکھا گیا کہ حسین احمد ابوالفضل نہ صرف تجارت کے حوالے سے دھوکے باز ہیں بلکہ دینیات وایمانیات کے اعتبار سے ایک فتنہ پرداز انسان بھی، ویسے اس قید وبند کے حالات سے گلوخلاصی میں آپ کو اتنے سال لگ گئے تھے۔

مولانا الحمد للہ تقریبا ۲۰۲۰ء میں اس قید وبند سے خلاص ہوئے، آپ کے پاس اپنے حقوق کی کھلی دستاویزات موجود ہیں، جیل سے خلاصی کے بعد میں نے آپ سے اس حوالے سے چند مرتبہ ٹیلیفونک گفتگو کی تھی، جن سے اندازہ ہوا کہ آپ کے پاس جو دستاویزات موجود ہیں ان کی بنیاد پر آپ کو اپنے حقوق کی بازیابی میں کامیابی مل سکتی ہے، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنے خاص فضل وکرم سے آپ کو کامیاب کریں، ظاہر ہے کہ آپ کی قیمتی زندگی کا ایک حصہ جو اس قید وبند کی حالت میں بیت گیا ہے وہ تو واپس آنے والا نہیں ہے، تاہم پھر بھی دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کی بھی تلافی کی کوئی راہ نکال دیں، آمین۔

حصول مال وزر اور تجارت کے حوالے سے یہاں ایک بات بتا دیتا ہوں کہ مولانا حسین احمد صاحب ہم جیسے عام انسانوں کی طرح حریص آدمی بھی نہیں ہیں، جہاں تک میں آپ کو جانتا ہوں کہ آپ کے دل

کے کسی گوشے میں بھی پیسے کی بے جا محبت نہیں ہے، آپ کے دل خدمت دین وقوم کے جذبے سے ہمیشہ سرشار رہتا ہے، یہ آپ کی زندگی کا مقصد اور آپ کی جیون کا حاصل ہوتا ہے، پیسے جمع کرنا اور اس جمع کرنے کو اپنا مقصد حیات قرار دینا آپ کا شیوہ ہرگز ہرگز نہیں ہے، میرے نزدیک یہی وہ چیز ہے جو آپ کو موجودہ دور کے ہم جیسے لوگوں کے علاوہ بعض علمائے کرام سے بھی ممتاز کرتی ہے۔

ویسے بھی میں جہاں تک جانتا ہوں کہ تجارت پر آپ کا اترنا کوئی مال جمع کرنے کی خاطر نہیں تھا، بلکہ ان مالوں کے ذریعے مظلوم روہنگیا کی خدمات کے علاوہ جس عظیم کام کے لئے وہ دنیا میں زندگی گزار رہے تھے اس کی تکمیل کی آسانی کے لئے تھا، لیکن افسوس ہے کہ ظالموں نے اس میں بھی آپ کو ناکام بنا دیا، دراصل بات یہی تھی کہ ظالموں نے آپ کو سمجھا ہی نہیں تھا، اور آپ کو تعاون کرنے کے بجائے راہوں پر آپ کے آگے روڑے اٹکانے کی کوششیں کیں، یوں کسی بھی مرحلے میں آپ کو کامیابیوں سے ہم کنار ہونے نہیں دیا گیا۔

دراصل مولانا محترم خالق کائنات کی جانب سے ایک مضطرب دل اور متحرک وجود لے کر آئے ہیں، آپ کا سینہ اپنی مظلوم قوم کی ہمدردی سے بھرپور ہے، آپ کی روح اپنی قوم کی حمایت کے لئے ہمیشہ بے چین رہتی ہے، آپ ہر جگہ کے مسلمانوں کے معاون اور ہر مقام پر بسنے والے مظلوموں کے حامی ہیں، اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دیں، آمین۔

دراصل مولانا کے انداز واطوار، طرز زندگی اور چال چلن سے لوگوں کو غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے کہ کہیں آپ ایک مالدار انسان تو نہیں ہیں؟ آپ نے اپنی زندگی میں مالی لحاظ سے یا معیشت کے حوالے سے نشیب وفراز دیکھا ہے، ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ آپ کو تنگ دستی کے بھوت نے آدبوچا بھی تھا، اس کے برعکس ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ آپ کی مالی حالت درست بھی ہو چکی تھی۔

اس حوالے سے مجھے ۱۹۹۱ء کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے کہ مولانا کے دوست اور میرے محترم استاد مولانا مستفیض الرحمن صاحب بانگونوی، بوسیدگی علاج کے سلسلے میں چاٹگام آئے تھے، بانگونوی صاحب کا خیال تھا کہ مولانا حسین احمد صاحب کی مالی حالت کافی درست ہے، لیکن ایک مہینے کی اقامت کے بعد ان کو بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ نہیں! مولانا حسین احمد صاحب اگرچہ بظاہر شاہانہ زندگی گزارتے ہیں

لیکن درحقیقت وہ ایک بوریہ نشین، قوم وملت کے مفاد پر تڑپنے والے ایک غریب انسان ہیں، یوں ایک مہینے کے قیام کے بعد ایک روز بانگلونوی صاحب کہنے لگے کہ:

”مولانا حسین احمد صاحب! ماضی قریب وبعید میں آپ کے طرز بود وماند سے میں تو سمجھتا رہا تھا کہ آپ کی مالی حالت کافی درست ہے، لیکن اس مرتبہ ایک مہینے کی رفاقت ومعیت کے بعد بخوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ سرزمین ارکان سے نسبت رکھنے والے کوئی اور کسی بھی نمایاں عالموں کے برعکس آپ ایک مسکین اور مالی اعتبار سے حد درجہ غریب اور مفلس انسان ہیں“۔

میں نے ظاہر ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب کو بہت ہی قریب سے دیکھا، مالی اعتبار سے آپ کی حالت جیسی بھی ہو لیکن طرز زندگی اور چال چلن ہمیشہ شاہانہ دیکھا تھا، مولانا کسی بھی انسان کو اپنی زندگی کی عسرت کا اندازہ ہونے نہیں دیتے، جب بھی اللہ تعالی آپ کو فراغت نصیب کر دیتے تو آپ محتاجوں کی خیرخواہی کرنے میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑتے تھے، اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

آل برما مسلم کانگرس(BMC)

۲۰۰۲ء کے دوران حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی زندگی میں ایک عجیب سا موڑ آیا، وہ اس لئے کہ ایک طرف ہماری سیاسی وانقلابی فضاء میں (بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے جن کی داستان بڑی طویل ہے) اداسی اور نا امیدی کی بدلی چھا گئی اور ہمارے زیر زمین کام کرنے والے اکثر فعال لیڈروں، رہنماؤں اور متحرک کارکنوں میں مستقل مزاجی وذہنی استقرار کی شدت سے کمی محسوس کی جانے لگی تھی، تو دوسری طرف میدان فکر وعمل اور سیاست وقیادت میں پیہم یک سو رہنے کی وجہ سے آپ کی معاشی حالت بھی ابتر سے ابتر ہو چکی تھی۔

پھر ادھر سیاسی وانقلابی نقطۂ نظر سے یہاں کی زمین ہمارے سیاست دانوں اور انقلابیوں کے لئے آئے دن تنگ کی جا رہی تو ادھر خود مولانا کو اپنے بعض دوستوں اور ساتھیوں کی مسلسل بے وفائی اور بے اعتنائی کا غم کھایا جا رہا تھا، ایسے حالات میں آپ نے فیصلہ کرلیا کہ اب ناگزیر ہے کہ سعودی عرب کی راہ لی جائے۔ یوں بھی مولانا شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ جن امنگوں اور نیک تمناؤں کے سہارے یہاں اتنے دنوں سے جی رہے، قربانیوں ں پر قربانیاں دے رہے ہیں، اب حالات کی

نزاکت زبان حال بن کر شہادت دے رہی ہے کہ ان پر پانی پھرا جا چکا ہے۔

یہاں ایک بات بڑی قابل ذکر ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب سیاسی اعتبار سے کانگرسی ذہنیت کا انسان ہیں، مولانا یوں بھی دیوبندی عالم تو ہیں لیکن سیاسی اعتبار سے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے بجائے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی یا دوسرے الفاظ میں جمعیت علمائے ہند کو پسند کرنے والے انسان ہیں، علاوہ ازیں سب سے بڑی بات یہی ہے کہ آپ حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک گونہ پرستاروں میں سے ایک ہیں، آزاد کی زندگی، ان کی بلند وبالا شخصیت اور استعداد ولیاقت پر بڑے فدا ہیں، یوں آپ نے اب کی بار کی اپنی سیاسی تنظیم کا نام بھی کانگریسی ڈھب پر دیا ہے، جو ظاہر ہے۔

بہرحال اب کی بار ۲۰۰۲ء میں سعودی عرب کی راہ لینے سے پہلے آپ نے اپنے بعض احباب اور چاہنے والوں کے سامنے اظہار خیال کیا کہ:

”میں نے سالہا سال تک اپنی مظلوم قوم کی نجات کی خاطر اس میدان عمل وتطبیق میں جان کھپائی ہے، بایں ہمہ جس بلند مقصد کے حصول کے لئے میں نے اتنی کوششیں کیں، اتنی مشقتیں برداشت کیں، اب حالات کے تناظر میں دیکھتا ہوں کہ اس مقصد کے حصول کے لئے طویل المدتی پروگرام کی ضرورت ہے، چوں کہ ابھی ایک طرف حالات بھی ہمارے متعاکس چل رہے ہیں تو دوسری طرف میری معاشی حالت اس دوران ابتر سے ابتر ہو چکی ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے میں پانچ سالوں تک میدان عمل وتطبیق سے کسی قدر دور ومہجور ہو کر کچھ اپنی معاشی حالت کی درستگی کے لئے کوشش کرتا ہوں، تا کہ اس کے بعد ملی وقومی کام کے کرنے میں آسانی پیدا ہو سکے، البتہ یاد رہے کہ جس مقصد کے لئے میں میدان چھوڑ کر جا رہا ہوں، اندیشہ ہے کہ وہاں سے بآسانی واپس بھی لوٹ سکوں گا“۔ (مفہوم ہے نہ کہ پورے الفاظ)

مولانا ۲۰۰۲ء میں سعودی عرب اس نیت سے پہنچے کہ پانچ سال وہاں رہ کر اپنی معاشی حالت درست کریں گے، اس کے بعد دوبارہ واپس لوٹیں گے، مگر ایسا ہو نہ سکا، اور جس اندیشے کا آپ نے جاتے

وقت برملا اظہار کیا تھا آخر کار ہوا بھی کچھ ویسا، بہرحال آپ نے وہاں دکانوں کی تجارت شروع کی، ہماری جانکاری کے مطابق آپ اصل مالکوں سے دکانیں لیتے اور دوسروں کو فروخت کر دیتے تھے، یوں اللہ تعالی نے آپ کی اس تجارت میں کافی برکت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں کے مالک ہو چکے تھے، مگر افسوس ہے کہ بعد میں مولانا کی اس سودمند تجارت پر کچھ منحوس لوگوں کی بری نظریں لگ گئیں، اس کے بعد کیا کچھ ہوا اس کی طول طویل داستان ہے، جو اپنی جگہ پر موجود۔

ادھر آپ کی تجارت کا حال وہ تھا جو ابھی ابھی گزر چکا ہے، تو ادھر بات یہ ہے کہ جس انسان کا دل اپنی مظلوم قوم کی محبت سے سرشار ہو وہ آخر کب تک اپنی قومی وملی خدمات سے دور رہ سکتا ہے؟ ویسے آپ نے ۲۰۰۴ء سے اپنی نجی تجارت کے تہ بتہ رہونگیا برادری کے مابین اپنے انداز میں دینی، دعوتی، فکری اور سیاسی سرگرمیوں کا از سر نو آغاز کیا، جس کا سلسلہ درمیان کے چند سالوں کو چھوڑ کر تا حال جاری ہے۔

آپ کی اس دعوتی، فکری اور کسی قدر ثقافتی سرگرمی سے پہلے ایک بات کا تذکرہ نہایت ضروری ہے کہ ۲۰۰۰ء یا اس سے بھی پہلے کی بات تھی کہ ہماری برادری کے کچھ نیم پڑھے شرپسند نوجوانان جو نام نہاد سلفیت سے متاثر ہو کر ہماری برادری میں گمراہی پھیلا رہے تھے، مولانا نے اپنے مرشد حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیز ویؒ (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین صاحب احمد مدنیؒ) کے ایماء اور آپ کے شفیق مربی و استاد حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب ہاٹہزاروی (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ) کے اشارے اور کسی قدر ان کے فکری تعاون سے ان شرپسندوں کی سرکوبی کی کوششیں شروع کر رکھی تھیں، جس میں آپ حد درجہ کامیاب ہو کے بنگلادیش چلے آئے تھے۔

لیکن نہایت افسوس کا مقام تھا کہ بعض اسباب و وجوہات کی بنیاد پر آپ دو سالوں یعنی ۲۰۰۲ء تک واپس نہ جا سکے تھے، تو بعض دانا، بینا اور باخبر لوگوں کے مطابق اس درمیانی مدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہماری برادری کے ایک زخم سے چور مولوی صاحب نے خوشہ چین یا کفش بردارِ علمائے دیوبند کے لبادے اور آڑ میں مولانا کے اس مفتوحہ میدان میں اترنے کی اس لئے کوشش کی کہ مولانا حسین احمد صاحب کا ہماری برادری میں اس طرح فاتح بن کر مزید چڑھتے ابھرتے رہنا ان مولوی صاحب

کے لئے بڑے خطرے کا اشارہ ہے، کیوں کہ ان مولوی صاحب نے اپنے ذاتی مستقبل کو مزید سنوار نے کے لئے بزعم خود جو شمع شہرت جلا رکھی تھی وہ ہمیشہ کے لئے دھبر دوس ہونے اور بجھ جانے کا شدید اندیشہ ہے۔ تو ان مولوی صاحب کی وجہ سے کاز کا حد درجہ نقصان ہو گیا تھا، کیوں کہ:

☆ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ راقم کے نزدیک ان مولوی صاحب کی تمام تر کوششیں وجد وجہد (بزعم خود) غیر مرتب، غیر منظم ہونے کے علی الرغم موضوع کے حوالے سے حکمت ناشناسی اور ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھیں، جس کا منطقی انجام نہ صرف ان کی ذات کے لئے (جس کی لمبی چوڑی تفصیلات سے صرفِ نظر) بلکہ وہاں پائے جانے والی ہماری برادری اور ایک حیثیت سے پوری قوم کے لئے بہت ہی برا نکلا۔ علاوہ ازیں مصیبت پر مصیبتیں یہی تھیں کہ :

☆ مولوی صاحب کے حالات سے واقف اور ان کی مجالس میں شرکت کرنے والے بعض سمجھ دار مشاہدین کے بیان کے مطابق ان کی زبان، اندازِ بیان اور طرزِ گفتگو میں وہ تاثیر نہیں ہوتی جو عام طور پر ایک داعی الی اللہ (مناظر بھی تو ایک حیثیت سے داعی الی اللہ ہوتا ہے) کی زبان میں ہوا کرتی ہے۔

☆ مولوی صاحب بزعم خود ایک منطقی وفلسفی ہونے کے ساتھ مناظر بھی ہیں، لیکن مخالفین ان کے مناظرے ومباحثے کی زبان اور محاورات سے بالکل نابلد تھے، اور ان مخالف عناصر سے مناظرے کے لئے جو زبان اور محاورات کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس سرے سے نہیں تھے۔ تو ظاہر ہے کہ ان کے مکالمے ومباحثے یا ان کے الفاظ میں مناظرے کا منطقی انجام کیا، کیسا اور کس آن بان کا نکلا ہوگا؟ اور

☆ مولوی صاحب کی زبان میں فطری طور پر لکنت تھی اور ہے، یا کم سے کم اس میں غیر ضروری بلکہ بہت ہی غیر ضروری ٹھہراؤ پایا جاتا تھا اور پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے مخالفین بلکہ عام سامعین بھی بھور محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تو ایسا انسان مناظرے میں جیت کا سہرا اپنا سر کیسے لے سکتا ہے؟ خاشا وکلا کبھی نہیں۔

☆ مولوی صاحب نے نام نہاد مناظرے کے حوالے سے عام اجلاس بلانے کے بجائے لوگوں کے گھروں میں متعدد جلسے منعقد کرائے، جن میں مخالفین میں سے ان افراد نے شرکت نہیں کی جنہیں فریق مخالف میں ذمے دار یا سرغنہ سمجھا جاتا ہو، جس کی وجہ سے عام سمجھ دار لوگوں کے

علاوہ مخالفین کے بعض بڑے بڑوں نے یہ تاثر لیا بلکہ کہنا تک شروع کر دیا تھا کہ مولوی صاحب کی ایسی بزدلانہ حرکتیں اور سرگرمیاں ذمے دارانہ ہونے کے بجائے کاز اور موضوع کی نسبت سے ان کی بدطینتی و بدباطنی (ان کے مطابق) کا عین عکاس ہیں، علاوہ ازیں بعض لوگوں نے ان کی ایسی حرکتوں کو بلند حوصلگی اور بزدلی کے میزان میں بھی تولنا شروع کر دیا تھا۔

☆ چند دن جاتے نہ جاتے مولوی صاحب بشمول ان کے چند حواریوں نے یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ انہوں نے ان شرپسند اور گمراہ کن عناصر کو دنگل میں مات دینے کے بعد ان کے ساتھ ایک معاہدہ بھی کرلیا ہے، جس میں ان کے مطابق ان گمراہ عناصر نے توبہ کرلی اور وہ راہ راست پر آ گئے ہیں ،لیکن بعد میں سوال کھڑا ہوا کہ مولوی صاحب اور ان کے حواریوں کا یہ ڈھنڈورا پیٹنا کہاں تک زمینی حقائق و واقعیت پر مبنی نہیں تھا؟ جب کہ مخالفین نے ان کے برعکس یہ واویلا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ مولوی صاحب دنگل میں ان سے مات کھا چکے ہیں۔

☆ موضوع اور مناظرہ کے حوالے سے مولوی صاحب نے ایک رسالہ لکھا، تقاضے کے مطابق کہ وہ عربی میں ہونا چاہئے تھا، لیکن نہ جانے کیوں (شاید لوگ جانتے بھی ہوں گے) کہ انہوں نے کچھ ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھ ڈالا، جب کہ ظاہر ہے کہ مخالفین اردو زبان سے سرے سے ناواقف ہیں، تو اس کے بعد ان شرپسند مخالفین نے بات مشہور کر دی کہ مولوی صاحب عربی زبان و ادب سے ناواقف ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے فائدہ کس کا ہوا اور نقصان کس کا؟؟

راقم سطور سعودی عرب میں ۲۰۰۳ء کو پہنچا، اس زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب اپنی نجی تجارت کے علی الرغم دعوتی سرگرمی میں کافی مصروف و مگن تھے، آل برما مسلم کانگرس کی بنیاد پڑنے کے دوران راقم اگرچہ ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کی مجلس عاملہ کا ممبر اور سعودی عرب میں اس تنظیم کی طرف سے آفیشل مندوب تھا، لیکن ماضی کی طرح آپ کی سرگرمیوں کو کسی قدر قریب سے دیکھ رہا تھا، ۲۰۰۶ء کے دوران آپ نے راقم کو اپنی تحریک میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی تھی، لیکن بعض ناقابل بیان وجوہات کی بنیاد پر آپ کی دعوت کو لبیک کہنا ممکن نہیں ہو سکا۔

تقریباً ۲۰۰۷ء کے دوران آپ نے آل برما مسلم کانگرس (BMC) کی مجلس عاملہ کی

تشکیل دی، جس میں وہاں پائے جانے والی ہماری برادری کی چند نمایاں ترین شخصیات جیسے ماسٹر محمد سلطان شقدار فاروی، ماسٹر عزیز احمد بوسیدنگی، حضرت مولانا مقبول احمد بارنگیارڈیلوی، مولانا محمد حسن بوسیدنگی شامل تھیں۔

آمدم برسر مطلب! بات یہ ہے کہ حالات حاضرہ کے تناظر میں اہل نظر اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ سعودی عرب کی سرزمین ہماری ان جیسی سرگرمیوں کے لئے کتنی مناسب یا نامناسب ہے، ایسی دل شکن فضاء اور سیاست کے حوالے سے ایسے مایوس کن ماحول میں بھی مولانا بطور خاص سیاست کے حوالے سے جن سرگرمیوں کا مظاہرہ جس شان اور جس آن بان سے کر رہے تھے، وہ ہر کسی کی ہمت و حوصلہ کی بات نہیں تھی، اور سچ کہوں تو اب بھی نہیں ہے، آپ اس زمانے میں اور تادم تحریر بھی روہنگیا سیاست کے حوالے سے وہاں جس عزم جواں اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس کا تصور عام انسان تو کجا کسی متوقع برے انجام سے واقف انسان کبھی نہیں کر سکتا، لیکن آپ کے طرز سرگرمی سے جو اندازہ کیا گیا اور کیا جا رہا ہے کہ آپ ایک جرات مند ہونے کے علاوہ خود خوف و غم سے مقابلہ کرنے والا کرشماتی انسان ہیں، اس حوالے سے آپ کا کہنا یہ ہے کہ:

> ’’حالات حاضرہ کے تناظر میں کون نہیں جانتا کہ سعودی عرب کی سرزمین ہماری اس نوعیت کی تحریکی سرگرمیوں کے لئے کتنی نامناسب ہے؟ خود ہمارے ساتھیوں میں سے بڑے بڑے بھی اس حوالے سے فکر مند تھے اور ہیں، جن کی ہمتیں جواب دینے کے قریب تھیں اور اب بھی ہیں، لیکن مجھے کسی قسم کے انجام کی فکر نہیں، کیوں کہ میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ میری اس نوعیت کے کام کی انجام دہی کے لئے سر دھڑ کی بازیاں لگانی پڑتی ہیں، بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں، مختلف پریشانیاں سہنی پڑتی ہیں، بھانت بھانت کی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، کال کوٹھری کی اندھیاری میں غرق ہونا پڑتا ہے، اور اگر ضرورت پڑی تو جانوں کا نذرانہ تک پیش کرنا پڑتا ہے، تبھی اللہ تعالی کو منظور ہو تو کبھی کہیں جا کر ایک تحریک کامیابی سے ہم کنار ہو سکتی ہے، حقیقت میں بات یہ ہے کہ اور تو اور موت تک سے ڈرنے والا انسان میری اس نوعیت

کے کام کے لئے میدان میں اترنے کا مستحق نہیں ہے، چنانچہ ظاہر ہے کہ میرے خلاف بھی بہت کچھ ہوتا رہا، آئے دن میں مختلف ومتنوع چیلنج سے مقابلہ کرتا رہا، ماضی میں بھی میں تین چار مرتبہ حراست میں لیا جا چکا، آخر کار باضابطہ طور پر حراست میں لیا جا چکا تھا، جس کی وجہ سے میں کبھی بھی گھبرایا ہوا نہ تھا، اور نہ اب بھی کسی قسم کے غم واندوہ کا شکار ہوں، کیوں کہ اللہ تعالی کے فضل وکرم سے مجھے اپنی ذات پر پورا اعتماد ہے کہ:

ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین"۔

ظاہر ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب آل برما مسلم کانگرس سے پہلے روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے مؤسس رکن اور اس کی مجلس عاملہ کے فعال ومؤثر ممبر رہ چکے ہیں، لیکن موخر الذکر یہ تنظیم بس ایک سیاسی اور انقلابی تنظیم تھی، اب کی بار آپ نے آل برما مسلم کانگرس کے نام سے جس جماعت کی بنیاد رکھی، یہ محض ایک سیاسی اور انقلابی پارٹی یا تنظیم نہیں، بلکہ آپ کی بعض تقاریر اور تحریروں کے مطابق یہ ایک مستقل تحریک ہے۔

مولانا نے اس تحریک کے زیر سایہ بہت سارے مفید کام انجام دیے، جن کی وجہ سے پوری قوم کو عموما اور وہاں پائی جانے والی روہنگیا برادری کو خصوصا بہت ہی فائدہ پہنچا، سردست ایک طرح کے اس عجالے میں پورا احصاء تو ممکن نہیں، تاہم ان میں سے بعض چیزوں کا اجمال یہ ہے کہ:

(۱) ۲۰۰۴ء کے بعد مولانا حسین احمد صاحب نے اپنی تحریک کا آغاز اپنے ماضی کی دعوتی اور اصلاحی کڑی سے جڑتے ہوئے کیا، واقعہ یہ ہے کہ سعودی عرب میں افسوس ہے کہ ہماری برادری میں کچھ من چلے قسم کے نادان، علم وفن سے نابلد نوجوان پیدا ہوئے، (جن کا اجمالی تذکرہ سطور بالا میں بھی کیا گیا ہے) جو اسلام دشمن عناصر اور گم راہ کن فرقوں کے شکار ہو چکے تھے، اور جو اپنی گم راہ کن تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ہماری برادری کو گم راہ کرنے پر تلے ہوئے تھے، باوثوق ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق یہ نوجوانان نام نہاد اہل حدیث کی آڑ میں دانستہ یا نادانستہ طور پر پرویزی، احمدی، تکفیری، خوارج، اسلام دشمن یہود ونصاری کے علاوہ بہتوں انسانیت دشمن عناصر اور فرقوں کے گماشتے، چیلے اور ہتھکنڈے بنے کام کر رہے تھے، اب مولانا نے ان من چلے عناصر کو

آڑے ہاتھوں لیا اور اپنی مؤثر تقریروں اور زوردار خطابات کے سہارے ان پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ میدان سے دم دبا کے بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ تو ظاہر ہے کہ آپ کی یہ قابل قدر اور مؤثر کام دینی، ایمانی، روحانی، فکری اور دعوتی ہونے کے علاوہ "**دفع المضرات اقدم علی جلب المنفعات**" والے اصول کے لحاظ سے کتنی بڑی اہمیت کا حامل کام تھا۔

(۲) ساتھ ہی ساتھ آپ نے **دفع المضرات** کے ساتھ **جلب المنفعات** کا کام بھی بڑی باریک بینی اور پوری سنجیدگی سے جاری رکھا، اس حوالے سے بھی آپ نے درجنوں اجلاس کرائے، جن میں سینکڑوں کی تعداد میں علماء ومشائخ، پڑھے لکھے دانش وران اور ہزاروں کی تعداد میں عوام جمع ہوتے تھے، جہاں آپ نے اپنی قابل قدر دینی وایمانی، علمی وفکری، ثقافتی وسیاسی خطابات کے ذریعے ہماری ذہنی طور پر مضمحل برادری کی رہنمائی کی، اور اپنے خطابات کی ہزاروں کی تعداد میں کیسٹیں بنوا بنوا کر لوگوں میں تقسیم کروائیں، ویسے اصلاح احوال کے حوالے سے آپ کی یہ خدمت بڑی مؤثر رہی تھی۔

(۳) ۱۹۴۸ء سے لے کر مولانا کی اس بارآور وباثمر تحریکی خدمات کی ابتداء تک ہمارے ماضی کے بعض بزرگوں اور رہنماؤں اور حال کے بعض قائدوں اور سیاست دانوں کی بعض غلط اقدامات اور ناعاقبت اندیشانہ سرگرمیوں یا بعض شخصیات کی منفی کرداروں کی وجہ سے (خاکم بدہن اور گستاخی معاف!) ہمارے سیاسی وانقلابی حلقوں اور اخلاقی وفکری فضاء میں جو مایوسی اور اداسی کی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں، آپ نے اپنی مؤثر سرگرمی کے ذریعے ان کو بڑی حد تک صاف کیا، اور برادری کے اداس اور مایوس لوگوں کو امید کی کرنیں دکھائیں۔

(۴) مولانا کی ان سرگرمیوں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آپ کے ہم عصر سیاست وقیادت اور تحریک وانقلاب کے مزاج سے تقریبا ناآشنا ایک مولوی صاحب کی سیاست وقیادت کے نام پر (بڑے بڑے دعوؤں اور وہ بھی بڑی سینہ زوری کے ساتھ) کچھ ناعاقبت اندیشانہ حرکات وسکنات کے نتیجے میں ایک طرف جو عموما علمائے ارکان کے مقدس ماتھے پر کلنگ کا ٹھیکہ لگ گیا تھا، تو دوسری طرف خصوصا ہمارے دانشوران کو علمائے ارکان کے سروں پر جو یہ اور اس قسم کی دیگر شکایتیں تھوپنے کا موقع مل چکا تھا" کہ یہ لوگ سرے سے اس میدان کے نہیں ہیں" ان کا کسی قدر ازالہ ہو گیا۔ اس

حوالے سے مولانا حسین احمد صاحب نے ان شکایات کی بڑی باریک بینی سے تدارک کیا، پھر ان مولوی صاحب کے غلط دعوؤں اور ناعاقبت اندیشانہ حرکات وسکنات کی وجہ سے علماء کے متعلق ہماری عام برادری کے علاوہ ہمارے بااثر دانشوروں کے دماغوں میں جو خلش ورنجش اوران کے دلوں میں جو نفرتیں وکدورتیں پیدا ہوچکی تھیں، آپ نے اپنی خدادادلیاقت وصلاحیت اوراپنے جرات مندانہ کردار واقدامات کے ذریعے اس بات کا عملی ثبوت دیا کہ ہمارے دانشوروں کو علمائے ارکان کے متعلق اور کچھ ہو نہ ہو تو کم سے کم اپنے دل ودماغ میں آئی ہوئی شکایات پر نظر ثانی کرنی چاہیۓ۔

سعودی عرب میں مولانا نے آل برما مسلم کانگرس کی ایک مرکزی یونٹ (شاید عارضی) قائم کی تھی، جو اب بھی ہے، پروگرام تھا اور ہے کہ جہاں جہاں روہنگیا برادری (جیسے یوروپ، ملائشیا، انڈونیشیا، متحدہ عرب امارات، پاکستان وغیرہ) پائی جاتی ہے، وہاں ایک ایک یونٹ قائم ہو، کاش اگر آپ حراست میں لئے گئے نہ ہوتے، تو آج تک شاید یہ ساری یونٹیں قائم ہوچکی ہوتیں، رہا بنگلادیش کہ آپ اسے اپنی تحریک کے لئے مستقل مرکز قرار دینا چاہتے ہیں۔

مولانا جماعت کے مصارف کے لئے لوگوں کے چندے، صدقات وخیرات پر انحصار کرنے کے شدید مخالف ہیں، اس حوالے سے مولانا کا کہنا ہے کہ جماعت کے مصارف کے لئے ابتدائی طور پر ممبروں کو آگے بڑھنا ہوگا، اور ایک مناسب رقم کو تجارت میں لگا کر اس کے منافع سے جماعت کو چلانا ہوگا، آپ کے مطابق چوں کہ ہماری اس نوعیت کے کام کی انجام دہی کے لئے بھاری رقم کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے جماعت کے مجوزہ مستقل منصوبوں اور پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسلم جہاں کی بھاری امداد وتعاون کی ضرورت ہوگی۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب حراست میں لئے جانے بعد نہ صرف آپ کی بلکہ آپ کے تقریبا تمام احباب کی امید تھی کہ آپ جلد رہا ہوجائیں گے، اور قافلہ کو مسلسل آگے بڑھائیں گے، لیکن آپ کی رہائی کے خلاف بڑی بڑی سازشیں ہونے کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہوسکا، اور آس و یاس کے ملے جلے حالات میں دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی رہائی کو کوئی آٹھ سال سے زیادہ مدت لگ گئی تھی، جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ نہ صرف آپ کا بڑا نقصان ہوا، بلکہ پوری قوم کو خسارے کا

بوجھ اٹھانا پڑا، اس دوران کتنے آپ کے قابل قدر احباب اور رفقائے تھے، جنہوں نے اس جہانِ فانی سے رخصتیں لیں، اور کتنے آپ کے ہم سفر تھے کہ جو بعض اسباب و وجوہات کی وجہ سے قافلہ سے بچھڑ گئے، یا غلط ہاتھوں کے شکار ہوکر انہوں نے راہیں جدا کرلیں، لیکن پھر بھی آپ کے چند ایسے رفقائے کار تھے، جو آپ کی رہائی کے شدید منتظر تھے۔

بڑے افسوس اور حسرت کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی رہائی کو روکنے کے لئے خود ہماری برادری کے کچھ قوم دشمن عناصر نے بڑی بڑی سازشیں کیں، اور اس حوالے سے بھاری رقوم کے ساتھ واسطے استعمال کئے، اور تو اور باضابطہ طور پر تشہیر تک کی گئی تھی کہ آپ حالت زندان میں اس جہاں سے کوچ کرچکے ہیں، تاکہ آپ کے منتظرِ فردا احباب اور رفقائے کار کے حوصلے ٹوٹ جائیں، اور وہ مایوس ہوکر ہمیشہ کے لئے بکھر جائیں، لیکن اللہ تعالی کا کرم تھا کہ آس ویاس کے ان ملے جلے حالات میں بھی آپ کے بعض احباب کے حوصلے پست نہیں کئے جاسکے تھے۔

یہ دنیا بڑی ستم گر ہے کہ بسا اوقات یہاں ظالموں کو ان کی ستم ظریفی پر ہزار داد ملتی ہیں، اور مظلوموں کی بے بسی پر آنسو بہانے کے بجائے ان کی مظلومیت کا مذاق اڑایا جاتا ہے! جہاں بلبلیں ناکردہ جرم کی پاداش میں قید صیاد میں ہوا کرتی ہیں تو الو ہر کجا اپنی فتح کی راگنی گاتے اور کامرانی کی تاریں چھڑتے پھرتے ہیں، تو یہاں مولانا کے حوالے سے بھی ایسا کچھ ہوتا رہا تھا۔

آہ! زنداں کے شب وروز میں مولانا پر کیا کچھ بیتا ہوگا، آپ کے طبع نازک پر کتنا اندوہ ناک بار پڑا ہوگا، آپ کی کتنی ذاتی وقومی توقعات اور امیدیں خاک میں مل چکی ہوں گی، آپ کی ناز پروردہ اولادو اہل پر کتنی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے، آپ کے گھرانے اور خاندان پر کتنی پریشانیاں لاحق ہوئی ہوں گی، یہ وہ جانے اور خدا جانے۔ لیکن ظالمو یاد رکھو! اللہ کے گھر میں دیر ہے، لیکن سدا اندھیر نہیں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تمہیں معاف کرے، اور منظور ہو تو تمہاری ہدایت کا فیصلہ فرمائے۔

بہر حال ۲۰۱۸ء میں مولانا اچانک رہا ہوگئے۔ الحمد للہ۔ اور امید کے مطابق آپ نے اپنے ملی اور قومی کاز کو آگے بڑھانے کے لئے تازہ دم ہوکر دوبارہ کمر ہمت کس بھی لی، یوں دیکھتے ہی دیکھتے آپ کے وہ احباب اور رفقائے کار جو منتظر فردا تھے، ایک ایک کرکے آپ کے گرد جمع ہوگئے، صرف

یہی نہیں بلکہ مزید خوشی کی بات ہے کہ چند ایسے قابل قدر افراد بھی آپ کے قافلے میں شامل ہو گئے، جو اس قافلے میں اگر چہ نت نئے ہیں، لیکن ان کو آپ کی ذات عالی مرتبت اور آپ کے دینی وملی، علمی وثقافتی، فکری وسیاسی صلاحیات وکمالات پر امید نہیں بلکہ یقین سا ہو چلا ہے کہ لے دے کر شاید اس مظلوم ومعصوم، اداس ومضمحل قوم کے لئے ایک ہی ناخدا باقی رہ گیا ہے، جو ناپید کنار سمندر کی موج وطلاطم میں ہچکولے کھاتی ہوئی اس قومی کشتی کو خدا کرے تو پار لگا سکتا ہے، پھر اس پر مستزاد یہ ہے کہ ماضی قریب وبعید میں کبھی آپ کے مخالفین کی صف اول میں پائی جانے والی ہماری برادری کی چند نمایاں ترین شخصیات بھی آپ کے ہم آہنگ ہو گئیں، جن میں سے بعض کا بیان ہے کہ:

”اگر چہ مدتوں پہلے ہم حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی من موہنی اور دلاویز شخصیت اور آپ کے بعض موہوبی وکسبی صلاحیات وکمالات سے واقف ہو چکے تھے، لیکن افسوس ہے کہ ہم آپ کے بعض حاسدین کے حقد وحسد کے جال میں بری طرح پھنس چکے تھے، اب سالوں بعد یہ معلوم ہونے پر حسرت کی انتہا ہو گئی ہے کہ ہم نے نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ آپ سے دور رہنے کی شکل میں پوری قوم پر ظلم ڈھایا ہے، کاش آپ کی قربت پہلے نصیب ہوئی ہوتی، اور آپ کے کمالات سے ہم مستفید ہو سکے ہوتے، آج تک شاید دنیا اس مظلوم قوم کی حالت کسی دوسری شکل میں دیکھ رہی ہوتی“۔

تقریبا ۲۰۲۱ء کے بعد سے مولانا حسین احمد صاحب اپنی جماعت کو منظم ومرتب کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، لیکن کچھ حالات کے تقاضے اور وقت کی نزاکت کے ساتھ بعض قانونی مشکلات حائل ہیں، اور سمجھ رہے ہیں کہ ان مشکلات کو حل کئے بغیر جماعت کے بعض ضروری پروگراموں کو آگے بڑھانا مناسب نہیں، خدا کرے کہ حالات اپنی مثبت انگڑائیوں کے ساتھ بدل جائیں، اور ان قانونی مشکلات کے حل کے لئے کوئی راہ نکل آئے۔

ظاہر ہے کہ مولانا کی جماعت کا نام تقریبا ۲۰۰۴ء سے آل برما مسلم گانگرس (BMC) ہے، آپ کے مطابق جس کا دستور بھی ہے اور منشور بھی، حالات کے تقاضے اور وقت کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ٹھہراؤ کے ساتھ کچھ سرگرمیاں بھی چل رہی ہیں۔ تاہم ماضی قریب میں آپ کے بعض مخلص احباب

اور بہت ہی قریبی رفقائے کار کی طرف سے ایک تجویز پیش گئی تھی کہ وطن عزیز کے زمینی حقائق کے پیش نظر جماعت کا نام بدل دیا جائے۔ پھر چند مہینے کی بات تھی کہ اس تجویز کے حوالے سے جماعت کا ایک اعلی سطحی اجلاس منعقد کیا گیا تھا، جس میں بڑے غور وفکر اور کافی بحث ومباحثے کے بعد جماعت کے نام کو تبدیل کرنے کی قرارداد پاس ہوئی، اور زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے جماعت کا نام ارکان نیشنل کانگرس (ANC) رکھا گیا۔ اس کے بعد طبیعی امر ہے کہ جماعت کے دستور ومنشور میں بھی ضروری تبدیلیاں لائی جائیں، جس کے لئے مولانا کی زیر صدارت اور ایک اجلاس بلا گیا تھا، جس میں اس ضرورت کو پوری کرنے کے لئے چار رکنی ایک کمیشن بنا دیا گیا، جو دستور ومنشور میں ضروری تغییر وتبدل اور اضافے وترمیم کر کے اسے حتمی شکل دے گا۔

دعوی تو نہیں، مگر بات یہ ہے کہ ایک سعودی عرب تو کیا، شکر ہے کہ میں دنیا کے چپے چپے میں رہائش پذیر ہماری برادری کی نمایاں ترین فکری اور سیاسی شخصیات کے حالات وکمالات اور ان کے کوائف سے ضروری حد تک واقف ہوں، تو حالات کے تناظر میں عرض ہے کہ آج کل جو قابل قدر احباب ورفقائے کار آپ کے گرد جمع ہو چکے ہیں، میرے علم کے مطابق یہ ہماری برادری کے چنیدہ اور نمایاں ترین افراد ہیں، اور شک نہیں ہے کہ جو اپنے اپنے مقام پر قابل قدر بھی، جس کا احساس اور کسی کو ہو نہ ہو مگر مولانا کو ضرور ہے، اگر ان شخصیات اور ان کی استعداد اور صلاحیات کو برمحل اور صحیح معنی میں بروئے کار لایا جائے گا تو امید نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ یہ جماعت اور اس کی سرگرمیاں بڑی قلیل مدت میں روہنگیا قوم کے خزاں دیدہ گلشن میں باد بہار کے جھونکے بن کر آ سکیں گی، اگر چاہے خدا کرے۔

لیکن کیا کہوں اور کیسے بتاؤں؟ باتیں بڑی نازک اور دل خراش ہیں! کہ مولانا اور آپ کی جماعت آج جس زنداں نما ماحول میں محصور ہے، وہاں انسان تو کیا بلکہ باد بہار سے متاثر چڑیوں تک کے چہچہانے پر پابندیاں لگی ہوئی ہیں، وہاں بلبلیں ہیں مگر سدا خاموشی پر مجبور، کوئل ہیں مگر گلشن ہستی کے نام نہاد رکھوالوں کی ستم ظریفی سے پریشان ورنجور، وہاں صبح نو کی امید شاید کی جا سکتی ہو گی، لیکن ہر آن ہر کسی کی شام زندگی کے لئے دروازہ کھلا ہی کھلا رہتا ہے، قدرت نے اس گلشن کو نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ عام انسانوں کے لئے بھی سدا بہار بنایا ہے، ہر پل وہاں

خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتیں اور ساری کائنات میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں، لیکن نہ جانے اس پر کس عفریت کا سایہ پڑا ہے اور کس منحوس کی نظر لگ گئی ہے کہ۔۔۔۔۔۔تو اس دل شکن ماحول اور اس محبوسی کے عالم میں ایک انسان کرے تو کیا کرے؟ ویسے آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا اور آپ کے احباب کو وہاں سے نکلنا ہی ہوگا، ورنہ آپ اپنی ملت وقوم اور اپنے وطن عزیز کو باغ و بہار سے آشنا کرانے کے لئے جو امیدیں لئے جی رہے ہیں، وہ کبھی بھی (خاکم بدہن) بھر نہ آسکیں گی، اور آپ کے تمام کئے کرائے کام دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

ذہانت اور حاضر دماغی:

اس بات میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب ایک غضب کے ذہین انسان ہیں، قدرت نے آپ کے اندر صفتِ ذہانت کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے، طالب علمی کے زمانے سے آپ کی ذہانت کا چرچا ہمارے علاقے میں بڑے اور وسیع پیمانے پر ہونے لگا تھا، اور میرے ذاتی مشاہدہ اور علم کے مطابق یہ چرچا بالکل سچائیت اور حقیقت پر مبنی تھا، صرف ہمارے علمی اور تعلیمی حلقوں میں نہیں بلکہ ہمارے سیاسی حلقوں میں بھی آپ کی ذہانت کے چرچے عام طور پر ہونے لگے تھے، آپ نے ہمارے سیاسی حلقوں میں اپنی ذہانت وفطانت کا سکہ اس طرح جمایا کہ جس طرح ماضی میں ہمارے تعلیمی اور تدریسی حلقوں میں جمایا تھا، اور آپ کے احباب اور رفقائے کار کو ہمیشہ اس حوالے سے آپ کا گن گاتے ہوئے دیکھا گیا۔

ذہین ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مولانا محترم خاصے حاضر دماغ انسان بھی ہیں، اور اس کے ساتھ بڑے مناظر بھی، جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے دوران تعلیم آپ نے چند مناظرے کی مجالس میں حصہ لیا تھا، جہاں آپ کو بارہا کامیابی نصیب ہوئی تھی، اسی طرح فراغتِ تعلیم کے بعد میدین عمل وتطبیق میں بھی بعض بدعتی اور منحرف لوگوں اور گروہوں سے آپ نے اہل السنت والجماعت کی جانب سے مناظرہ ومباحثہ کیا تھا، اور ہر جگہ آپ نے اہل السنت والجماعت کے عقیدہ ومسلک کی سچائیت اور حقیقت کا لوہا منوایا تھا، اللہ تعالی کے فضل وکرم سے ان تمام مناظروں میں نہ صرف رسوائی کا سامنا کرنا نہیں پڑا، بلکہ ہر مرتبہ فتح وکامرانی نے آپ کا قدم چوما تھا، اور کبھی کبھار منحرفین میدان سے بھاگنے پر مجبور ہوگئے

تھے، اس حوالے سے زندہ مثال نہلا والے مناظرہ سے دی جاسکتی ہے، کہ چاٹگام سے آئے ہوئے دو بدعتی عالم نے میدان چھوڑ کر ایسا بھاگا کہ بعد میں انہوں نے وہاں آنے تک کا کبھی نام نہیں لیا۔

مولانا کی انشاء پردازی:

مولانا حسین احمد صاحب ہمارے بعض لوگوں کے نزدیک ادیب اور انشاء پرداز بھی ہیں، مگر ظاہر ہے کہ آپ کی جانب سے اس حوالے سے آج تک کوئی ضابطے کی چیز علاوہ چند خطوط اور مقالات کے منظر عام پر نہیں آسکی ہے، خطوط تو خطوط ہوتے ہیں، تاہم مقالات کا جہاں تک تعلق ہے کہ ان میں بالعموم کچھ ناقدانہ چیزوں کے ساتھ ہی ساتھ کچھ معارضانہ، مجذوبانہ اور خطیبانہ شان ہی نمایاں ہے، بات یہ ہے کہ آپ کی تحریر چاہے اردو میں ہو یا عربی میں ان میں ضروری سنجیدگی کے بجائے آپ کے مخصوص افتادِ طبع اور مزاج کی گرامی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، ان میں روانی اور طغیانی کے ساتھ طرز تحریر خطیبانہ ہے، تاہم یہ تو ظاہر ہے کہ آپ ان مذکورہ دونوں زبانوں کے اہل لسان میں سے نہیں ہیں، اس لئے آپ کی تحریر میں فنی اور لسانی فروگزاشتیں کافی حد تک پائی جاتی ہیں، لیکن یہ سچ ہے کہ آپ جو کچھ بھی لکھا کرتے ہیں بڑی روانی سے لکھتے ہیں، علمی اور فنی یا لسانی لحاظ سے جو کچھ بھی کیوں نہ ہو لیکن یہی سچ ہے کہ آپ کی تحریر میں حد سے زیادہ بانکپن نمایاں ہے۔

مولانا محترم سے صرف میں نے نہیں بلکہ بعض دیگر دوستوں اور خیر اندیشوں نے ماضی میں بارہا گزارش کی تھی آپ کسی ضروری موضوع پر لکھیں، تو ہمارے اصرار کے جواب میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ "لکھنا تو بڑی بات نہیں، لیکن میرے قلم سے جو بھی نکلے وہ عالمانہ اور فاضلانہ ضرور ہونا چاہئے، ورنہ لکھنے سے نہ لکھنا ہی بہتر ہے" ویسے آج تک آپ کے قلم شریف سے کوئی بھی عالمانہ اور فاضلانہ تحریریں منظر عام پر نہیں آسکیں۔

ادھر حال ہی کی بات ہے کہ آپ نے ناچیز سے ایک دو ٹیلفونک رابطے کے دوران فرمایا تھا کہ عربی میں تابعین اور اتباع التابعین کے حالات پر مشتمل میرے قلم سے ایک ضخیم چیز مسودہ کی شکل میں تیار ہو چکی ہے، علاوہ ازیں اردو زبان میں چند روہنگیا علمائے کرام اور مشہور اعیان پر ایک اور مسودہ بھی تیار ہوا ہے، آپ کے مطابق یہ ساری چیزیں آپ نے مکہ مکرمہ میں دوران نظر بندی لکھی تھیں، میں نے

بارہا عرض کی تھی کہ آپ میرے پاس ان مسودے کا ایک ایک نسخہ ارسال فرمائیں، لیکن باوجود چند مرتبہ یاددہانی کے آج تک میں ان نسخہ جات کے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا، بارہا جواب یہی ملتا ہے کہ یہ نسخے ابھی ابھی میرے پاس نہیں ہیں، اگر ہاتھ آجائیں تو تمہارے پاس بھیج دوں گا، اگر آپ کے بیان کے مطابق یہ چیزیں سامنے آئیں گی تو ایک بڑے کام اور شان کی بات ہوگی (۱) کاش اس وقت یہ چیزیں میرے سامنے ہوتیں تو اس باب میں آپ کی انشاء پردازی کے حوالے سے زیادہ کچھ لکھنا ممکن بھی ہوتا۔

جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے کہ مولانا محترم دیگر میدانوں کی طرح تحریر کے حوالے سے کافی غیور نکلے ہیں، آپ کے قلم شریف سے کوئی بھی چیز نکلے اور کوئی اس پر ٹوکنا بھی شروع کردے، آپ کی غیرت شاید یہ برداشت کرسکے گی، اور شاید یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی قلم کاری اور انشاء پردازی پر کوئی کبھی نظر ثانی کی بھی ہمت کرے، کیوں کہ اس حوالے سے آپ کو بارہا یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ''میری تحریریں میرے مرنے کے بعد چھپ کر منظر عام پر آسکیں گی'' تو آپ کی اس بات سے شاید یہی مطلب کا نکالنا آسان ہو کہ آپ زیادہ سے زیادہ لکھنا چاہتے ہیں، لیکن آپ کی تحریوں پر لوگ ٹوکے اور آپ زندہ بھی رہیں یہ آپ کے تقاضائے غیرت کی منافی بات ہے، پھر بھی آپ کے بعض خیر اندیشوں کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ کے اشہب قلم روہنگیا مظلوموں کے حوالے سے میدان میں دوڑے، اور دنیا یہ دیکھے کہ سرزمین ارکان نے کتنے بڑے پائے کے قلم کار پیدا کر کے میدان علم و فضل کا حوالہ کیا ہے، ویسے بھی ضروری ہے کہ ایک عالم و فاضل کے علوم وفنون رہتی دنیا کے لئے زندہ و جاوید اور سرمدی بن جائے، ورنہ ظاہر ہے کہ ہماری دیگر بڑے بڑے علماء اور فضلاء کی طرح آپ بھی

---

(۱) یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ محترم حضرت مولانا حسین احمد صاحب ایک طویل نظر بندی کے بعد حال ہی میں الحمد للہ تعالی رہا ہو چکے ہیں، اور اس نظر بندی کی بھی ایک طول طویل داستان ہے، جس کی کچھ جھلکیاں ان تحریروں میں کہیں کہیں نظر آئیں گی، مولانا محترم کے بیان کے مطابق مذکورہ چیزیں آپ نے دوران نظر بندی لکھی ہیں، فرماتے ہیں کہ جو آج کل ایک سعودی آدمی کے پاس محفوظ ہیں، خدا معلوم کہ قیامت تلک یہ تحریریں منظر عام پر آسکیں گی یا نہیں؟ تعالی آپ اور آپ کی ان تحریروں کا بھلا کرے، آمین۔

اپنے کفن سے لپٹے سارے علوم وفنون اپنی قبر کو لے جائیں گے، جو کم سے کم سرزمین ارکان اور وہاں کی اگلی نسلوں کے لئے خسارے کی بات ہوگی، اللہ مولانا کو توفیق سے نوازے، آمین۔ بہر حال مولانا محترم کی عربی دانی کم سے کم میرے ناقص خیال میں سرزمین ارکان کے علمائے کرام کے لئے قابل فخر ہے، آپ بڑی روانی سے عربی زبان بول لیتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ بسا اوقات عرب علماء وفصحاء تک کو زبان کے حوالے سے ٹوک لیتے ہیں، اسی طرح اردو بھی بڑی آسانی کے ساتھ پڑھ اور بول لیتے ہیں، تاہم ان دونوں زبانوں میں انشاء پردازی کا جہاں تک سوال ہے کہ پچھلی سطور میں جس طرح عرض کی گئی ہے کہ آج تک آپ کے مبارک قلم سے ایسی کوئی چیز منظر عام پر نہیں آئی یا نہیں آسکی کہ جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ آپ ان دونوں زبانوں میں بولنے کی حد تک جتنی مہارت رکھتے ہیں، اتنی ان میں لکھنے کی بھی قدرت رکھتے ہوں۔

علاوہ ازیں آپ برمیز اور انگریزی زبانیں بھی کسی قدر پڑھ بول لیتے ہیں، تاہم ان دونوں زبانوں میں آپ کو کبھی لکھتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا، پھر جہاں تک ہندی اور بنگالی زبانوں کا تعلق ہے کہ آپ یہ دونوں زبانیں تو سمجھ لیتے ہیں لیکن ان زبانوں کا ابجد تک آپ کو نہیں آتا، تاہم بنگالی زبان کے متعلق ایک تعجب کی بات ہے کہ آپ جس طرح عرض کی گئی ہے کہ بنگلا پڑھ لکھ تو نہیں سکتے لیکن ادیبوں کے ادبیات پر ایسے گرفت اور کلام کرتے ہیں کہ خود ادیب بھی متحیر اور ششدر رہ جاتے ہیں، راقم کی نظروں کے سامنے اس حوالے سے بہت سارے واقعات ہو چکے ہیں۔

نہ جانے کیوں کہ گستاخی معاف! کہ مولانا محترم لکھتے بہت کم ہیں، لیکن کہتے بہت زیادہ، آج یہ لکھنے کی امید ہے اور کل وہ لکھنے کی آرزو ستارہی ہوتی ہے، لکھنے کے لئے ایسے ایسے موضوعات سامنے لاتے ہیں کہ دل دہل جاتا ہے کہ آیا وہ کبھی آپ سے ہو بھی پائے گا کہ نہیں؟

مولانا محترم حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے حوالے سے فرمایا کرتے ہیں کہ ''لکھنے والوں کو چاہئے کہ ایک صفحہ لکھنے کے لئے سو صفحات پڑھیں، اور سو صفحات لکھنے کے لئے ہزار صفحات پڑھا کریں'' اس بات سے شاید مولانا کا مطلب یہی ہو کہ آج کل کے لکھنے والے پڑھتے بہت کم ہیں اور لکھتے بہت زیادہ۔ تاہم یہ الگ بات ہے کوئی آدمی زندگی بھر پڑھتے رہیں یا پڑھتے نہیں

لیکن پڑھنے کا ڈھونگ رچاتے پھریں، اور لکھنے کی طرح ایک صفحہ بھی لکھے بغیر اس جہان فانی سے رخصت لے چلے جائیں، یہ بھی تو کوئی اچھی بات نہیں ہے نا؟۔

ارکان کے حوالے سے مولانا کا کچھ سیاسی نقطۂ نظر:

روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے زمانے میں (جس میں مولانا مجلس عاملہ کے ممبر ہونے کے علاوہ ایک طویل زمانے تک اس کی روح رواں بھی رہ چکے ہیں) آپ یا آپ کی تنظیم کا نصب العین کھل کر سامنے آچکا تھا، وہ تھا ''حق خود ارادیت'' جس کے میرے نزدیک دیگر مفاہیم میں سے ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ارکان کے مستقبل کے حوالے سے خود ارکان کے باشندے ایک ریفرنڈم کے ذریعے فیصلہ کریں گے، جس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں کہ جن میں:

۱۔ ظاہر ہے کہ ارکان میں دیگر نسلی گروہوں کے ساتھ دو بڑی قومیں آباد ہیں، ایک کا نام مگھ جو بودھ مت کے پیرو اور دوسرے کا نام روہنگیا جو مسلمان ہیں، بالعموم ارکان میں ان کی مخلوط زندگیاں ہیں، اب حق خود ارادیت کی بنیاد پر جو ممکنہ ریفرنڈم ہوگا وہ رواداری اور بقائے باہمی کے اصول پر ہوگا، جس میں ارکان کے حوالے سے تقسیم کی کوئی بات نہیں ہوگی، بات ہوگی مل جل کر رہنے کی۔

۲۔ ارکان میں برمیوں کا جہاں تک سوال ہے کہ وہ تو ظاہر ہے کہ یہ لوگ یہاں کے لئے اجنبی ہیں، دخلاء ہیں اور غاصب ہیں، ان کو ایک نہ ایک دن یہاں سے نکل جانا ہی ہے، رہا دیگر نسلی گروہوں کے علی الرغم ارکان میں جو بڑی قومیں پائی جاتی ہیں، ان کے مابین جو ریفرنڈم ہوگا، آیا وہ دوقومی نظریات کے اصول پر تقسیم کی بنیاد پر ہوگا کہ نہیں؟ اور اگر رواداری اور بقائے باہمی کے اصول پر ریفرنڈم نہیں ہوگا تو ظاہر ہے کہ ارکان کو تقسیم کرنے کی بنیاد پر ہوگا، ایسے حالات میں ارکان تقسیم ہوکر دو الگ الگ ملک بن جائے گا، جہاں تعیین حدود کی باتوں کے علاوہ دیگر بڑی بڑی مشکلات سامنے آئیں گی، جنہیں حل کرنا بھی آسان کام نہیں ہوگا۔

مطلب یہی ہے کہ ''حق خود ارادیت'' کا نصب العین روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے علاوہ دیگر جماعتوں کا بھی نصب العین رہا ہے، جس کی تفصیلات میرے علم کے مطابق ارکان کے متعلق آج تک کھل کر سامنے نہیں آئی ہیں، اس لئے ہم ببانگ دہل یہ دعوی کرنے میں حق بجانب ہیں کہ حق خود

ارادیت والا نصب العین ارکان کے حوالے سے ایک غیر واضح نصب العین ہے، جس کی تفصیلات کو سامنے لانا کل بھی ضروری تھا اور آج بھی ضروری ہے۔

ویسے مولانا حسین احمد صاحب بھی ہماری برادری کے ایک سیاست دان اور رہنماء ہیں، اور روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن (RLO) پھر برما مسلم کانگرس (BMC) کے ایک لیڈر بھی، ماضی میں آپ کی جتنی بھی تقریریں سنی گئیں، اور ان سے اخذ نتائج کیا گیا، ان کے پیش نظر میرے لئے حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہو گیا ہے کہ آیا آپ ارکان کے حوالے سے رواداری اور بقائے باہمی کے اصول پر کاربند ہیں یا دوقومی نظریات کی بنیاد پر تقسیم کے خواہاں؟ کیوں کہ آپ کے ماضی کی بعض تقاریر سے یہ بوآتی تھی کہ آپ کل ارکان میں اسلام اور مسلمانوں کی بالادستی کے شدید خواہاں ہیں، اس کے برعکس بعض مجالس میں آپ کی تقاریر میں یہ رجحان بھی صاف نظر آتا تھا کہ آپ سرزمین ارکان میں رواداری اور بقائے باہمی کے اصول کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ کو کبھی برمیوں کی طرح مگھوں پر بھی نالاں اور برگشتہ برستے نظر آتے تھے، اور کبھی کبھار مگھوں کے ساتھ مصالحت پر آمادہ بھی نظر آتے تھے، اور کہوں تو در اصل بات ہی یہی ہے کہ ایک صرف مولانا تو کیا درحقیقت ارکان کی سیاست کے حوالے سے ہمارے سیاست دانوں کے بھی مابین ایک واضح نظریہ کا فقدان ہے، شاید اس وجہ سے بھی روہنگیا سیاست دانوں کے مابین ہم آہنگی نہیں ہو پائی جارہی ہو، جس کی شدید ضرورت تھی اور ضرورت رہے گی۔

ادھر ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے لیڈروں نے جماعت اسلامی سے متأثر ہوکر کل ارکان میں اسلام کی بالادستی لانے کی کوشش کی، اور ارکان میں فریضۂ اقامت دین کی راگنی الاپی تھی، تو مولانا حسین احمد صاحب نے ان سے یہ کہہ کر مخالفت کی کہ ہمارے جیتے جی ارکان میں جماعت اسلامی کے نظریات وافکار کا فروغ نہیں ہوسکتا، ویسے آپ حضرت مولانا مودودی صاحب کے افکار ونظریات سے متأثر شدہ جماعت کی کھل کر مخالفت کی تھی، اس دوران آپ کے دیئے ہوئے بیانات سے یہ سمجھنا کوئی دشواری نہیں تھی کہ آپ حضرت مولانا سید ابوالاعلی مودودی کے افکار ونظریات کو ایک صالح افکار ونظریات اور ان کے پیش کردہ بعض تصورات کو معیاری ماننے کے حامی نہیں تھے، آپ کی مجالس میں اس حوالے سے باتیں چھڑ جاتی تھیں، تو آپ جماعت اسلامی کے برعکس علمائے دیوبند

کے پیش کردہ افکار ونظریات کی حمایت میں باتیں کیا کرتے تھے، یوں بھی واضح ہے کہ مولانا محترم جماعت علمائے دیوبند کے حامی اور طرف دار عالم ہیں، کبھی کبھار آپ فرمایا کرتے تھے کہ ''ہم کسی بھی حالت میں علمائے دیوبند کی عزت وناموس کو خاک میں ملنے نہیں دیں گے، جان جائے تو جائے ہم اپنے اسلاف کی لاج ضرور رکھیں گے، علاوہ ازیں اس ضمن میں ایک بات یہ بھی ہے کہ آپ نے علمائے دیوبند کی حمایت میں چند مناظرے بھی کئے، جن میں ماشاء اللہ ہمیشہ آپ کی جیت کے ساتھ مخالفین کی ہار ہوئی تھی، خدا آپ کی حیات میں برکت دے، اور اسلاف کی لاج رکھنے کی مزید توفیق سے نوازے۔

نصابِ متداولہ پر آپ کی رائے:

آج تک یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں صدیوں سے درس نظامیہ کا جو نصاب چل رہا ہے، اس پر نظر ثانی کی بے حد ضرورت ہے، اس پر بعض لوگوں کا کہنا ہے اس کی اصلاح یا تطویر ہونی چاہئے، جب کہ بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ اس کو سرے سے تغییر وتبدیل کردینا چاہئے۔

اس حوالے سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے مختلف بیانات سے آپ کا نقطۂ نظر میرے سامنے کھل کر سامنے آچکا ہے، ان بیانات کے مطابق آپ اس نصاب کو کلی طور پر تبدیل یا تغییر کے حامی نہیں ہیں، لیکن اس پر امعان نظر سے کام لے کر اسے زمانے کے تقاضے اور حالات کی نزاکت کے مطابق کرتے ہوئے اس کی اصلاح کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں، یوں آپ کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس باب میں زیادہ سے زیادہ گفتگو کی اشد ضرورت ہے، اس حوالے سے میں نے ایک مقالہ ''مدارس اسلامیہ کے نصاب ونظام اور جدید تقاضے'' کے عنوان سے لکھا، جو الحمد للہ ناظرین کرام کے ہاتھوں ہاتھ پہنچ کر بے حد مقبول ہو چکا ہے، یہ مقالہ مولانا کی نظر سے بھی گزرا ہے، آپ نے اس مقالہ کے حوالے سے کچھ اصلاح کے ساتھ راقم کو داد تحسین بھی دی ہے۔

یہاں صرف مزید اتنی سی بات عرض ہے کہ مولانا محترم اپنے عہد شباب میں ہمارے مدارس دینیہ میں منطق کی جن کتابوں کی تعلیم دی جاتی ہیں ان پر نہایت نالاں اور برگشتہ تھے، لیکن عمر کے ساتھ آپ کی اس برگشتگی میں کمی محسوس کی گئی ہے، اور فرمایا کرتے تھے کہ منطق کے بعض مقالے اور مباحث پر

مشتمل بعض کتابیں درس میں رکھنے کی ضرورت بھی ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ آپ کا یہ بھی فرمانا ہے کہ نصاب متداولہ میں تفسیر جیسی لازمی اور لابدی چیزوں پر ہمارے مدارس میں بہت کم توجہ دی جاتی ہے، اس لئے مدارس دینیہ کے لئے لازمی ہے کہ تفسیر جیسے اہم موضوع پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے، اس سلسلے میں آپ نے بعض ارباب فکر وعمل سے ضروری گفتگو بھی کی تھی، جو اس زمانے کے مطابق خاصی بارآور رہی تھی، لیکن بعض وجوہات کی بنیاد پر بعد میں اس پر مزید عمل درآمد نہیں ہو سکا تھا۔

مولانا ایک جواں مرد مناظر ہیں:

مولانا حسین احمد صاحب ایک دلیر، بے باک، جواں مرد اور مثالی مناظر عالم دین ہیں، اس حوالے سے پچھلی سطور میں کچھ باتیں بکھرے ہوئے انداز میں گزر بھی چکی ہیں، بات یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں بدعتیوں اور بعض منحرف گروہوں سے بہت سارے مناظرے کئے تھے، اور جہاں بھی آپ نے مناظرے کئے، فتح وکامرانی نے آپ کا قدم چوما تھا، اس حوالے سے ایک بات کا تذکرہ یہاں کردوں تو شاید ہی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ آج سے چند سال پہلے حجاز مقدس (بطور خاص مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور جدہ) میں ایک فتنہ نے سر اٹھایا تھا، کہ روہنگیا برادری میں سے ایک چھوٹی سی ٹولی نے حجاز مقدس کے کچھ علماء نما منحرف عناصر کے شہ پاکر اور ان کے مخصوص تعاون سے مذہب احناف اور بطور خاص علمائے دیوبند کو سب وشتم اور گالم گلوج کا نشانہ بنانا شروع کردیا تھا، اور ان کی توہین وتذلیل میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی تھی، اور یہ ٹولی اتنی اترانی شروع کردی تھی کہ جن کو دیکھ کر کسی بھی ایماندار انسان کی رگ حمیت وغیرت، عقیدت ومحبت میں آگ سلگ سکتی تھی۔

ایسے حالات میں مولانا حسین احمد صاحب حجاز مقدس تشریف لے گئے، اور آپ کے چند دوستوں اور رفقائے کار نے اس شیطانی وابلیسی فتنے کی طرف توجہ دلائی، ویسے آپ اس فتنے کی سرکوبی کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

لیکن یہاں ایک افسوس کی بات بھی ہے کہ اس شیطانی تولی کے جو بھی لوگ تھے، ان کی اکثریت یا تو طلبہ اور وہ بھی ثانوی درجے کے تھے، اور جو علماء نما تھے وہ بھی تقریبا علم وفن سے عاری، تو ایسے لوگوں سے مناظرہ کرے بھی تو کیا خاک کرے؟ پھر مولانا نے ان کو مناظرے کی برملا دعوتیں دیں، لیکن

وہ حاضر ہی نہیں ہوتے تھے، آخر کاران کو ایک مجلس میں حاضر ہونے پر مجبور کیا گیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی حاضر ہوئے، ابھی بات شروع ہوئی تو وہ لوگ آپ کے سامنے گفتگو ہی کیا کرتے اور زبان ہی کیا کھولتے بلکہ آپ نے جس علمی زبان میں گفتگو شروع کی وہ بھی ان کی سمجھ سے باہر تھی، آخر کار وہ سارے خجل ہو بھاگ گئے تھے، ویسے آپ کی کوشش سے اس فتنہ کی خاصی سرکوبی ہو چکی تھی۔اس حوالے سے میں نے ایک جگہ میں لکھا تھا کہ:

''گئی صدی کی آخری دہائیوں سے لے کر سرزمین مقدس میں روہنگیا برادری میں پائے جانے والے چندان طالب علموں جو یا علم وفن کے اعتبار سے ناپختہ تھے، یا سرزمین مقدس میں پائے جانے والے نام نہاد چند شر پسند شیوخ سے متأثر تھے نے شدید قسم کے فتنے کھڑے کئے رکھے تھے، جن کے سدباب کے لئے برصغیر کے چند بڑے بڑے علمائے کرام نے کوششیں کی تھیں، جن میں بنگلا دیش کے حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب (سابق نائب مہتمم جامعہ اسلامیہ پٹیہ) پیش پیش تھے،اس سلسلے میں ارکان کے اور ایک عالم صاحب نے بھی اپنے انداز میں کوشش کی تھی،لیکن ان کو اس حوالے سے خاصے ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا تھا''۔

اس سلسلے میں ایک بات کا تذکرہ کردوں کہ مولانا حسین احمد صاحب کی طرح ہماری برادری کے ایک مولانا صاحب جن کا نام یہاں لینا مناسب نہیں سمجھ رہا ہوں نے بھی اس مذکورہ فتنے کی سرکوبی کے لئے کوشش کی تھی لیکن ان دونوں کی کوششوں میں ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ مولانا حسین احمد صاحب کی کوشش عین حکمت اور دانائی پر مبنی تھی، آپ نے حالات کے تقاضے اور وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کافی بصیرت اور فراست سے کام لیا تھا، جب کہ مؤخر الذکر مولانا صاحب کے اندر سرے سے ایسی صلاحیت اور فہم وفراست کا فقدان تھا، یوں کام بھی ہوا اور مولانا حسین احمد صاحب ان شر پسندوں کی شرارت سے کسی قدر بچنے میں ایک وقت کے لئے کامیاب ہو گئے تھے، جب کہ ان مولانا صاحب کو ان شر پسندوں نے عین موقع پر ایسا پھنسایا کہ اور تو اور ان کو سعودی عرب میں تقریباً پانچ سالوں تک قید وبند کی زندگی گزارنی پڑی تھی، بہر حال پھر بھی مولانا صاحب داد تحسین کا مستحق ہیں کہ انہوں نے

فتنے کے سدباب کے لئے کوشش کی، اور اس راہ میں اپنی زندگی کا ایک حصہ بطور نذرانہ پیش بھی کیا تھا۔

مولانا حسین احمد صاحب کی زبان میں روانی کے ساتھ ساتھ ضروری مقامات میں طغیانی بھی ہوا کرتی ہے، علاوہ ازیں باتوں اور گفتگو میں تسلسل اور ترتیب بھی، اس حوالے سے ہماری برادری کا وہ مولانا صاحب (جن کا تذکرہ ابھی ابھی گزر چکا ہے، اور جس کے متعلق اس کے بعض حواریوں کا دعوی ہے کہ وہ ایک بڑے عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مجاہد، مناظر، باحث، منطقی اور کلامی ہیں) کے کلام اور گفتگو اور جدلیاتی مباحث میں ترتیب شاید ہی پائی جاتی ہو،لیکن تسلسل، روانی اور طغیانی نہیں پائی جاتی ہے، مولانا کے مقابلے میں یا دوسرے الفاظ میں آپ کی بہ نسبت ان مولانا صاحب کی زبان میں ایک قسم کی لکنت اور گونگا پنی پائی جاتی ہے، اور کبھی کبھار نا قابل صبر حد تک ان کی گفتگو میں بھاری پن اور ٹھہراؤ پایا جاتا ہے، شاید ان کم زوریوں کی وجہ سے وہ دنگل کے معرکوں میں ناکام ہوا کرتے تھے، پھر بھی وہ اور ان کے بعض ناسمت شناس حواریوں کا دعوی تھا اور ہے کہ وہ مولانا صاحب بڑے کامیاب مناظر ہیں، اور صرف بات اتنی ہی نہیں ان کے دعوی کے مطابق ان جیسے عالم ارکان کی کسی ماں نے پیدا ہی نہیں کیا ہے،لیکن میں نے تو ذاتی طور پر ان کو کسی بھی معرکہ میں آج تک سرخرو ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، خدا ان مولانا صاحب کی حیات میں برکت دے، اور اگلے دن اگر زندگی ہے تو دنگل سے سرخرو ہو کے واپس آنے کی توفیق سے نوازے۔

مولانا حسین احمد صاحب کی اس کوشش میں آپ کے استاد حضرت مولانا مفتی عبدالرحمن صاحبؒ سابق نائب مہتمم جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے تعاون اور ان کی نیک دعائیں شامل حال تھیں، مفتی صاحب نے آپ کو نہ صرف تعاون کیا بلکہ آپ نے مولانا محترم کے سر پر ایک طرح کی ذمے داری ڈالی تھی کہ کسی بھی طریقے سے اس فتنے کی سرکوبی کی جائے، تاکہ سرزمین پاک میں علمائے اہل السنت والجماعت کی لاج رہے۔مفتی صاحب کے علاوہ اس حوالے سے مولانا محترم کو حضرت علامہ مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) کی تائید اور دعائیں بھی حاصل تھیں، اس حوالے سے میں نے ایک دوسری جگہ میں یوں لکھا تھا کہ:

''جہاں تک میرا علم ہے کہ ۲۰۰۳ء کے دوران اور اس کے بعد کے عرصے میں

حضرت مولانا مفتی عبدالرحمن صاحب ہاٹھزاروی کے شہ پر یا ان کے بھرپور تعاون سے مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب بھی ان سر پھرے نوجوانوں کی جانب سے اٹھائے گئے فتنوں کے سدباب کے لئے میدان میں کود پڑے، جس میں آپ کے مرشد حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) کی دعائیں وتوجیہات بھی بڑی حد تک تھیں،تو آپ نے ان شرپسندوں پر ایسا وار کیا کہ جس کی تاب نہ لاکر ان شرپسندوں کی اکثریت تائب ہو گئی،اور ان میں سے کٹر قسم کے نوجوان جو دراصل کسی مفاد پرستی کے دلدل میں پھنس چکے تھے،وہ بھی ایک طویل مدت تک کے لئے میدان سے غائب ہو گئے تھے''۔

دراصل انسانی زندگی میں پیٹ بھرنے کی مصیبت بھی بسا اوقات انسان کو راہ اعتدال سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیتی ہے، ہماری برادری کے ان شرپسند نوجوانوں کے ٹولوں کی جو حالت تھی،اب بھی ان کی یہی حالت جوں کا توں باقی ہے، مصیبت یہی تھی کہ ان میں سے بعض لوگ شرپسند عناصر کے شکار تو تھے ہی، اور ان میں سے بعض لوگ قادیانیوں، احمدیوں، پرویزیوں اور تو اور بعض ذرائع کے مطابق انسانیت کے دشمن یہودیوں کے نرغے میں بھی آ چکے ہیں، جو اسلام اور انسانیت کے دشمنوں کے چیلے، گماشتے اور حواری بن کر اسلامیان ارکان پر پے در پے حملوں میں ملوث ہیں،کسی زمانے میں ان کی یہی شرپسندی سعودی عرب میں پائی جانے والی ہماری برادری تک محدود تھی،لیکن اب تو بنگلا دیش اور پاکستان کے علاوہ اندرون وطن ارکان میں بھی ان کی شرپسندی پھیلی ہوئی ہے، خاص طور پر ہماری برادری کے مابین ایسے ایسے فتنے اٹھاتے پھر رہے ہیں کہ جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس حوالے سے سب سے بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ آج سے چند سال پہلے سے ہماری برادری کے چند ارکانی علماء نما لوگ اپنی نجی زندگی کو پر رونق دیکھنے یا بنانے کی خاطر اندرون وطن یا سرحدی علاقہ جات میں اس فتنے کی پرچار میں ملوث ہیں، خدا ان کو ہدایت دے۔

مولانا کی ایک تعمیری سوچ:

مولانا حسین احمد صاحب جس آن بان کے عالم دین ہیں، ان سے کوئی تخریبی سوچ تو ہو ہی نہیں سکتی،

جہاں تک دیکھا اور اندازہ کیا گیا کہ آپ کی سوچ وبچار ہمیشہ تعمیری ہوا کرتی ہے، جو ایک صحیح معنی کے عالم دین سے متوقع ہے،اس حوالے سے یہاں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں کہ:

''غالباً ۱۹۹۳ء کے موسم بہار کا واقعہ ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب بعد نماز عصر اپنے چند شاگردوں جن میں راقم بھی تھا، ہوا خوری کے لئے اپنی رہائش گاہ سے نکلے، دراں حالیکہ آپ کی رہائش گاہ چاندگاؤں، چاٹگام بلاک بی کی تیسری گلی پر تھی، ابھی ہم آپ کے ساتھ راستے پر ٹہل رہے تھے،ادھر سامنے سے آنے والا ایک فقیر منش (بھکاری) جس کی عمر تقریباً ستر سال سے کم نہیں تھی،اور جس کے چہرے پر سفید اور متدین داڑھی بھی تھی نے آپ کے آگے ہاتھ پھیلایا تو آپ اور آپ کے بعض شاگردوں نے اس فقیر کی بساط بھر خدمت کی،اب اس فقیر نے اپنی زبان کھولی اور کہنے لگا کہ ''یہ دنیا بہت بری ہو چکی ہے، اگر مجھ میں شکتی ہوتی تو میں اس دنیا کو الٹ دیتا'' اب آپ سے رہا نہیں گیا اور اس سے پوچھا کہ باباجی کیا وجہ ہے کہ آپ دنیا اور اہل دنیا سے اتنے نالاں اور برہم ہیں؟ تو اس فقیر نے بولا کہ مجھے اس جہاں میں ایک بھی انسان نظر نہیں آتا، اب اتنی سی بات کے اختتام پر آپ نے اس فقیر کو کچھ مثبت انداز میں سنجیدگی کے ساتھ نصیحت کرتے ہوئے رخصت کیا، پھر ہمیں فرمانے لگے کہ دیکھو بھائیو! دنیا اور اہل دنیا کے متعلق یہاں اور تو اور ایک فقیر آدمی تک کی کیا سوچ ہے، ظاہر ہے کہ وہ ایک بھکاری ہے، عمر رسیدہ اور متدین داڑھی والا ہے، اس ایک آدمی کے تخریبی ذہن سے آپ اور ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ دنیا میں تخریبی ذہن رکھنے والے انسان کتنے ہوں گے، اور ان کے مقابلے میں تعمیری ذہن رکھنے والے کتنے، آج اس طرح کی تخریبی ذہنیت کی وجہ سے ہمارے معاشرے ہر کجا خسارے پر خسارے اٹھا رہے ہیں''۔

اس فقیر منش کے ساتھ مولانا کی گفتگو اور اس کے معابعد آپ کے مذکورہ بیان نے میرے دل پر خاص اثر کیا تھا، الحمدللہ اس کا اثر تادم تحریر باقی ہے، اور خدا کرے تو زندگی بھر باقی رہے گی، سچ بتاؤں تو

بات یہی ہے کہ اس واقعہ سے پہلے میرا بھی ذہن کچھ اس طرح کا تھا کہ اس جہاں میں اچھے انسانوں کی تعداد کم اور برے لوگوں کی زیادہ ہے، مگر حقیقت میں بات ایسی بالکل نہیں ہے، بلکہ سرے سے اس کی برعکس ہے، بھلا! بروں کی تعداد اگر ایک منٹ کے لئے زیادہ بھی مان لی جائے، تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس فقیر آدمی کی ذہنیت کے مطابق اس جہاں کو زیروزبر کر دیا جائے۔

کون نہیں جانتا کہ اس جہاں میں جتنے بھی انبیاء علیہم السلام تشریف لائے، اور جتنے بھی اولیاء اللہ اور صلحاء گزرے اور جتنی بھی نفوس قدسیہ اہل دنیا اور مخلوق خداوندی کی خدمات انجام دے کر راہی ملک بقاء ہوئے، وہ سارے کے سارے تعمیری ذہن کے تھے، دنیا اور اہل دنیا کی خیر خواہی ان کا مقصد تھا، آج کس کی جرأت ہوسکتی ہے کہ ان نفوس قدسیہ میں سے ایک کو بھی تخریبی ذہن کا ثابت کرے، اور یہ ثابت کرے کہ ان کی زندگیاں اور سرگرمیاں مخلوق خداوندی کی عدم خیر خواہی پر مشتمل تھیں۔

غرض مولانا محترم کی تقریر سے راقم نے زندگی بھر کے لئے ایک اہم اصول پالیا، کہ انسان کو اس جہاں میں ہمیشہ ہمیشہ تعمیری ذہنیت کا ہونا چاہئے اور تخریبی ذہنیت رکھنا تو دور کی بات بلکہ تخریبی ذہنیت رکھنے والوں کو راہ راست پر لانے کی جدوجہد اور کوششیں کرنی چاہئے، جو در اصل نفوس قدسیہ (جن میں تمام انبیاء، اولیاء، اور صلحاء شامل ہیں) کے نقوش قدم پر چلتے ہوئے اس جہاں اور جہاں والوں کی خیر خواہی کی بنیاد پر ہر حال میں بھلائی کے لئے سوچنا چاہئے۔

بعض عادات واطوار:

مولانا حسین احمد صاحب سچی بات کے (چاہے اپنے باپ کے منہ پر کیوں نہ کہنا پڑے) بڑے رسیا ہیں، اس حوالے سے آپ کے بعض احباب، رفقائے کار اور چاہنے والوں کی یہی شکایت ہوتی ہے کہ آپ بڑے منہ پھٹ انسان ہیں، آپ کو جہاں تک میں نے دیکھا کہ آپ کی بعض دل شکن باتیں بسا اوقات لوگوں کی دل آزاری کا سبب بھی بن جاتی ہیں، جن کی وجہ سے آپ کے انگنت احباب اور رفقائے کار اور آپ کو دل سے چاہنے والے آپ سے بگڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روٹھ گئے تھے، کبھی کبھار آپ کو دیکھا بھی گیا تھا کہ آپ کی ان دل شکن باتوں کی وجہ سے جو لوگ آپ سے روٹھ جاتے ہیں ان پر آپ افسوس بھی کیا کرتے ہیں، اور تو اور آپ کو اس بات کا

اعتراف بھی ہے کہ آپ کی بعض باتیں لوگوں کی دل آزاری کا سبب بن جاتی ہیں، لیکن کیا کریں کہ تیر تو کمان سے نکل چکا ہوتا اور ٹھیک نشانے پر جاگزین بھی ہو جاتا ہے، ایسے حالات میں جتنے بھی علاج کئے جائیں بے حاصل اور بے سود ہوا کرتا ہے۔

آپ کی زندگی میں آپ کے کتنے احباب اور رفقائے کار تھے، جنہوں نے آپ کی ایسی دل شکن، دل آزار اور ناعاقبت اندیشانہ باتوں ہی کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے آپ سے روٹھ کر کسی دوسری اندھیر نگری میں گھر بسا لئے تھے، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بعض حضرات آپ کے خلاف بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اور ہر محاذ پر آپ کے خلاف بھی اتر آئے ہیں، جن کی وجہ سے بعض حالات میں آپ کو کافی خسارے اور نقصانات کا منہ بھی دیکھنا پڑا تھا۔

آج کل بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ماشاء اللہ تعالی آپ اپنی اس قسم کی حالت پر کافی سدھار لا چکے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ ”میری آرزو یہی ہے کہ میری وجہ سے کسی کا کبھی اور کہیں دل نہ دکھے، اور میری کسی بات اور کوئی حرکت لوگوں کی دل شکنی اور دل آزاری کی باعث نہ بننے پائے“ حال ہی کی بات ہے کہ اس حوالے سے آپ کو کافی حد تک بدلا سا نظر آیا، اور دعا ہے کہ خدا اپنے خاص فضل و کرم سے آپ کو مزید توفیق سے نوازے۔

اسی طرح مولانا محترم کے بعض احباب اور خیر اندیشوں کی آپ سے یہی شکایت بھی رہی ہے کہ آپ بسا اوقات بلا وجہ لوگوں پر گرفت اور غیر ضروری تنقیدیں کیا کرتے ہیں، آپ جس پائے کی شخصیت ہیں، آپ اپنے قریبی معاصرین میں سے شاید ہی کسی کو اپنے معیار پر اترے ہوئے پاتے ہیں، چاہے کہ ان معاصرین کا تعلق کسی میدان کارزار سے ہو یا کہ بزم علم وادب سے، کوئی بھی آپ کے معیار پر اترنے نہیں پاتا ہے، یوں ظاہر ہے کہ انبیائے کرام کے علاوہ کون سا انسان اس جہاں میں کامل ومکمل ہوا ہے؟ عام انسان تو اس کے جوہر میں غلطیوں، خامیوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کا معجون مرکب ہوتا ہے۔

بھلا تنقید اگر مثبت ہو تو کوئی بری چیز بھی کیسی ہوسکتی ہے؟ لیکن اس کا ایک سالم اور معتدل اصول اور کارآمد ضوابط ہوتے ہیں، اور تنقید برائے تنقید ہونے کے بجائے تنقید برائے اصلاح وتعمیر ایک لازمی امر ہے، ورنہ ناقد بذاتِ خود ایک مقام پر جا کر دوسروں کی تنقید کا نشانہ بن جاتا ہے،

اور اس کی تنقید اس کی زندگی کے لئے ایک زہر ہلاہل ثابت ہوجاتی ہے، آج کی دنیا میں صرف اور صرف تنقید خود ناقد کے لئے کوئی اچھی چیز نہیں رہی ہے، تنقید برائے رشد و ہدایت، اصلاح و خیر خواہی ضرور بھلی مانی جاتی ہے، لیکن بعض خیر اندیشوں کے مطابق مولانا حسین احمد صاحب کی کوئی بھی گرفت و تنقید بس تنقید برائے تنقید ہوا کرتی ہے، جس سے لوگوں کے فائدے کے بجائے الٹے نقصان یقینی ہے، اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ایسی تنقید کی وجہ سے خود آپ کی ذات بھی پریشانیوں کی شکار ہوجاتی ہے، بعض احباب کا کہنا ہے کہ آج کل آپ کی ایسی بے جا تنقید اور گرفت کرنے والی ذہنیت میں کافی کمی آچکی ہے، خدا کرے کہ بات کلی طور پر صحت پر مبنی ہو۔ علاوہ ازیں مولانا کی بعض دیگر عادات واطوار پر کچھ باتیں ہیں کہ:

۱۔ مولانا حسین احمد صاحب بڑے نستعلیقی ذوق کے عالم ہیں، آپ اپنی نجی اور خانگی زندگی میں ہوں یا اجتماعی اور سیاسی زندگی میں، غرض ہر کجا ایک نستعلیقی ذوق کا انسان ثابت ہوئے ہیں، آپ اپنے گھر کی ہر ایک چیزوں کو برمحل مقام پر رکھنے کے عادی ہیں، گھر صاف ہو اور کتابوں کی الماریوں کے علاوہ تمام الماریاں شفاف ہونا چاہتے ہیں، کتابوں کی الماریوں میں اگر کسی نے کوئی کتاب ٹھیک سے اور برمحل مقام پر نہیں رکھی تو آپ خاصے پریشان ہوجاتے ہیں، اور اس کی اس کرتوت کو بدذوقی سے تعبیر کرتے ہیں، میرے نزدیک یہ ایک اچھی بات ۔

۲۔ مولانا کی ایک عادت شریفہ یہ بھی ہے کہ آپ اپنی کسی بھی گفتگو کے دوران ہر سامع سے چاہتے ہیں کہ ہمہ تن گوش ہو کر سنے، دوران گفتگو اگر کسی پرندنے بھی پر مارا، یا کسی نے بے جا حرکت کی تو آپ کے چہرۂ زیبا میں ناراضگی، خفگی اور برہمی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں، اور بسا اوقات آپ اپنی خفگی کا برملا اظہار بھی کردیتے ہیں، اور اگر کوئی قریبی ساتھی ہو تو ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لیا کرتے ہیں۔

۳۔ مولانا کو وقت کے پابند بہت ہی کم دیکھا گیا، صرف یہی نہیں بلکہ میرے خیال میں آپ وقت کے ساتھ چلنے کے بجائے وقت کو اپنے ساتھ چلانے کے خواہش مند ہیں، ویسے کوئی بھی کام آپ سے بروقت یا وقت کے مطابق ہو نہیں پائے تھے، کم سے کم آج کا کام کل کے لئے اور کل کا کام مدتوں کے لئے ٹلتا رہتا ہے، میرے خیال میں آپ جیسی ایک بڑی شخصیت کی یہ ایک بڑی کمزوری ہے، جو کبھی

بھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی، خدا کرے کہ آپ کو اس کا احساس بھی ہوجائے، یاد رہے کہ یہ شکایت آپ سے صرف میری نہیں، اس حوالے سے چند دیگروں کو بھی ایسی شکایتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

۴۔ بایں ہمہ مولانا محترم احقاق حق اور ابطال باطل کے حوالے سے نہایت سخت مزاج کے انسان ہیں، اس باب میں کسی بڑے سے بڑے قوت دار اور مال دار اور کسی بھی صاحب شوکت واقتدار کی پرواہ بالکل نہیں کرتے ہیں، سچی بات جو آپ کی دانست میں سچی ہوتی ہے برملا کہہ دیتے اور سب کے سامنے اظہار کردیتے ہیں، اس ضمن میں جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ چھوٹے بڑے اور امیر و غریب کو ایک ہی سطح پر رکھنے کے عادی ہیں، غرض کلمۂ حق کے مقابلے میں کسی کا رورعایت کرنا اور اس حوالے سے کسی کے سامنے جھکنا آپ سرے سے جانتے ہی نہیں ہیں۔

۵۔ مولانا محترم سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص آپ کے سامنے اگر کوئی غلط بات یا کوئی غلط لفظ بول دیتا ہے تو کسی نہ کسی طرح سے آپ اس کی اصلاح یا غلط کی جگہ صحیح بتادینے کو بروقت کوشش کرتے ہیں، بسا اوقات آپ کی یہی عادت شریفہ آپ کے غیروں کے سامنے بھی ظاہر ہوجاتی ہے، غرض آپ کسی بھی غلط بولنے والے کو چھوڑتے نہیں ہیں، آپ کی اس طبیعت سے بعض لوگ پریشان بھی ہو جاتے ہیں، شاید آپ کو اپنی اس عادت سے پیدا ہونے والے نتائج کا علم بھی ہو، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی پرواہ بہت کم ہی کیا کرتے ہیں۔

۶۔ مولانا نہایت نازک مزاج اور کسی قدر غصیلے انسان نکلے ہیں، کسی کی ذرا سی خلاف طبیعت بات اور حرکت سے آپ کا موڈ یا طبیعت فوراً بدل جاتی ہے، ویسے آپ بڑی جلدی سے تیش میں آجاتے ہیں، سچ بتاؤں تو بات یہی ہے کہ آپ کسی قدر جلالی طبیعت کے انسان ہیں، اصل میں بات یہ ہے کہ آپ کے مزاج اور افتاد طبع میں کافی حد تک تضاد پایا جاتا ہے، کبھی کبھار ہلکی سی بات کو بھی برداشت کرنا آپ کی بس کی بات نہیں ہوا کرتی ہے، جب کہ اس کے برعکس کبھی کبھار آپ کو غایت درجہ متحمل، حلیم الطبع، متواضع اور نرم مزاج کا انسان نظر آتا ہے، اور مؤخر الذکر ایسے حالات میں آپ ہر ایک کی سنتے اور اس کی ذہنی سطح پر اتر کر گفتگو کرتے ہیں، اور تیز کلامی اور تلخ نوائی سے کوسوں دور ہوجاتے ہیں۔

ایک فقیر نما جاہل کے ساتھ:

برصغیر ہندو پاک میں عموماً اور بنگلا دیش میں خصوصاً فقیر نما جاہلوں اور اوباشوں کی کوئی بھی کمی نہیں ہوتی ہے، یہاں ایک مصیبت یہ بھی ہوتی ہے کہ عموماً جہلاء ان فقیر نما اوباشوں کو اللہ تعالی کے ولی اور برگزیدہ ہستی سمجھ کر ان کے سامنے منتیں کیا کرتے ہیں، جس سے فائدہ اٹھا کر یہ اوباش لوگ ہر کجا انسانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو کچھ دینے سے مرادیں پوری ہو جاتی ہیں۔

ایک روز کا واقعہ تھا کہ میں مولانا کے ساتھ ایک عام گاڑی پر سوار ہو کر چاٹگام شہر کے اندر کہیں جا رہا تھا، ہمارے بغل والی کرسی پر ایک فقیر نما جاہل (دیکھنے میں اس کی شکل وصورت وہی تھی، جو عام طور پر ایسے بدبخت لوگوں کی ہوتی ہے) بھی سوار تھا، جو لوگوں سے پیسے مانگ رہا تھا اور عام لوگ بھی اس کو کچھ نہ کچھ دے رہے تھے، آخر میں اس نے مولانا کے سامنے ہاتھ پھیلایا، اور ایک عجیب انداز میں کہنے لگا کہ مجھے دو تو تمہاری مرادیں پوری ہو جائیں گی، اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ تم مجھے دو تو تمہاری مراد پوری ہو جائے گی، آپ کا یہ جواب سن کر وہ فقیر نما جاہل بھڑکا، اور کہا کہ اگر نہیں دو گے تو میں تجھے جلا کر خاکستر کر دوں گا، جواب میں آپ نے بھی وہی فرمایا، اب وہ بڑے خفیف ہو کر گاڑی سے اتر گیا، اب آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ ایسوں کی راہ روکی جائے اور ان کو راہ راست پر لانے کی کوششیں کی جائیں ورنہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ لوگ انسانوں کو گم راہ کر کے صرف اور صرف پیٹ بھرنے کی خاطر کیا کیا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہیں، ہمیں دین اسلام کو سمجھنا چاہئے، ورنہ یہ لوگ انسانوں کو مزید گم راہ کریں گے۔ مولانا کی تقریر سن کر سوار لوگ بڑے محظوظ ہوئے، ان میں سے بعض حضرات یہاں تک کہنے لگے کہ عالم ہو تو ایسا، کاش ہمارے ملک کے سارے علمائے کرام ایسے ہوتے تو ہماری حالت کب کی بدل چکی ہوتی، افسوس ہے کہ خود علمائے کرام میں بھانت بھانت کے عقائد کے حامل پائے جاتے ہیں، ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ جو ان جیسے لوگوں کی حمایت پر تلے ہوئے ہیں۔

کوکس بازار کی ریسٹورنٹ میں:

ایک روز کا واقعہ تھا کہ میری ملاقات محترم مولانا حسین احمد صاحب کے ایک شاگرد سے ہوئی، جس نے عرصۂ دراز تک آپ کے قریب رہ کر آپ سے استفادہ کیا تھا، آج کل اندرون وطن میں ہیں، دینی کاموں کے ساتھ ماشاء اللہ جڑے ہوئے ہیں، جنہوں نے کوکس بازار کی ایک ریسٹورنٹ میں اپنی

آنکھوں دیکھا حال راقم سطور سے یوں بتایا ہے کہ:

''ایک روز میں مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے ساتھ کوکس بازار کی ایک اچھی اور معروف ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہا تھا، ہمارے کھانے کے دوران سامنے والے میز پر چند سر پھرے نوجوان بھی کھانا کھا رہے تھے، اور ساتھ ساتھ ایسی رنگ رلیاں بھی کر رہے تھے جو عام جوانوں اور نوجوانوں کی عادت ہوتی ہے، جس سے ایک شریف انسان کو بھور سا محسوس ضرور ہوا کرتا ہے، اب آپ نے اپنے کھانے کی فراغت کے آخر میں سنت کے مطابق اپنا برتن صاف کیا، اور انگلیاں بھی چاٹیں، یہ دیکھ کر یہ نوجواں ہنس رہے تھے، اور تمسخر بھرے انداز میں اپنی اپنی جسمانی حرکتوں کے ذریعہ یہی بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ مولوی لوگ کھانے کے حوالے سے کتنے نادان اور غیر مہذب ہوا کرتے ہیں، کھانے بھی سب کچھ کھا لیتے اور آخر میں برتن اور انگلیاں تک نہیں چھوڑتے، مولانا ان کی حرکات وسکنات کو بڑے پرسکون انداز میں دیکھ رہے تھے، یہ جتنے تمسخر کر رہے تھے، آپ برتن اور انگلیاں چاٹنے میں اتنی دیر کر رہے تھے، اور آپ نے اپنے کھانے سے فراغت کے بعد ان نوجوانوں پر برسنا شروع کر دیا، اور بتایا کہ کیا تم مسلمان نہیں ہو؟ کیا تمہیں تمہارے ماں باپ اور تمہارے استادوں نے دین کے متعلق کچھ بھی نہیں سکھایا؟ یہ ایک مسلم ملک ہے، یہاں تمہاری اتنی جرأت کہ تم سر عام سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑا رہے ہو؟؟ ویسے الحمد للہ کہ مولانا کا ان پر یہی برسنا کام آیا، اور سارے شرمندہ ہو کر معافی مانگنے لگے تھے، آخر میں آپ نے ان کو کچھ نصیحتیں کیں، اور چھوڑ دیا تھا۔

گاڑی میں فلم دیکھنے والوں کے خلاف اقدام:

مولانا حسین احمد صاحب کوئی شک نہیں ہے کہ ایک بہادر، نڈر اور غیور وجرأت مند عالم دین ہیں، اس سلسلے میں مولوی محمد قاسم بن محمد سلیمان صاحب ہولی مرنگی، بوسیدنگی جو راقم کے قریبی ساتھی اور ہم سبق تھے اور مولانا محترم کے شاگرد بھی) نے اپنی آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کیا کہ:

"ایک روز میں مولانا کے ساتھ چاٹگام سے گاڑی پر سوار ہوکر کوکس بازار کو جارہا تھا، ابھی ہماری گاڑی چاٹگام کو پیچھے چھوڑ کر کچھ دور نکل چکی تو ڈرائیور نے اس گاڑی میں نصب ٹیوی میں ایک انڈین فلم چلادی، ظاہر ہے کہ ایک گاڑی میں سوار مرد وخواتین کے علاوہ مختلف طبقات کے افراد اور نیک وشرفاء بھی ہوتے ہیں، بہر حال فلم چلادی گئی تو آپ نے بڑی دیر تک صبر کا مظاہرہ کیا، اب ایک موقع پر فلم میں ایک ایسا منظر آیا کہ جسے دیکھ کر کسی بھی ایک انسان کی انسانیت اور اخلاق شرما سکتا ہے، ویسے آپ کو رہا نہ گیا، اور ایسے گرجے کہ گاڑی میں بھونچال سا آگیا تھا، ہر کوئی آپ کی طرف دیکھ رہا تھا، اور آپ کی اس غصیلی حالت کو دیکھ کر ڈرائیور بھی خوف زدہ ہوگیا، اور اس نے فوراً فلم کا چلانا بند کر دیا، اور تو اور مجھے بھی آپ کی اس حمیت دینی اور اخلاقی تقاضے اور جرأت کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، اور اندازہ ہوا کہ آپ دینی اعتبار سے کتنے غیرت مند انسان ہیں"۔(۱)

بیعت وارادت:

مولانا حسین احمد صاحب نے ۲۰۰۳ء کے دوران حضرت مولانا الحاج قاری شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے، یوں بھی تو ظاہر ہے کہ آپ ایک جلیل القدر عالم دین ہیں، مولانا شاہ مظفر احمد صاحب سے

(۱) مولوی محمد قاسم بن محمد سلیمان بوسیدنگ شہر کی مغربی جانب واقع بستی ہولی مرنگ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنی بستی میں پاکر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، یہاں سے جماعت اولی تک کی تعلیم پاکر ایک روایت کے مطابق چاٹگام بنگلادیش کی معروف دینی وروحانی مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری میں داخلہ لیا، جہاں سے دورۂ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد وطن واپس لوٹے اور حضرت مولانا شاہ ابوسعید صاحب کی بڑی لڑکی سے شادی کی، پھر بعد میں جامعہ اسلامیہ عالیہ کے مدرس بھی مقرر ہوئے تھے۔ مولوی صاحب ایک بہادر اور قومی حمیت رکھنے ولے انسان ہیں، عرصۂ دراز تک راقم سطور کے ہم جماعت بھی رہ چکے، انہوں نے مولانا حسین احمد صاحب سے مدرسہ معین الاسلام اور دارالمعارف کے دوران تعلیم استفادہ کیا تھا، عربی لکھنے اور بولنے کی بھی بڑی کوشش کرتے تھے، نہ جانے اس میں کتنی ترقی ہوئی، شنید ہے کہ اندرون وطن موجود ہیں۔

بیعت کے بعد عبادت وبندگی اور ذکر وشغل کے حوالے سے آپ کو خاصے سرگرم دیکھا گیا تھا۔

مولانا حسین احمد صاحب طالب علمی کے دوران اور اس کے بعد بھی بعض امور کے حوالے سے حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب پر بڑے احترام کے باوجود بھی کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، لیکن جہاں تک معلوم ہوا اور آپ کو دیکھا بھی گیا ہے کہ اس بیعت کے واقعہ کے بعد مولانا نے اپنے مرشد کے حوالے سے اپنی سابقہ آراء سے کافی حد تک رجوع کرلیا، ورنہ اندازہ ہے کہ مولانا جس قسم کی آراء وخیالات اپنے مرشد پر رکھتے تھے، ان سے رجوع کئے بغیر آپ حضرت کے حلقۂ ارادت میں داخل نہیں ہوسکتے تھے۔

اس سلسلے میں مولانا حسین احمد صاحب کے بعض احباب نے آپ سے گفتگو (ان احباب کے بیان کے مطابق) کی تھی، اور عرض کی گئی تھی آپ نے ایک ایسے شیخ کے ہاتھ میں بیعت کیوں کی جن کے بعض کردار، سرگرمیاں، طرز معاشرت، فکر وخیالات اور طرز زندگی آپ کی سمت مخالف ہے، مثال کے طور پر:

۱۔ آپ (مولانا حسین احمد صاحب) جماعت تبلیغ کے زبرست حامی اور طرف دار، جب کہ آپ کے شیخ حضرت شاہ مظفر احمد صاحب جماعت تبلیغ کے بڑے ناقد ہیں، اور اس حوالے سے حضرت کی زندگی میں بہت ساری باتیں سنی گئی تھیں؟۔

۲۔ آپ سرزمین ارکان میں اس وقت بھی جہاد وقتال کے حامی اور طرف دار تھے اور ماشاء اللہ تعالی اب بھی ہیں، جب کہ حضرت شیخ مولانا شاہ مظفر احمد صاحب اس وقت جب آپ بیعت کررہے تھے، جہاد وقتال سے بڑے نالاں اور برگشتہ؟؟۔

۳۔ آپ غلامی کے ایک ایک لمحہ کو بھی موت کی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں، جب کہ حضرت شاہ صاحب ایسے حالات میں صبر وثبات کو مصلحت زمانہ اور تقاضائے وقت سمجھتے تھے، اور ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب اس مصلحت پسندانہ رویے پر سدا قائم اور کاربند تھے؟؟؟۔

مولانا کے ان احباب کے بیانات کے مطابق آپ نے ان کے سارے سوالات کے ایک ایک کرکے جو جوابات دیئے تھے، کوئی تسلی بخش نہیں تھے، شاید اس حوالے سے آپ نے

ان اپنے احباب سے خطیبانہ انداز میں گفتگو نہیں کی ہوگی، ورنہ آپ کو جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ کے جوابات چاہے جس کسی بھی موضوع پر کیوں نہ ہوں، نا قابل قبول ہونے اور تشنہ رہ جانے کا سوال بھی نہیں اٹھتا، بہرحال ان احباب کا بیان ہے کہ مرشد و مرید کے درمیان مسلک و مشرب کی یکسانیت کے علی الرغم طریقہائے فکر و خیال اور طرز زندگی میں یک رنگی اور ہم آہنگی ایک امر لازمی ہوتا ہے، ورنہ افادہ و استفادہ کی جد و جہد ایک سعی لا حاصل کے سواء اور کچھ بھی نہیں ہوتی، شاید یہاں مرشد و مرید کے مابین یہی یکسانیت رہی ہوگی، واللہ اعلم۔

بہرصورت جہاں تک میں نے اندازہ کیا کہ مولانا کے یہ احباب اور چاہنے والے آپ کے بڑے مخلص تھے اور ہیں، جن کا خیال تھا کہ مولانا حسین احمد صاحب کی زندگی اور طرز معاشرت میں رہ رہ کر جو افراط و تفریط اور بے اعتدالیاں (ان کے مطابق) ہوتی تھیں، ان کا محرک و محور ایک مرشد کامل کے سامنے آپ کا سر تسلیم خم نہیں کرنا تھا، جس کا احساس خود مولانا کو بھی تھا، اور جہاں تک مجھے یاد ہے کہ اس حوالے سے آپ نے اپنی بعض مجالس میں اظہار خیال بھی کیا تھا۔ بہر حال بات یہی ہے کہ ایک مرشد برحق کے ہاتھ پر بیعت کرنے اور ان کے ارشادات و رہنمائی کے مطابق زندگی گزارنے سے آپ کی زندگی میں جو رنگ آنا تھا، وہ شاید اب آ بھی گیا ہو، اللہ تعالی مولانا حسین احمد صاحب کی زندگی میں روحانیت کے حوالے سے وہ بہار لائے، جس کی توقع ہم زندگی بھر کرتے رہے ہیں، جس سے امید ہے کہ نہ صرف آپ کا فائدہ ہوگا بلکہ ایک حیثیت سے پوری قوم کو بھی فائدے ہونے کا امکان ہے، اللہ ہماری دعا قبول فرمائے، آمین، یارب العالمین۔

اس بیعت و ارادت کے چند سال بعد مولانا کو اپنے احوال و مقامات کے متعلق بیان کرتے ہوئے سنا گیا، آپ کہہ رہے تھے کہ ”حضرت پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت نے میری زندگی میں جو خاص تبدیلی لائی ہے وہ بیان کرنے سے میں قاصر ہوں“ ظاہر ہے کہ راقم سطور ایک کور باطن انسان ہے، یوں اس قسم کی باتوں سے الجھنا اس کے بس کی بات نہیں ہے، لیکن خدا معلوم کہ اس وقت آپ اپنے کس قسم کے احوال و مقامات کے بارے میں اظہار خیال فرما رہے تھے، اور وہی جانتا ہے کہ اس بیعت و ارادت نے آپ کی زندگی میں کون سی تبدیلیاں لائی تھیں؟ نہ جانے وہ کون سی منزل تھی کہ

جس کی طرف آپ کو اس بیعت و ارادت نے رواں دواں کر دیا ہو؟؟ اور وہ کون سی مثبت زندگی تھی، جسے آپ نے اس بیعت و ارادت کے بعد پالیا ہو؟؟؟۔

میرے ناقص خیال میں آپ نے اس وقت اپنی زندگی کی ظاہری تبدیلی کے متعلق اظہار خیال نہیں کر رہے تھے بلکہ جو اظہار کر رہے تھے وہ سراسر باطنی اور روحانی احوال و مقامات کے بارے میں تھا، جو ہم جیسے نرے کور باطن اور بلکہ ایک قسم کے بد باطنوں کی نظر سے شاید اوجھل ہوں، بہر کیف آپ نے بیعت تو کر ہی لی، اللہ کرے کہ یہی بیعت آپ کی زندگی میں مثبت پھل لائے، جو پوری قوم کے حق میں بھی کام آئے۔

لیکن یہاں ایک افسوس کا مقام ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب کی اس بیعت و ارادت کے تقریبا پانچ سالوں کے بعد حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب کا انتقال ہو گیا، حضرت شیخ سفر حج میں حجاز مقدس میں تھے، واپسی کی تیاری مکمل تھی، لیکن ادھر سے بلاوا آ گیا اور آپ نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا، الحمد للہ جنت المعلی میں مدفون ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کاش کہ مولانا حسین احمد صاحب کی حضرت شیخ کے مبارک ہاتھ پر یہ بیعت ان کے عہد شباب میں ہوئی ہوتی، تو ظاہر ہے کہ استفادے کا اور زیادہ موقع ہوا ہوتا، پھر بھی جو ہوا کہ اچھا ہی ہوا، شاید دیر آید درست آید والی بات ہو، اللہ تعالی کی جو مرضی ہوا آخر وہی تو ہوگا نا؟ اللہ تعالی اپنے خاص کرم سے مولانا کی زندگی کو مزید سنوار دیں۔

اب ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس عنوان کے معا بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے مرشد حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات زندگی یہاں درج کئے جائیں، جو بعض حضرات کا مطالبہ بھی ہے:

مراسلہ نمبر(۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزم مولوی ابو طاہر سلمہ ربہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

خیر و عافیت کی صبح وشام میں خیر وفلاح کی امیدیں لے کر ہوں، تمہاری رفاقت نے آج تک جتنی منزلوں سے گزر کر رفیق سفر کا کام دے رہا ہے، یاد کرنا کجا یاد آنا بھی اپنی جگہ بارِگراں کا کام کررہا ہے، مگر ان بارِگراں کو مدت سے بارِگرامی کی جگہ دے کر آگے بڑھتا آرہا ہوں، تو لکھنے بیٹھا تو کوئی عجب نہیں، تم بھی ان جوانوں میں دکھائے دو گے جن کی قلت وکثرت کی ہمیں کوئی بھی شکایت نہیں تھی، میری توقع کی چیز نہیں تھی، میں بہت یقین سے جانتا تھا کہ تہی دامن ہو علم وثقافت کے ان باریک معنوں میں، جن کا ہمارے یہاں بہت چرچا رہا ہے، وہ یقین والی بات ٹھیک رہی، مگر دوسری وہ بات بھی یقین کی حد کی تھی تم ملک وملت کے حق میں ایک نادر پھول بن کر تاریخ ملت کے روشن ابواب کی سرخی بنو گے، قوم وملت کے سپوتوں کے قافلے میں ایک سرخیل کی جگہ پوری کرو گے، مگر تقریباً اس یقین والی بات میں میری ڈگمگاہٹ تم خود اچھی طرح نظارہ کررہے ہو، میں نے تمہیں بار بار کہتا آیا کہ تم میری باتوں کی مراد پانے میں بامراد رہا کرو، ان لوگوں میں جا نہ ملو جنہیں نہ باتیں آتی ہیں اور نہ باتیں سمجھنے کی صلاحیت ہے، تم یہ بھی یقین مانو کہ تم سے جو کام مجھے لینے تھے، (اللہ کرے لیا بھی جائے) قوم میں تقریباً اور دو چار نہیں ہیں، تم آج بھی وہی اکیلا ہو جو کوئی دس سال پہلے تھا، زمانے نے میری باتیں سمجھنے میں اور مرادیں پالینے میں ہمیشہ نامرادی کا ثبوت دیا تو عجب کیا؟ آج بالکل سرمو انحراف کئے تم نے بھی وہی چال چلنا شروع کیا جس کے زخم سے میں چور اور رنجور ہی آیا ہوں۔

تمہیں میں نے بار بار کہتا آیا کہ یہ اہل خلوص وایمان کی راہ ہے، سودا بازی کی منڈی نہیں، یہاں اپنا سب کچھ بھولے ہوؤں کا کام ہے، چیز و ناچیز سے لو لگائے ہوؤں کا کام نہیں، مگر تم ہر سنی باتوں کو ان سنی باتوں میں اور ہر دیکھی چیزوں کو ان دیکھی چیزوں میں برابر کے تازیانے برسانے لگے، اور دنیا والوں کو دعوتِ نظارہ دینے لگے، یہی کچھ ہے اس سوختۂ غم کے سوز وساز سے، تم خوش رہو، پر سعادت رہو اپنے میشن کے ساتھ، مگر کٹھن منزلوں سے دو چار، اللہ کرے کہ تمہاری اداسی کی عمر اور دراز نہ ہو۔

نوٹ: مجھے تعجب ہے اس بات پر کہ درِ کریم کی چوکھٹ میں تمہارے نام یاد آنے میں کبھی خطا نہیں ہوئی، خوب مانگا تمہاری خیر وفلاح کے لئے، فوز وصلاح کے لئے، والسلام۔

تمہیں شادماں دیکھنے کا خوگر:

حسین احمد

مکہ مکرمہ، سعودی عرب۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۲)

بسم اللہ الذی فی کل سورۃ سمہ

عزیز گرامی میاں مولوی ابوطاہر سلمہ ربہ!

خیر و عافیت کا پیغام اور دعائیں دیتا ہوں۔ تمہارے نام کا گویا میرا دوسرا خط ۱۰؍دسمبر کو ڈاک سے بھیجا تھا، آج ۳۱؍دسمبر ہے، پہلا خط مولوی نورالہدی کے ہاتھوں ذوالحجہ کے آخری عشرہ کو بھیجا گیا تھا، تین چار مہینے کی مسلسل خاموشی کے بعد دل کو ایک گونہ خطرہ گزر کر ڈاک کا بھیجا تھا، اس کے بعد بھی آج تک کی بےخبری اور بھی تکلیف دے رہی ہے، صرف اتنی سی بات کسی طرح سمجھ آگئی ہوتی کہ تم سلامت اور قیدِ حیات سے ہو اور مجھے خط لکھنا نہیں چاہتے ہو تو کوئی بات نہیں، حیات رہی تو ٹھیک ہے، پھر مجھے نہ لکھنا میری توقع کے باہر کی چیز نہیں تھی، میں اتنا لائق کہاں ہو گیا کہ لوگ مجھ سے ضابطے کے خط وکتابت کرنے لگے؟

کسی نہ کسی تدبیر سے اتنی سی بات پہنچ گئی ہوتی کہ زندہ وسلامت ہو تو اپنی ذمے داری سنبھالنے کی کوشش پر لگا رہتا، یوں تو تمہارے دو ایک پرچے پہنچے تھے، میں نے بےاعتنائی نہیں بلکہ سوچ اور سمجھ کر جواب لکھنے میں تاخیر کی، اور اتنی بھی عقل نہیں رہی تھی کہ یہ سوچ اور سمجھ کی تاخیر زندگی کی تمام سنی باتوں کو ان سنی کردے گی، مستقبل کے تمام سرسبز خوابوں کو خاک وخون کردیا جائے گا:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

جن کی زندگیاں اپنے خواب وخیال کی سرسبز جنت سے گزر کر کبھی عمل وتطبیق کی لذت وکردار سے آشنا ہو سکتی ہوں، ان پاک طینتوں کا کیا کہنا؟ یوں تو زندگی کم نہیں گئی، "عقود من السنین" کے بھاری الفاظ

سے یاد کی جائیں تو کچھ مبالغے کا کام نہیں ہوگا، اتنی لمبی مدت ہوگئی، جس کے اندر دنیا کی تاریخ میں بہت ساری شخصیات کا ابھرنا اور کامل ومکمل ابھرنا دیکھا گیا، ابوالکلام کو دنیا تیس اور چالیس سالوں میں نہیں بلکہ پندرہ اور بیس کے درمیان پوری طرح مان گئی، میرے اشارہ شبلی سے ملاقات اور ان کی پیش گوئی کی طرف ہے، جو گفتگو تھی ایک کہنہ مشق اور فنان علامۂ زمان سے ایک سترہ سالہ نونہال کی بابت، علامہ بنوری کو چودہ سالہ زندگی میں آپ کے ہندوستان نے ''المحدث الکبیر'' کا بھاری لقب دیا، علی میاں ندوی تو عرب وعجم کے صفحاتِ تاریخ میں نہیں بلکہ الواح دل و دماغ پر بیس اور پچیس کے درمیان ثبت ہوگئے، جمال الدین افغانی کی قیادت امت کی وسیع فضا میں جب گونج رہی تھی تو ان کی عمر شریف کی عمر ابھی بیس سے آگے نہیں پہنچی تھی، تو ہم پینتیس سے چالیس کے درمیان سانس لے رہے ہیں، کام کیا ہوا؟ صرف اور صرف خواب کی عمارتیں اٹھیں، جو بیداری کی انگڑائیاں لیتی ہوئی گر کر مسمار نظر آتی ہیں، سچ میں ایسی زندگیوں پر رحم کھاتے ہوئے ساتھویں صدی کے ایک صاحب دل انسان کا منہ کھولا تھا، اور وہ اپنے سے مخاطب تھے:

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

اور تو وہ شاعر تھا، عارف تھا، آج کا یہ غم کھاتا ہوا انسان وہ شاعری کہاں سے لاتا کہ غم کھانے کا ایک ڈھنگ اپنے پیچھے چھوڑ جاتا؟

مادرِ وطن کے گیسوئے آبرو کو شکستہ سے شکستہ ترین دیکھ کر دل کا آئینہ بھی ٹوٹ جاتا ہے، آج کل حال بد نہیں بلکہ بدترین حال سے دوچار ہے، سدھرنا اور سنورنا خود ہمارے سر تھا، وہ بھی ٹوٹ کر گرنے لگا:

بال و پر ٹوٹے ہوئے پرواز کی طاقت نہیں
تاک میں صیاد ہے گلشن کی دیواریں بلند

قومی زندگی کے ان تلخ نوا حالات پر کسی حساس انسان کا دل و دماغ کھولا تھا، میں دو مہینے ہوئے دن گزار رہا ہوں حجازِ مقدس کے سفر کے لئے، خلیج کے المناک حالات نے انتظار میں رکھا، پندرہ جنوری تک مزید انتظار رہے گا، خدا کرے کہ تمہاری زندگی ہمہ گیر قسم کی کامیابیوں سے ہم کنار ہوجائے۔

تمہارے منتظرِ فردا:

حسین احمد

۳۱/دسمبر/ ۱۹۹۰ء۔ عابدہ منزل، چاٹگام، بنگلادیش۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۳)

بسم اللہ سبحانہ

عزیزی وعزیز کبدی! اللہ تعالی تمہاری سلامتی کا فیصلہ کرے۔

میں تمہارے نام اپنی زندگی کا ایک گونہ پہلا پیغام بھیج دیتا ہوں، خطوط بہت ملے، تمہاری غیر متوقع (بلکہ پوری توقع کی) کامیابی پر شکر و سپاس سے ہوں، یہ کوئی فلسفیانہ پیش گوئی تو نہیں تھی، تھی صرف اتنی کہ ایمان وفراستِ ایمانی کی کرشمہ سازی کہ:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

آج اس کا دوسرا مصرعہ بھی لئے لینا:

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

ان دونوں مصرعوں کے خاموش حقائق سے تہی دامنی کی شکایت تم سے بھی کی تھی، مگر آج سمجھ آ گئی کہ میری آنکھوں کا وہ قطرہ یا نگاہوں کا پتلی جو آج کل گوہر تو ضرور ہے مگر گوہر قابل یقین نہیں، لیکن اپنے گوہر قابل یقین بننے کی تمناؤں میں موج وطلاطم کا شکار شورِ دریا پر وقت گزار رہا ہوں۔

آج اپنی زندگی کی پیاری چیز رہن میں چھوڑ کر تمہارے پیغام کا تیار ہوا، مگر چند دنوں کے اندر تمہارے پورے سال کا توشہ پہنچا دیتا ہوں، خدا کرے کہ یہ خوش گوار سلسلہ دراز سے دراز تر رہے، ادھر تمہاری نونہال زندگی پر لوگوں کی خشک حسرت تھی:

حسرت ہے ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا گئے

الحمدللہ آج تو کلیاں چٹک رہی ہیں کھلنے اور آب وتاب سے کھلنے کی فکر میں۔

حسین احمد

جون/۱۹۹۰ء۔ عابدہ منزل، چاٹگام، بنگلا دیش۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۴)

عزیزم مولوی ابوطاہر سلمہ ربہ وسالم بہ حظہ!

تمہاری خیر وعافیت کی چاہت سے دل دکھتا رہتا اور فضا پریشان ہوتی رہتی ہے، حجازِ مقدس سے واپسی کے فورا بعد میرے لینے دینے میں پہلا شخص وہ نکلا جس نے تمہارے چند خطوط دیئے ہیں گھر پر پڑے ہوئے، پڑھ پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور پریشانی بھی۔

دوسری طرف آج جب پہلی مرتبہ اپنے پرانے اور نئے تعلقات کے سلسلے پر نظر ڈالتا ہوں تو تمہارے نام کا فال نکل آیا، تم خوش رہو، خرم رہو، آباد رہو اور مقدام رہو۔

خوشی اس بات پر تھی کہ تمہاری زندگی کے نازک دامن سے جڑی ہوئی میری تمناؤں اور چاہتوں، امنگوں اور آرزوؤں کی دنیا آباد ہونے جارہی ہے، اور پریشانی اس بات کی ہے کہ میں وقت پر کام نہ آسکا، اور حجاز سے لکھنے لکھوانے کا تھا وہ بھی نہ ہوسکا، خدا کرے کہ تم آزمائشوں کے اس پار اپنی خاص مسکراہٹ سے نکل جاؤ گے۔

ادھر میرا تقریبا اس مہینے کا پروگرام تھا ہندوستان آنے کا، مگر یہاں کے حالات دیکھتا ہوں کہ تھوڑا ٹل جائے گا، میرے اس پرچے کے بعد اپنے سفر اور زادِ راہ کے متعلق کسی قدر بے نقاب الفاظ میں مجھے اطلاع دینا، میں بڑے تردد سے دوچار ہوں، کہ تمہارے آج کل کے گزرنے والے دنوں کا سوال کہاں ہے۔

اس پوری زندگی کی طبیعت اور خصوصیت، دینی اور دعوتی کاموں کی رنگارنگی اور اسی راہ کی مشکلات و

معضلات پر میری نگاہ ہر وقت تیز رہتی ہے، ادھر اور ایک کام نے تم پر سوچنے کی اہمیت بڑھادی، اور وہ کام بھی اشارے پر لئے رکھو!

کتابوں کی قدیم فہرست جو خریدنی اور جمع کرنی تھی، اس سال تقریبا ٪۶۰ پوری ہوگئی، سعودیہ سے میری آنکھوں کے سامنے کارگو کا کام ہوا، یہاں پہنچ کر ڈھاکے سے خبر بھی آگئی کہ کتابیں ایرپورٹ تک پہنچ گئیں، اب اس راہ کی تیاری پر ہوں، تم سے فون پر بات کروں گا، اہم کتابوں کے نام ساتھ دیتا ہوں۔

ادھر تم آسانی سے سمجھ جاؤ گے کہ عام استفادے کی کتابیں کہاں جمع ہوتیں، اور وہ جگہ کس آن بان اور شان وشوکت کی ہوتی ہے، اور اس کام کا ادارتی اور انتظامی کام کتنی ذمے داری اور توفیق کا ہوتا ہے، مجھ ناتواں، بدتوفیق اور غریب الدیار سے کیسا بن پڑتا؟ سوائے اس نظام غیب کی کوئی چارہ جوئی کے، جو نااہل کی اہلیت اور ناتواں کی توانائی کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، اور وہی کارسازِ حقیقی ہے۔

میرے سفر کے دنوں میں بہت کم وقت ایسا ہوگا جس میں تمہاری یاد نے تکلیف نہ دی ہو، بہت کم مقدس مقامات گئے ہوں گے جہاں تمہاری یادیں، تمہاری زندگی کی سرتاپا تصویر میری نگاہوں میں نہ رہی ہو۔

باقی سارے عزیز اچھے اور خیر سے ہیں، تمہاری چاہت کے مطابق ام انور سے دعائیں دلائیں، میں نے اپنی طرف سے بھی مانگیں، اور مانگے کی دعائیں دیں، تم میرے دل کی باتیں سمجھنا شروع کرو، اللہ تعالی تمہارا ساتھ رہے گا، والسلام۔

حسین احمد

عابدہ منزل، چاٹگام، بنگلا دیش۔

مراسلہ نمبر (۵)

عزیزم مولوی ابوطاہر سلمہ ربہ !

سلام مسنون کے بعد،

میری آج کل کی زندگی پوری طرح مسافرت میں گزر رہی ہے، یوں تو نابہ کار ہوں، شروع سے کم فرصتی

نے اور بھی ویران کردیا۔سعودیہ سے واپسی کے بعد اتنے دنوں تک کتنے ارادے اور پروگرامز گئے کہ تمہیں کچھ لکھوں،لکھنا متعدد دفعہ ہوا،بھیجنا ایک دفعہ بھی نہ ہوکر پریشانی ہوئی،اور تم بھی پریشان ہوئے ہوگے،آج کل دوسرے ایک طویل سفر کے لئے نکلنا ہورہا ہے،مختصراً یہ پرچہ لکھنے بیٹھا ہوں۔

دوسری جگہوں پر تمہارے اشارے سے جو سمجھ رہا ہوں ، یہ کہ تم اس سال رمضان کے بعد ادھر چلے آرہے ہو، وہ اگر سیرا ہے تو کسی طرح صحیح کہہ دیتا ہوں ، دوسری کسی اور صورت پر ہے تو ابدا نہیں ، کہ طالب علمی کے اس ادھورے پن میں تم بننے والے مستقبل سے آنکھیں بند کرکے نا عاقبت اندیشانہ حرکت کربیٹھو، اورزمانے کے اس قافلے میں شامل ہونے آجاؤ، جس کے ہر ایک افراد نا سمتِ شناس مسافر ہیں۔

زندگی بنانے کی فکر میں (علم وتطبیق کے سارے میدان پر)اور چند دن وہاں گزارنا مناسب سمجھتا ہوں، ادھر حالات پر اتنی واقفیت نے کہ کسی طرح چلتا رہتا ہے، مجھے ایک گونہ بےفکر رکھا، آئندہ حالات صاف الفاظ میں لکھو کہ تشویش خاطر کا سبب نہ بنے،اور خدا حافظ۔

حسین احمد

۱۰/جنوری/۱۹۹۰ء

عابدہ منزل، چاٹگام، بنگلا دیش۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر(۶)

عزیزم مولوی ابوطاہر سلمہ ربہ وسالم بہ الدہر! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،،

امید نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ تمہاری ہمت وحوصلے کام میں لگ گئے ہیں،تمہارے دو چار پرچے یہاں تک ضرور پہنچے،مگر میرا کوئی لفافہ پوسٹنگ نہیں ہوا،بجزاس کے جو مولوی نورالہدی کے حوالے تھا،جس

کے پیٹ میں پچاس ڈالر کا ایک نوٹ بھی بھرا ہوا تھا،اس دن سے آج تک کی اتنی لمبی مدت ومسافت مسلسل اور غیر متوقع خاموشی کی شکار گئی،تو حیرت کی حد ہوگئی۔

مولوی جشیم اور ایک طالب علم کی زبانی اتنی سی بات پاکر کہ ندوے میں ہے کہ ذہن ودماغ کو کسی قدر صدمہ بھی ہوا۔

یوں تو میری عادت نہیں لکھنے لکھوانے کی،لیکن تمہارے نام لکھنا کوئی گراں قدر اور گہرے انداز کا ہونا تھا، نہ ہوسکا، اس کو زمانہ کیا کہے نہ کہے انتظار نہیں، میں خود کہہ دیتا ہوں کہ یہ بےزبان کی گویائی تھی جو تمہاری سمع ناتواں کی مسلسل بےاعتنائیوں کی تاب نہ لاکر مایوس وغمگیں یہاں واپس پہنچی تو یہ اسی دوررس اور بارآور انجام کا آغاز دوسرے لباس میں ہورہا ہے، گویا یہ الفاظ ومحاورات کی شکل وصورت ہے حقائق ومعانی کا رنگ وبو نہیں۔

مولوی نورالہدی والے پرچے میں میں نے صاف لکھ دیا تھا کہ دو ایک مہینے کے اندر پورے سال کا توشہ بھیج دیئے دیتا ہوں،مگر مقدر کو کیا منظور خبر نہیں،عزیز مولوی محمد جلیل وغیرے اچھی طرح روٹھ گئے، جس پر مجھے سعودیہ کا سفر پیش آیا،ایک ہفتے کے اندر روانگی ہوگی،انشاءاللہ۔

تم ابتر سے ابتر حالات کا مقابلہ اس دھب سے کرنا کہ خود حالات تھک کر عاجز آجائے، یہ تمہاری زندگی کی منزلیں ہیں گزرنے والی سڑکوں کا اسٹیشن نہیں، بلکہ مستقبل کی ہمہ گیر ترقیوں کے زینے ہیں جو ایک ایک کرکے طے پار ہے ہیں، بہت تلخ نوا حالات سے بھی گزرہوگا،تم آزمائش وامتحان کے طوفان سے بھی دوچار ہوگے،ان صبر آزما اور دشوار گزار گھاٹیوں سے ہوکر اپنی زندگی اور زندہ روی کا لہلہاتا ہوا سرسبز باغ سامنے ہوگا، جو تم نہیں،قوم نہیں،ملت نہیں بلکہ پورے ایک عہد کو تازہ، زندہ اور سدابہار کردے گا۔

مگر ایک بات یاد رکھنا اور کبھی بھول جانا نہیں! ندوے کی بزم علماء، دیوبند کا مدرسہ، تھانہ بھون کی خانقاہ اور نظام الدین کا مرکزِ دین ودعوت ہروقت پورے اعتراف، پورے توازن اور پوری عقل مندی کے ساتھ نظروں میں رکھنا۔

یہ سب حکمت ودعوتِ ولی اللہی کے شجرۂ طیبہ کی ایک ایک ٹہنیاں ہیں، جو ہروقت جداگانہ پھل اور

پھول، جداگانہ رنگ اور مزہ دیتی رہی ہیں، اس شجرۂ طیبہ کی بیج اور چھوٹے چھوٹے پودے جنہوں نے آپ کے وطن عزیز کی فضا کو بھی علم و معارف کے حوالے سے عطرِ مجموعہ کا سروسامان کیا ہے، ورنہ آپ کی علمی و تحقیقی زندگی کے قدرِ زیبا میں توازن و متانت کا فقدان آئے گا، اور شخصیت کی رنگارنگی اور ہمہ گیری سے آپ محروم بلکہ ایک گونہ نامانوس وطن لوٹے ہوں گے، اس شکل میں ہماری امیدوں، امنگوں، تمناؤں اور چاہتوں کی دنیا ویران اور برباد نظر آئے گی، آپ ایسا تو نہیں چاہتے؟

انور کی بسم اللہ کرائی گئی الحمد للہ، ماشاءاللہ استاد کے پاس اس کی پذیرائی دیکھ کر آپ کا پرانہ خواب یاد آتا ہے، اور دل کو ایک گونہ خوشی بھی، ام انور کا سلام اور دعا قبول کرنا۔ والسلام۔

حسین احمد

۱۱/۱۲/۱۹۹۰ء

عابدہ منزل، چاٹگام، بنگلا دیش۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب گدوسراوی

مجاہد اسلام حضرت مولانا حبیب الرحمن بن حضرت مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب گدوسراوی کا شمار سرزمین ارکان کے ان مایۂ ناز شخصیتوں میں ہے، جن کی روشنیاں اور تابانیاں ان کے اپنے زمانے میں بھی تھیں اور خدا کرے کہ تا قیامت باقی رہیں گی، وہ اس لئے بھی ہے کہ مولانا ایک ممتاز عالم دین اور خلیق انسان ہونے کے تہ بتہ ایک صحیح معنی کے عالم دین مفتی و مرد مجاہد فی سبیل اللہ ہونے کے ساتھ دور اندیش سیاسی لیڈر اور مبصر قائد ملت تھے۔

مولانا کی پیدائش جنوبی منگڈو کی معروف بستی گدوسر میں لگ بھگ ۱۸۸۵ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے والد حضرت مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب سے حاصل کی، متوسطہ اور اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کی مایۂ ناز درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں جا داخلہ لیا، جہاں سے سند فراغت امتیازی شان کے ساتھ حاصل کی تھی۔

جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ پر فدا تھے، ظاہری علوم کے حوالے سے یوں تو حضرت مولانا آپ کے استاد تھے، اور باطنی علوم کے حوالے سے شیخ طریقت بھی، یاد رہے کہ آپ کے والد حضرت مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی حضرت تھانویؒ کے شاگرد اور مرید خاص تھے، جنہوں نے قرآن کریم کا مکمل حفظ تھانہ بھون میں کیا تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا حبیب الرحمن صاحب وطن واپس آئے تو اطراف واکناف کے شائقین علوم و معرفت آپ پر ٹوٹ پڑے تھے، یوں بہتوں نے آپ سے استفادہ کیا تھا، بالآخر سرزمین ارکان پر ۱۹۴۲ء کا وہ دن آیا جسے تاریخ ارکان نے ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھا اور یاد رکھے گا، یعنی معرکۂ کرب و بلا شروع ہوا تو آپ نے مجاہدین اسلام کی بھرپور قیادت کی، اور مسلم مجاہدین کو یک جا کر کے ظالم مگھوں اور برمیوں پر ٹوٹ پڑے تھے، بعد ازاں جاپان اور برطانیہ کی جنگ کے دوران آپ نے ارکانی مسلمانوں کی صحیح صحیح رہنمائی کی، چنانچہ اس حوالے سے مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی کا بیان ہے کہ:

> ''فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا وطن واپس آئے تو اطراف و اکناف کے شائقین علوم دینیہ آپ سے مستفید ہوئے، بعد میں جاپان و برطانیہ کے درمیان سیاسی و جنگی کشیدگی کے دوران ارکان میں سیاسی کردار انجام دینے والے اس مرد

مجاہد کو حکومت برطانیہ نے زیر حراست لے کر رنگپور لے گیا، اور وہاں قید و بند کی حالت میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون، آپ رحمۃ اللہ علیہ ایک ممتاز عالم دین ہونے کے ساتھ خاصے سیاسی شعور رکھنے والے امت مسلمۂ ارکانیہ کے صحیح معنی کے مفکر بزرگ تھے''۔

یاد رہے کہ دراصل حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حکومت برطانیہ نے اپنے لالے پالے غنڈوں کے ذریعے رنگپور میں شہید کر دیا تھا، یہ بات میں نے ایک نہیں بلکہ چند اہل علم وفکر کی زبانی سنی ہے، کہتے ہیں کہ آپؒ کی جائے مدفن بھی رنگپور میں ہے۔

حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب مظاہری دھونسوی

حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب کی پیدائش آپ کے صاحب زادۂ گرامی مولانا الحاج فیاض خلیل کے مطابق ۱۹۰۵ء میں جنوبی منگڈو کی معروف بستی دھونسے میں ہوئی (۱) مولانا کے والد گرامی حضرت الشیخ سفر ملوک/سیف الملوک صاحب وقت کے چیدہ اور جید علماء میں شمار ہوتے تھے، جو ہندوستان کی کسی دینی درسگاہ کے فارغ شدہ تھے، بڑے زمیندار، سخی، مہمان نواز اور مبلغ ہونے کے تہ بتہ دور دراز کے نادار مسلمانوں کو لا کر اپنے علاقے میں آباد کیا کرتے تھے، مولانا شہر ملوک کے متعلق مولانا فیاض صاحب کا بیان ہے کہ:

> ''میرے والد گرامی حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد مولانا شیخ سفر ملوک صاحب رحمۃ اللہ علیہ وقت کے جید اور چیدہ علماء میں سے تھے، زمیندار، خوش اخلاق، عابد اور سخی ہونے کے ساتھ ساتھ دور دراز سے مسلمانوں کو لا لا کر ہمارے علاقے میں بسایا کرتے تھے، مہمان نوازی میں یکتائے روزگار تھے، سخاوت اور فیاضی میں اپنی مثال آپ تھے، ہمیں بھی اپنے والد گرامی جیسے ہونا چاہئے''۔

مولانا فیاض خلیل صاحب کا مزید بیان ہے کہ:

> ''ہمارے خاندان میں بہت سارے جید اور وقت کے داعی، مبلغ، واعظ اور مدرس علماء کرام تھے اور الحمدللہ تعالی اب بھی ہیں، جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں قرآن وسنت کی تعلیم اور پند ونصیحت کے ذریعے عامۃ الناس کو دین سے لو لگائے رکھنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی، اللہ تعالی ان سارے علماء کو جزائے خیر دے، آمین یارب العالمین''۔

مولانا خلیل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں ہوئی، اپنے علاقے کے اس

---

(۱) حضرت مولانا کی جائے ولادت دھونسے کے حوالے سے یاد رہے کہ یہ بستی راسیدنگ ٹاؤن شپ کے ماتحت ہے، اگرچہ لوگوں کی عام زبان میں اسے جنوبی منگڈو میں کہا جاتا ہے۔

کے سایۂ عاطفت میں ابتداء سے لے کر جماعت پنجم تک کی تعلیم حاصل کی، بعد میں آپ کی ذہانت و فطانت کو دیکھ کر اساتذۂ کرام نے مشورہ دیا کہ آپ ہندوستان تشریف لے چلیں اور اعلی دینی تعلیم وقت کے معروف عالم دین حضرت العلامۃ الشیخ بشیر اللہ (۱) صاحب نے آپ کی بسم اللہ کرائی، اور ان حاصل کر کے وطن واپس آ کے یہاں کی سرزمین کو روشن وتاباں کریں، چنانچہ آپ اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان پہنچے اور سرزمین ڈابھیل کی معروف دینی درسگاہ میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے ایک سال تعلیم حاصل کر کے اگلے سال دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، جہاں چند سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور گئے، جہاں ایک طرف آپ نے دورۂ حدیث نبوی کی پڑھائی کی شکل میں درس نظامی کی تعلیم سے فراغت حاصل کی تو دوسری طرف اپنے استاد حضرت مولانا الحاج محمد زکریا صاحب کے ہاتھوں بیعت ہوتے ہوئے منازل سلوک بھی طے کیں، مولانا فیاض خلیل صاحب کے مطابق حضرت مولانا عبدالمتین صاحب راجاربیلی منگڈوی، حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب محدث شقدار فاروی، حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری جیمنگ خالوی، حضرت مولانا لقمان حکیم انڈانگی صاحب آپ کے دوستوں اور ہم جولیوں میں سے تھے۔

ہندوستان میں دوران تعلیم آپ تحریک ریشمی رومال میں شامل ہو گئے تھے، چنانچہ اس تحریک میں شامل ہو کر آپ نے بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں، بڑے مرد مجاہد اور مبصر سیاسی عالم تھے، سرزمین ہندو ارکان میں احیائے دین کے خواہاں تھے، اس حوالے سے آپ نے بڑی بڑی کوششیں بھی کی تھیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا خلیل الرحمن صاحب وطن واپس آئے، اور علی تانجو کے مدرسے میں مدرس مقرر ہوئے، وہاں چند سال دینی تعلیم دے کر اپنے سسرال کی بستی سائندہ فارہ کی درسگاہ میں منتقل ہو گئے، یہاں آپ نے ۱۹۵۰ء تک تعلیم دے کر سینکڑوں تشنگان علوم دینیہ کی پیاس بجھائی تھی۔

۱۹۵۰ء میں آپ کو اپنے علاقے والوں نے مجبور کیا کہ آپ اپنی آبائی بستی میں ایک دینی درسگاہ قائم کریں، چنانچہ اس سال آپ نے اپنی بستی اور علاقہ والوں کے بھرپور تعاون سے ''مدرسہ معین الاسلام

(۱) حضرت العلامۃ الشیخ بشیر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے معروف اور چیدہ علمائے دین میں شمار تھے، آپ کے برادر معظم حضرت العلامۃ مولانا جلال الدین صاحب والد گرامی محترم ڈاکٹر محب الدین عبدالسبحان واعظ مقیم حال مکہ المکرمہ و پروفیسر جامعۃ ام القری حضرت شیخ سے بھی معروف عالم دین میں سے تھے۔

دھونسے'' کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم کر لی، بعد میں تعلیم کے حوالے سے اس درسگاہ نے بڑی شہرت پائی، دور دراز سے سینکڑوں طالبان علوم دین آتے رہے، اور آپ نے بھی اپنی ساری توانائیاں اس میں صرف کیں، چنانچہ اس درسگاہ سے وقت کے چیدہ مدرس دعاۃ اور مبلغین علوم دینیہ سے فارغ ہو کے نکلے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ کی مسلسل جدوجہد اور پیہم کوششیں کام آئیں اور آپ اپنی امید میں بڑے کامیاب نکلے۔

مولانا بڑے کامیاب مدرس تھے، جید الفکر والخیال عالم دین ہونے کا ساتھ بڑے ہر دل عزیز بزرگ تھے، آپ سے ایک بار جو بھی خوش قسمت ملاقات کرتے وہ زندگی بھر کے لئے آپ کے ہو جاتے تھے، طالبان علوم دینیہ آپ پر اپنی جانیں نچھاور کرنا چاہتے تھے، مولانا یوں تو تادم آخر اس درسگاہ کے خادم رہے، مگر اس درسگاہ کے علاوہ اور بھی چند درسگاہوں کے آپ بانیوں میں سے تھے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ چکی بازارا کیاب کی مشہور دینی درسگاہ ''مدرسہ عالیہ چکی بازارا کیاب'' (جس کا اصل معروف بانی مولانا سعید الرحمن صاحب تھے) کے بانیوں میں آپ کا شمار بھی ہے۔

غرض مولانا نے اپنی پوری زندگی دین کی خدمت میں گزار دی، مولانا فیاض خلیل صاحب کا بیان ہے کہ آپ نے تقریباً اٹھاسی سال عمر پا کر ۱۹۹۳ء میں انتقال فرمایا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تعلیم سے فراغت و کے بعد آپ وطن آئے تو آپ نے شادی کی سنت ادا کی، آپ کی پہلی شادی مصطفی خاتون بنت نبیہ حسین سائندہ فاردی سے ہوئی، اس کے بعد دوسری شادی کالا بانو بنت مولانا عبد الجلیل صاحب شیتا فوریکوی سے ہوئی تھی، اللہ تعالی نے آپ کی اولاد میں ظاہری معنوی دونوں حیثیتوں سے برکتیں دیں، الحمد للہ علی ذالک۔ آپ کی اولاد کی فہرست بالترتیب یہ ہے:

(۱) مولانا ابوالفیاض خلیل صاحب۔
(۲) مولانا ابوجمیل خلیل صاحب۔
(۳) مولانا فیاض اللہ خلیل صاحب۔
(۴) مولانا عبدالسبحان خلیل محدث صاحب۔
(۵) مولانا شمس الاسلام خلیل صاحب۔
(۶) مولانا ارشاد اللہ خلیل صاحب۔
(۷) مولانا ابوالوفاء خلیل صاحب۔

(۸) محترمہ طیبہ خاتون صاحبہ۔

(۹) محترمہ حسینہ بیگم صاحبہ۔

مرقومہ بالا فہرست سے ظاہر ہے کہ مولانا کے نرینہ اولاد تمام کے تمام عالم دین تھے اور ہیں، ان تمام میں سے بڑے صاحب زادے مولانا ابو الفیاض خلیل صاحب سے راقم السطور کی بڑی دیرینہ اور قریبی دوستی رہی ہے، فیاض خلیل صاحب ایک عالم دین ہونے کے علاوہ ایک مبصر سیاست دان اور مولف کتب بھی ہیں، جن کے مختصر حالات اس سلسلۂ کاوش میں شامل ہیں، اللہ تعالی سرزمین ارکان کے اس مایۂ ناز ہستی حضرت مولانا خلیل الرحمن کے درجات بلند کرے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب سونخدار بیلی

حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی ولادت ۱۹۳۷ء میں بستی سونخدار بیل منگڈو میں ہوئی، آپ کے والد مرحوم بدیع الدین صاحب ایک علم دوست انسان تھے، وہ اپنے ہونہار بچے رشید احمد کو دینی علوم سے آراستہ کرنے کے لئے بڑے بے تاب تھے۔

کچھ بڑے ہوئے تو مولانا کو مکتب میں داخل کرا دیا گیا، مکتب نشینی کے بعد مدرسہ امداد العلوم علی تانجو میں بھرتی ہوئے، یہیں سے جماعت چہارم کی تعلیم مکمل کر کے اعلی تعلیم کے لئے بنگال کا سفر کیا، وہاں چاٹگام میں کچھ دن پڑھ کر ہندوستان کا سفر کیا، اور سیدھے دار العلوم دیوبند جا داخل ہوئے، دار العلوم دیوبند میں آپ نے جماعت سوم سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم مکمل کر کے اعلی نمبرات کے ساتھ سند فراغت حاصل کر لی، دار العلوم دیوبند میں آپ کے خاص اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی تھے، آپ ۱۹۵۱ء میں سند فراغت کے حصول کے بعد وطن واپس لوٹے تھے۔

مولانا نے علاقے کے دو ایک مدرسہ میں چند سال پڑھانے کے بعد برما کے دیگر علاقہ جات رنگون اور مانڈلے کا سفر کیا، وہاں کے چند مدارس میں بھی دینی تعلیم سے مسلم بچوں کو آراستہ فرمایا کر ۱۹۶۶ء کے اوائل میں پاکستان گئے، وہاں کراچی کے دو ایک مدرسے میں بھی دین کی تعلیم دی، اس کے بعد حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی نیت سے حجاز مقدس پہنچے، حج و زیارت سے فراغت کے بعد دوبارہ پاکستان تشریف لے گئے تھے۔

مولانا ایک طویل مدت پاکستان میں گزارنے کے بعد عمرہ کی نیت سے حجاز آئے تو راقم الحروف سے جدہ میں ملاقت ہوئی، جہاں تک راقم الحروف نے دیکھا اور اندازہ کیا کہ مولانا ایک نہایت خلیق اور پاکباز عالم دین ہیں، آپ کے اخلاق اور کریمانہ صفات سے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہے کہ آپ ایک جلیل القدر عالم دین ہیں، آپ کی زندگی بڑی سیدھی سادھی ہے، دوستوں سے اس انداز میں ملتے ہیں کہ گویا آپ کے خیال میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ وہ ایک عالم دین ہیں، جناب مولوی کلیم اللہ بن صدیق احمد سوداگر صاحب مولانا کے قریبی دوستوں میں سے ہیں، چنانچہ ان ہی کی معرفت سے مولانا کے ساتھ میری ملاقات ہوئی تھی، اللہ تعالی مولانا کی حیات میں برکت دے، آمین۔

حضرت مولانا راغب اللہ صاحب مجددی خواندگی؟

شیخ طریقت حضرت مولانا راغب اللہ بن مولانا رحمت اللہ بن مولانا نور اللہ کی پیدائش جنوبی مشرقی بوسیدنگ کی معروف بستی خواندنگ میں ہوئی، آپ کے والد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نقشبندی مجددی ایک بلند پائے کے بزرگ عالم دین اور شیخ طریقت تھے، ظاہر ہے کہ مجاز بیعت تو تھے ہی لیکن معلوم نہ ہوسکا کہ آپ کے شیخ کون تھے۔

حضرت مولانا راغب اللہ صاحب کی بسم اللہ خوانی، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم اپنے والد کے ہاتھ میں ہوئی، بڑے ہوئے تو اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور ایک روایت کے مطابق مدرسہ عالیہ کلکتہ سے سند فراغت حاصل کر کے وطن واپس آئے تھے۔

فراغت تعلیم سے واپسی کے بعد مولانا راغب اللہ صاحب نے اپنے لائق والد مولانا رحمت اللہ صاحب کے ہاتھ میں بیعت ہو کے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ سے نسبت قائم کی، یوں آپ کے نام کے ساتھ مجددی کا لفظ چسپاں ہوگیا، کہا جاتا ہے کہ مولانا نے اپنے والد کے زیر سائے بہت ہی ریاضت ومجاہدہ کیا، بالآخر والد صاحب نے خرقۂ خلافت کے ساتھ اجازتِ بیعت سے نوازا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کی شادی نصوحہ خاتون بنت محمد امین رواسوگری بن سعید احمد رواسوگری بن عبدالسلام رواسوگری دابری چنگی سے ہوئی، مولانا کے آئی خاندان علماء اور صلحاء کا خاندان ہے جبکہ سسرال کا خاندان ایک حکمران اور زمیندار خاندان۔

مولانا نے اپنی پوری زندگی قرآنی تعلیم اور اصلاح معاشرہ وتلقین میں گزار دی، جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، نہایت پاکیزہ خیالات رکھتے تھے، قرآنی تعلیم سے آپ کو گویا عشق تھا، اس حوالے سے آپ کے لائق فرزند حضرت مولانا محمد کبیر نے بتایا کہ:

> ''میرے والد نے ان کی طرح مجھے بھی چھوٹے بچوں کو قرآنی تعلیم کی وصیت یا نصیحت کی تھی مگر یہ میری مقدر کی بات ہے کہ آج تک میں اپنے والد کی نصیحت کو پورا نہ کرسکا، اس وجہ سے مجھے بدنصیبوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، اگر زندگی نے وفا کی تو میں اس وصیت کو پورا کرنے کی ضرور کوشش کروں گا''۔

حضرت مولانا راغب اللہ نے ۱۹۶۸ء میں انتقال فرمایا، اور خواندنگ، بوسیدنگ میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا سعید الرحمن صاحب گدوسراوی

مولانا مفتی سعید الرحمن صاحب اپنے دور کے ایک جلیل القدر فقیہ عالم دین تھے، آپ جنوبی منگڈو کی معروف بستی گدوسرا میں تقریباً ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے، آپ علاقہ کے مشہور ومعروف خاندان'' دولائی باپ'' کے چشم وچراغ تھے، آپ کے والد صاحب نہایت دیندار اور عالم دوست بزرگ تھے۔

مولانا سعید الرحمن صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے علاوہ علاقے کے دیگر مدارس سے حاصل کی، پھر متوسطہ اور اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے ہندوستان تشریف لے گئے، متوسطہ کی تعلیم ہندوستان کے دیگر مدارس سے حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، وہاں سے آپ نے سند فراغت حاصل کی، حضرت مولانا سید حسین صاحب مدنی، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب، حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی کے علاوہ آپ نے حضرات شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی سے بھی فیوض حاصل کئے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مبلغ ہو کر ہندوؤں کے مذہبی معروف مرکزی علاقہ متھرہ میں گئے، جہاں آپ نے عرصۂ دراز تک تبلیغی خدمات انجام دیں، وہاں آپ نے ایک مدرسہ کی بنیاد بھی رکھی تھی، حضرت مولانا سیف اللہ بن مولانا عبد الجبار صاحب راوی ہیں کہ آپ نے اس دینی مدرسہ میں عرصۂ دراز تک مسلمانوں کے بچوں کو دینی تعلیم دی اور فرزندان اسلام کو دین سے روشناس کرایا، علاوہ ازیں وہاں کے دور افتادہ علاقوں میں رہائش پذیر مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کے ساتھ دینی زندگی گزارنے کا طریقہ بھی سکھایا تھا، اس کے بعد آپ وطن تشریف لائے، اور گدوسرا والے حافظ سعید علی کی لڑکی سے شادی کی، جن کے بطن سے ایک لڑکا مولوی محمد اسماعیل اور ایک لڑکی علیمہ پیدا ہوئی۔

حضرت مولانا سیف اللہ صاحب کا مزید بیان ہے کہ:

> ''مولانا سعید الرحمن صاحب اپنے دور کے ممتاز اور جلیل القدر عالم دین تھے، فقہ اسلامی کے حوالے سے مسئلہ کتنا ہی کٹھن اور پیچیدہ کیوں نہ ہو آپ اس کا حل بڑی آسانی سے نکالنے کے ماہر تھے، علاوہ ازیں آپ ممتاز مبلغ اور خطیب بھی تھے، وعظ ونصیحت کے حوالے سے آپ دور دراز علاقوں کا سفر کرتے تھے، خاص طور پر خشک موسم میں ارکان کے جنوبی مشرقی علاقوں کا سفر کر کے مسلمانوں کو دین کی تعلیمات سے روشناس کراتے تھے، آپ نے اپنی زندگی کو پند ونصیحت اور وعظ و تبلیغ میں گزار کر بالآخر ۱۹۸۵ء میں انتقال فرمایا، اور گدوسرا میں مدفون ہیں۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید الامین صاحب منگماوی

مولانا کا خاندانی پس منظر :

سرزمین ارکان کے مایۂ ناز عالم دین حضرت العلامۃ شیخ الحدیث مولانا سید الامین منگماوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کچھ لکھتے وقت ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے سلسلۂ نسب اور خاندان کے چند بزرگوں پر کچھ لکھ دوں۔ تو لیجئے آپ کا مختصر سلسلۂ نسب :

''سید الأمین بن شاکر محمد بن سمیع الدین بن علیم الدین منگماوی، منگڈوی'' جہاں تک ہم جانتے ہیں کہ آپ کی طرح آپ کے خاندان میں اہل علم وفضل کی کوئی کمی نہیں ہے، اوران اہل علم وفضل کی ایک طول طویل فہرست ہے۔

مختصر یہ ہے کہ حضرت مولانا سید الأمین منگماوی کے خاندان علمی، دینی اور فکری وثقافتی اعتبار سے علاقہ بھر میں بہت بلند رتبہ کا حامل ہے۔ دنیاوی اعتبار سے اگر چہ بہت مشہور نہیں مگر دینی اور فکری اعتبار سے اس خاندان بابرکت کا مقام بہت بلند ہے، اور یہ بات کسی جاننے والے سے پنہاں اور مخفی نہیں ہے کہ یہ خاندان ارکان کے چند دیگر سرمایہ دار خاندانوں میں نہیں ہے مگر دینی اور علمی اعتبار سے اس کا شمار سرزمین ارکان کے مایۂ ناز خاندانوں میں ہے، اور دنیاوی اعتبار سے یہ بات بھی نہیں ہے کہ اس خاندان کا شمار محتاج اور بے یار ومددگار خاندانوں میں ہے، بلکہ اس خاندان میں چند گھرانے ایسے بھی ہیں، جو محتاجوں بیکسوں، یتیموں اور مسکینوں کی دادرسی کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

حضرت مولانا کے والد ماجدؒ :

حضرت مولانا سید الامین صاحب کے والد ماجد جناب مرحوم شاکر محمد بن سمیع الدین بن علیم الدین ایک نہایت پاک باز، علم دین اور علماء دوست بزرگ تھے۔ زندگی میں ایک بھی واقعہ شاید ایسا ہوا ہوگا کہ ان کی زبان نے کسی کا دل دکھایا ہو، بڑی شیریں زبان انسان تھے، عبادت الٰہی اور ریاضت ومجاہدہ میں ان کی پوری زندگی گزر گئی، نہایت زاہد اور پارسا بزرگ تھے، غریبوں اور مسکینوں کے لئے ملجا وماوی تھے، حتی المقدور غریبوں اور مسکینوں کی مدد وتعاون کرنے میں آپ کی پوری زندگی گزر گئی تھی، ان کے دربار سے کوئی سائل ومحتاج نامراد نہیں جاسکا تھا، غرض محتاجوں کو حتی المقدور قولی فعلی اور مالی مدد

کرتے تھے، اور ہر وقت اپنے احباب اقارب اور اپنی اولاد کو اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ زندگی میں اس بات کا پورا خیال رہے کہ تم سے جتنا بھی ممکن ہو سکے غریب مسکین اور بطور خاص طلبہ علوم دین کو مستفید کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری وجہ سے کسی مخلوق اور خاص طور پر کسی انسان کا دل میں تکلیف ہو۔

حضرت مولانا کی عمر ابھی بہت کم تھی کہ والد جناب شاکر محمد صاحب اس دنیا سے چلے گئے، یوں مولانا کی زندگی یتیمی سے شروع ہوئی تھی، والد مرحوم کے متعلق مولوی کمال احمد صاحب اپنے مختصر مقالہ میں لکھتے ہیں کہ :

> ''مولانا کے والد مرحوم شاکر محمد بڑے دین دار، خداترس اور عابد انسان تھے، زندگی میں شاید کسی انسان کے دل میں دکھ پہنچائے ہوں گے، والد چونکہ آپ کی صغر سنی میں وفات پا گئے تو مولانا کو اپنے والد کی خدمت کرنا نصیب نہیں ہوا تھا، جس کا احساس مولانا کو زندگی بھر ستاتا رہا تھا، اورافسوس کے ساتھ فرماتے رہتے تھے کہ کاش آج والد اس دنیا میں رہتے تو خدمت کرنے کی کتنی توفیق ہوتی'' ۔

حضرت العلام کی والدۂ ماجدہ :

حضرت مولانا کی والدۂ مرحومہ محترمہ لالو کا تذکرہ سنا تو بہت ہی رشک آیا، کہ کاش کہ سرزمین ارکان کی تمام مائیں ان جیسی ہوتیں، آپ اپنے برگزیدہ شوہر کی طرح علم دین اور علمائے اسلام دوست خاتون تھیں، بطور خاص طلبۂ علوم دینیہ سے نہایت محبت رکھتی تھیں، بڑی پاکیزہ صفات خاتون اسلام تھیں، عبادت الٰہی ان کی زندگی کا شیوہ بن چکی تھی، ہر حالت میں زبان ذکر الٰہی میں مشغول رہتی تھی، علمائے دین اور طلباء کی خدمت کو آپ بڑی عبادت سمجھتی تھیں، اس حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب رقمطراز ہیں:

> ''بطور خاص آپ کی والدہ ماجدہ نہایت علم دین اور عالم دوست خاتون تھیں۔ غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کو حسب توفیق قولی، فعلی اور مالی امداد کیا کرتی تھیں، چنانچہ آپ کی کفالت میں مولانا حافظ احمد رامیو بیلی جن کا انتقال بعد میں اورنگی ٹاؤن کراچی میں ہوگیا تھا اور اسی طرح مولانا صدیق احمد صاحبؒ بوسیدنگی کی تعلیم کے لئے آپ ہی نے کفالت کی تھی، ان دونوں بزرگوں نے علوم دینیہ وعربیہ آپ کی امداد وتعاون سے حاصل کئے تھے، صرف ان دونوں کو نہیں بلکہ آپ دیگر نادار

اورمحتاج طالب علموں کوخود بلابلا کرمصارف دیا کرتی تھیں، اوران کی پریشانی میں
تسلّی اورعلم دین کے حصول کے لئے حوصلہ افزائی کیا کرتی تھیں، ذلک فضل اللہ
یوتیہ من یشاء‘‘۔

مولانا شبیر احمد صاحب نے ’’حضرت مولانا کے والدین مرحومین‘‘ کے عنوان سے دوسری جگہ بہت خوب لکھا ہے، ان کی تحریر سے جہاں تک پتہ چلا کہ آپ کے والدین مرحومین بڑے سیدھے سادھے اور خداشناس بزرگ تھے۔ فیاضی اور سخاوت میں یکتائے روزگار تھے، لیجئے ان کا پورا بیان :

’’حضرت مولانا سید الأمین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والدین مرحومین بڑے سادہ لوح انسان تھے، اور سیدھے سادھے مسلمان بھی، دنیا پرستی سے گویا بے خبر تھے، خداشناس بلکہ خدارسیدہ درویش تھے، نماز کے پابند اور بڑی پاک زبان تھے۔ مگر صاحب عقل وخرد اور تمیز وشعور میں پختہ تھے، مضبوط دل وجگر اور بلند حوصلہ بزرگ تھے، ان دونوں کی پوری زندگی کاشتکاری اور کسب حلال میں بسر ہوئی تھی، دونوں ہی فیاضی اور سخاوت میں یکتائے روزگار تھے، حضرت مولانا کی والدہ کو بہت سارے طلبہ ماں کہہ کر پکارتے تھے، اور وہ بھی انہیں ماں کی ممتا دینے میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھتی تھیں، گھر کے چاروں طرف مختلف اقسام کے پھلوں کے بہت سارے اشجار تھے، دونوں بزرگ ان پھلوں کے ہدایا وتحایف رشتہ داروں، احباب اور متعلقین کے یہاں بھیجا کرتے تھے، بطور خاص علماء اور طلبہ کی مہمان نوازی کے ذریعے دعائیں لیتے تھے۔ والد مرحوم کم سخن، خندہ رو اور چہرہ ہر حال میں ہشاش بشاش رہتا تھا، ان کے چہرے میں ہمیشہ مسکراہٹ نمایاں رہتی تھی، ان کی بڑی اور پہلی پوتی حضرت مولانا سید الامین کی بڑی صاحب زادی شوکت کا بیان ہے کہ میرے جدامجد کو مجھ سے بڑی محبت وشفقت تھی۔ ایسی محبت وشفقت کہ جو بیان سے بھی بہت بلند۔

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنست ÷ بہ آب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

حضرت مولانا کواپنی والدۂ مرحومہ سے بڑی محبت اور بڑا لگاؤ تھا، والد تو آپ کو یتیم بنا کر اس جہان فانی

سے کوچ کر گئے، اور ان کی خدمت ہی نصیب نہیں ہوئی، مگر والدہ کی اتنی خدمت کی جس پر زمانہ کو رشک آیا تھا، زندگی بھر حضرت نے اپنی والدہ کی خدمت انجام دینے کو حرز جان بنالیا تھا، مولانا کی اپنی والدہ کی محبت اور ان کی خدمت کے حوالے سے مولوی کمال احمد صاحب اپنے مقالہ میں رقم طراز ہیں کہ:

’’حضرت مولانا اپنے والد کی خدمت کی سعادت سے محروم تھے، لیکن زندگی بھر حضرت اپنی والدہ کے سامنے بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے رہے، ان کے ساتھ ایسا حسن سلوک کا مظاہرہ کیا، جس پر زمانہ کو رشک آیا تھا، ایسی خدمت کی کہ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، مولانا کی خدمت جو انہوں نے اپنی والدہ سے کی تھی، اس کی تفصیلات سے تو زبان وقلم عاجز اور درماندہ ہے، مگر دو ایک چیز بطور بیانیہ یہاں درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ شیخ ارکان یعنی حضرت مولاناؒ جب گھر آتے تو سب سے پہلے اپنی والدہ کو سلام مسنون کرتے اور گلے لگا کر معانقہ کرتے، اور ایک دوسرے کو چومتے اور بھوسے دیتے تھے، مولانا نے گھر میں کبھی اپنی ماں کے بغیر کھانا نہیں کھایا، ان کی ماں کے حین حیات میں ایک واقعہ بھی شاید ایسا آیا ہوگا کہ انہوں نے اپنی والدہ کے بغیر گھر میں کھانا کھایا ہو، ماں بیٹے ایک ہی دسترخوان میں بڑی محبت سے کھانا کھاتے تھے، اور کبھی کبھار ایک دوسرے کو لقمے کھلاتے تھے، ان کی والدہ کی زندگی کے آخری ایام میں بھی حضرت مولانا اپنی ماں کے سامنے ایک چھوٹے بچے کی طرح پیش آتے تھے، میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے ماں کا حق پورا ادا کر دیا تھا‘‘۔

مولانا شبیر احمد صاحب نے حضرت مولانا کی ماں سے محبت کے حوالے سے مختلف جگہوں میں بہت کچھ لکھا، ان میں سے ایک مختصر اقتباس یہاں درج کرتا ہوں کہ:

’’مولانا کی محبت عامۃ الناس سے تھی ہی، مگر والدہ سے ان کی محبت بڑی دیکھنے کی چیز تھی، حضرت نے ماں کی اطاعت اور فرمانبرداری میں اپنے آپ کو فنا کر دیا تھا۔ باہر سے گھر آتے تو بہت دور سے ’’ماں ماں‘‘ کہہ کر آواز دیتے تھے، جہاں تک

میں جانتا ہوں کہ حضرت نے ماں کا حق ادا کر دیا تھا، ہر حالت میں ماں کو راحت پہنچائی تھی، اور ماں بھی ان کے ساتھ راضی تھی، غرض ان دونوں ماں بیٹے کی محبت اور لگاؤ ایک دیکھنے کی چیز تھی''۔

حضرت مولانا مرحوم کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی اطاعت صرف دینی نیکی ہی نہیں بلکہ ایک معاشرتی خوبی بھی ہے، جس کے ہونے نہ ہونے کے گہرے اثرات معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں، خاندان چونکہ معاشرے کی پہلی اکائی ہے، اور خاندان میں والدین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اس لئے ان سے حسن سلوک معاشرے کو ایثار، ہمدردی، محبت وانسانیت کا جذبات دے گا، ان کی اطاعت معاشرے میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرے گی۔ والدین کی بدسلوکی کے نتیجے میں نافرمانی کی فضا عام ہوگی، جو افراد کے اندر جذبۂ اطاعت ختم کردے گی، اور شتر بے مہار قسم کے وہ افراد پرورش پائیں گے، جنہیں قانون، احکام اور اخلاق کی پابندیوں کا احساس نہیں ہوگا۔ والدین عزت وشرافت کا معیار ہیں، والدین کی عزت واحترام اٹھ جانے سے شرافت کی عام قدریں مٹ جائیں گی، آنکھوں سے حیا اور دلوں سے ادب مٹ جائے گا، خودغرض اور خودسری کی لعنتیں معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی اور وہ اجتماعی سکون سے محروم ہوجائے گا۔ ایسے معاشرے کو انسانی معاشرے کی بجائے حیوانوں کا انبوہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ احادیث میں اطاعت والدین کو جس تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے اس سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ کے الفاظ میں والدین کے ساتھ نیکی اور نیک سلوک کی تکمیل چند امور سے وابستہ ہیں، ان کو کھانا کھلایا جائے، کپڑا دیا جائے، ان کی خدمت کی جائے،، والدین کو جب بھی کسی خدمت کی ضرورت ہو اور وہ پکاریں تو ان کے پاس جا کر حکم کی اطاعت اور فرمان برداری کرنی چاہئے، ان کے پاس بکثرت آمد ورفت رکھی جائے، اور اکثر ملاقات کرتا رہے، ان کے ساتھ بہت نرم کلامی سے گفتگو کرے، اور ان کو کبھی اف تک نہ کہے، نہ نام لے کر پکارے نہ بلائے، اگر ساتھ چلنے کا اتفاق ہو تو پیچھے پیچھے چلے، اگر کوئی شخص اس کے والدین کی عیب جوئی اور غیبت کرے یا ان کو تکلیف وایذاء پہنچائے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس کی مدافعت کرے، اور اپنی مجلس میں والدین کی انتہائی تعظیم وتکریم کرے، اور ان کے لئے ہمیشہ مغفرت ورحم کی دعا کرتا رہے حضرت مولانا کے سر سے

خیر والد کا سایہ بچپن ہی میں اٹھ گیا تھا، مگر آپ نے اپنی والدہ کی خدمت ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر کی تھی۔

مولانا کے بھائی اور بہنیں :

حضرت مولانا سید الامین صاحب کے تین بھائی اور چار بہنیں تھیں، ان کے کچھ، اجمالی تذکرے سے پہلے مولانا سمیت ان کے اسمائے گرامی حاضر خدمت ہیں۔

(۱) علم بہار

(۲) سید احمد

(۳) سید الأمین

(۴) مصطفی خاتون

(۵) بیگم بہار

(۶) محمد امین

(۷) محمد ہاشم

(۸) دل بہار

مولانا کی بڑی بہن علم بہار :

علم بہار مولانا کے بھائی بہینوں میں سب سے بڑی تھی، ناز پرودگی سے ان کی پرورش ہوئی تھی، ابھی ان کی پڑھائی کے لئے تیاری ہو رہی تھی ادھر اللہ تعالی کی طرف سے بلاوا آیا، اور چھ سال کی عمر میں انتقال ہوگئی۔ اس کے انتقال پر والدین بڑے پریشان ہوگئے تھے، کہا جاتا ہے کہ اس کے انتقال کا سبب موسمی بیماری تھا۔

سید احمد مرحوم :

علم بہار کے انتقال کے بعد مولانا کے بڑے بھائی کی ولادت ہوئی تو والدین بڑے خوش ہوئے تھے، مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا کہ ولادت کے صرف تین مہینے کے بعد اس نے بھی داغ فراغ دے چلا تھا، مولانا کے چھوٹے بھائی محمد امین صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے الدین سے سنا کہ ہمارے بڑے بھائی سید احمد کے انتقال کے بعد میرے والدین نے یہ خیال کیا تھا کہ اب ان کی اولاد دنیا میں نہیں

رہے گی، یوں انہوں نے منت مانی تھی کی اگر اللہ تعالی ہمیں ایک لڑکا عطا کرے گا تو اسے انشاء اللہ عالم دین بناؤں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میرے والدین کی منت قبول کی اور میرے بڑے بھائی حضرت مولانا سیدالأ مین صاحب کی ولادت ہوئی، اور اللہ تعالی نے ان کو دنیا میں ایک بڑے عالم دین بھی بنایا۔

مصطفی خاتون مرحومہ :

مصطفی خاتون حضرت مولانا کی چھوٹی بہن تھیں، ولادت ونشوونما تو خیر، تذکرہ کی ضرورت نہیں، بڑی ہوئی تو ان کی شادی ہوئی تھی، مگر اللہ تعالی کو اور منظور تھا کہ انہوں نے صرف ایک لڑکا جن کر اس جہان فانی سے رخصت لی ۔

بیگم بہار مرحومہ :

یہ بھی حضرت مولانا کی چھوٹی بہن ہے، بڑی ہوئی اور شادی بھی ہوگئی تھی، ارکان بنگلہ دیش کی سرحدی بستی بالوکھالی کے ایک صاحب عبدالحسین ان کا شوہر ہے، صاحب اولاد خاتون ہیں، ابھی بھی حین حیات ہیں، اللہ تعالی ان کی عمر اور صحت میں برکت عطا کرے۔

محمد امین :

حضرت مولانا کے چھوٹے بھائی محمد امین بڑے سادے سیدھے بزرگ ہیں، تعلیم تو اتنی زیادہ نہیں ہو پائی، مگر علم وعمل کے اس گھرانے کے اس فرد کو میں نے بڑے حلیم الطبع اور شریف الخصال پایا، راقم سطور کی ملاقات ان سے مکۃ المکرمۃ میں ہوئی تھی، ان سے خاندان اور گھرانے کے حوالے سے بڑی قیمتی معلومات حاصل ہوئیں، ماشاء اللہ تعالی صاحب اولاد اور قسما خوش حال بھی ہیں، اللہ تعالی ان کی عمر اور صحت میں برکت نازل کرے ،آمین۔

محمد ہاشم مرحوم :

محمد ہاشم صاحب مولانا کے چھوٹی بھائی تھے۔ علم ظاہر تو اتنی زیادہ حاصل نہ کر سکے، مگر دین اور دینی جماعت کے ساتھ ہمیشہ منسلک رہے تھے، بڑے پابند شریعت بزرگ تھے۔ شادی بھی ہوئی اور صاحب اولاد بھی ہوئے، ۱۹۷۸ میں سفر حج کیا، حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے سرفراز ہوکر وطن واپس آئے۔ اور واپسی کے فوراً بعد ۱۹۷۹ میں اس جہان فانی سے رخصت لے چلے، اللہ تعالی ان کے درجات بلند کرے ۔آمین

دل بہار مرحومہ :

دل بہار مولانا کے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی، بڑی ناز پروردگی سے ان کی پرورش ہوئی تھی۔ ابھی جوان بھی ہوئی اور شادی کی تیاری بھی ہو رہی تھی، مگر اس جوانی کے عالم میں اللہ تعالی کی طرف سے ان کا بلاوا آیا، اور سارے خاندان اور گھرانہ کو داغ فراغ دے چلی اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ولادت باسعادت :

حضرت مولانا سیدالأ مین شمالی منگڈو کی معروف بستی منگنما میں ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد مرحوم شاکر محمد بڑے پاک باز، فیاض، عابد اور درویش صفت انسان تھے، اور آپ کی والدہ مرحومہ بھی ایک نیک صفت اور عالم دوست خاتون تھیں، حضرت مولانا کی ولادت باسعادت کے حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب کے ایک تفصیلی بیان سے کچھ چیزیں درج ذیل ہیں :

’’حضرت مولانا سیدالامین رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی اور وفات حسرت آیات جس طرح لوگ جانتے ہیں کہ ۲۱/صفر ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۴ دسمبر ۲۰۱۴ء ہے، آپ کی ولادت باسعادت کے متعلق ایک روایت ہے کہ آپ کے والد محترم شاکر محمد اور والدہ محترمہ لالو کے درمیان شادی خانہ آبادی ہوئی ابھی نو سال گزر گئے تھے۔ مگر کوئی بھی اولاد ان کے گھر میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایسے میں آپ کی والدہ محترمہ اللہ رب العزت کے حضور نہایت عجز وانکساری کے ساتھ دعائیں کرتی تھیں کہ اے اللہ مجھے ایک ایسا لڑکا عطا فرما جو بڑے ہوکر دین اسلام کا مقتدا اور پیشوا بنے اور جس کی زندگی علم دین کی شاعت وترویج اور خلق خدا کی ہدایت ورشد میں گزرے، گویا کہ یہ والدۂ حضرت مولانا کی ایک منت تھی، اور ان دعاؤں کے ساتھ ساتھ بعض علاج ومعالجہ بھی کرتی رہیں۔ چنانچہ شادی کے نو سال بعد ان کی دعا قبول ہوئی، اور اللہ تعالی کی مہربانی سے ان کے گھر میں حضرت مولانا کی شکل میں ایک بیٹا پیدا ہوا، حضرت کی پیدائش پر ان کے گھر خوشیوں سے جھوم اٹھا تھا۔

ادھر ان کی پیدائش کے حوالے سے ایک گراں قدر بات یہ ہے کہ جس وقت آپ

پیدا ہوئے تھے، اس وقت آپ کے والدین کی اقتصادی یا معاشی حالت چنداں نازک تھی ۔ایسی نازک کہ جسے تنگ دستی کہا جاسکتا تھا، مگر آپ کی پیدائش کے فوراً بعد بحمداللہ ان کی معاشی حالت بدل گئی تھی، ان دونوں نے یہی سمجھا کہ اللہ تعالی نے ان کے گھر میں دین ودنیا کے حوالے سے ایک بابرکت فرزند عطا فرمایا ہے، والد مرحوم گنے کے کاشتکار تھے، گنے کی کچھ زمین کے علاوہ کچھ دیگر کھیتی باڑی کی زمینیں بھی تھیں، آپ کی پیدائش سے پہلے ان زمینوں سے کسی قدر ان کی زندگی کفایت شعاری سے گزرتی تھی، حضرت کی پیدائش کے بعد اللہ تعالی نے بڑی برکت فرمائی اور اگلے کئی سالوں میں والد محترم نے مزید زمینیں خریدیں اور خود بھی کھانے اور دوسروں کو کھلانے کی توفیق نصیب ہوئی تھی، غرض آپ کی ولادت باسعادت کے بعد ان کی زندگی کی خزاں بہار میں اور خشکی شادابی میں بدل گئی تھی۔ دادیہال میں تو آپ سب کے نور نظر تھے ہی، نانیہال میں آپ پہلا نواسہ تھے۔ جسے اللہ تعالی نے اپنی خاص رحمت سے انہیں عطا فرمایا تھا۔ سارے رشتہ دار آپ کو باری باری لے جایا کرتا تھا، جیسے کہ ان کی ولادت باسعادت نے ان دونوں خاندانوں میں خیر وبرکت کی بہار لائی ہو، ویسے حضرت کا بچپن اور لڑکپن بڑے خوش وخرم سے گزرا، ایسا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آپ بڑے ناز پروردہ تھے، آپ کے چہرے میں کہتے ہیں کہ لڑکپن میں بھی ایک خاص کشش تھی، جیسا کہ ایک جاذب نظر پھول ہو، باہر کے کوئی صاحب اس وقت آپ کو اچانک دیکھتے تو دم بخود رہ جاتے تھے، وہی خوب صورت اور جاذب نظر چہرہ، پرکشش آنکھیں، خنداں وکتابی پیشانی، بھولی بھالی اور شیریں آوازیں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں الغرض یہ ہے کہ:

زباں پر خدا یا کس کا نام آیا کہ
میرے نطق نے بولے میری زبان کے لئے

مکتب نشینی :

مسلمانانِ اراکان کی یہ قومی روایت ہمیشہ رہی ہے کہ ایک لڑکا جب پانچ چھ سال یعنی کچھ پڑھنے لکھنے کا قابل ہوجاتا ہے تو اسے بستی کے ابتدائی مدرسہ جسے یہاں کی عام زبان میں مکتب کہا جاتا ہے میں داخل کردیا جاتا ہے، جہاں کچھ دین کی مبادیات کے علاوہ علوم دینیہ اسلامیہ کی ابتدائی کتابوں بشمول قرآن کریم کا ناظرہ سکھایا جاتا ہے، توسرزمین ارکان کے مسلمانوں کی عام روایات کی طرح مولانا سید الامین بھی جب پانچ یا چھ سال کے ہوئے تو مکتب نشینی کرائی گئی تھی ۔ جہاں تک پتہ چلا کہ آپ نے مکتب میں یکے بعد دیگرے تین اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی جن کے نام گرامی یہ ہیں۔

(۱) میانجی کالامیاں صاحب مرحوم۔

(۲) میانجی اسعدالدین صاحب مرحوم۔

(۳) مولوی عبدالجبار صاحب مرحوم۔

مولانا نے ان حضرات سے کیا کیا پڑھیں، ان میں سے بعض حضرات نے آپ کی ابتدائی حالت کے حوالے سے کیا تأثر دیا تھا، اس کے متعلق مولانا شبیر احمد صاحب کا بیان ملاحظہ فرمائیے :

’’آپ کا بچپن بڑی ناز پروردگی سے گزرا، پھر جب ہوش وحواس ہوا تو مکتب نشینی کرائی گئی۔ مکتب میں بڑے شوق سے جایا کرتے تھے۔ مکتب میں آپ کے استاد اوّل میانجی کالامیاں مرحوم تھے، جو آپ کی جائے ولادت منگنما ہی کے رہنے والے تھے، آپ کی پڑھائی اور لڑکپن کی بعض عادت کے متعلق میانجی مرحوم کا بیان ہے کہ سید الامین کا ذہن بڑا تیز اور حافظہ بہت قوی تھا، حالت ایسی تھی کہ صرف ایک مرتبہ سبق پڑھا دینے سے اس کو پورا یاد ہوجاتا تھا۔ دوبارہ سہ بارہ پڑھانے سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی، ہم سبق لڑکوں سے ہمیشہ آگے بڑھ جاتا تھا ،روز تمام بچوں سے پہلے مکتب میں حاضر ہوجاتا تھا، روزانہ نیا سبق لیا کرتا تھا، اس کو گاؤں کے عام بچوں کی طرح کھیل کھود کی طرف خیال نہیں جاتا تھا، بڑا نظافت شعار اور صفائی پسند لڑکا تھا، میانجی صاحب نے آپ کی پڑھائی کی حالت، ذہن کی

تیزی اور حافظہ کی قوت دیکھ کر مولانا کو گاؤں کا اور ایک مکتب جس میں میانجی اسعد الدین صاحب تعلیم دیا کرتے تھے کا حوالہ کر دیا تھا، حضرت نے ان سے مزید دینیات کی مبادیات، اردو لٹریچر کی چند بنیادی کتابیں اور تعلیم الاسلام کے حصص کی تعلیم حاصل کی تھی ، پھر میانجی اسعد الدین صاحب مرحوم نے بھی آپ کی تعلیمی حالت دیکھ کر دوسرے اور ایک مکتب کے استاد مولوی عبدالجبار صاحب مرحوم جن کو علاقے میں بڑے مولوی صاحب کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا کا حوالہ کر دیا تھا، حضرت نے مولوی صاحب سے عربی درسیات کی چند ابتدائی اور بنیادی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد علاقے کے عربی مدرسہ میں داخلہ لیا تھا''۔

باضابطہ تعلیم کا آغاز :

حضرت مولانا سید الامین صاحب جس وقت عربی اور علوم اسلامیہ کی باضابطہ تعلیم کا آغاز کر رہے تھے۔ اس وقت سرزمین ارکان میں مدارس دینیہ واسلامیہ اتنے زیادہ نہیں تھے جتنے بعد میں ہو گئے تھے، اسی زمانے میں معروف چند مدارس میں سے ایک مدرسہ حضرت کی پیدائشی بستی سے کچھ فاصلے پر معروف بستی کھولا ربیل میں بھی تھا، جہاں دیگر چند علماء میں سے دو عالم دین بڑے نامور تھے، ان میں سے ایک حضرت العلامۃ داعیۃ العصر، مرشد کامل مولانا زین العابدین مرحوم اور دوسرا خطیب زمان مولانا محمد علی فاضل دارالعلوم دیوبند مرحوم تھے، جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ یہ دینی مدرسہ ان دونوں بزرگوں کا قائم کردہ ہے، اللہ تعالیٰ ان دونوں کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

حضرت مولانا سید الامین صاحب کو تعلیم کی ابتدا ہی سے بڑے مخلص اور مشفق اساتذۂ کرام کا سایہ ملا تھا۔ ایک تو حضرت غضب کے ذہین وفطین طالب علم پھر بڑے جان فشان بھی ، وان مخلص اور مشفق اساتذہ کے ساۂ عاطفت نے ان کی زندگی میں چار چاند لگا دیا تھا، آپ نے ان بلند بالا فضلائے کرام سے خوب خوب استفادہ کیا۔ اس با قاعدہ آغاز تعلیم کے حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ :

'' ابھی آپ کی عمر مبارک آٹھ سال ہوئی تو با قاعدہ تعلیم کی فکر لاحق ہوئی تھی، اس

حوالے سے ہر جانب دیکھا، مگر ان کی نظر بستی کھولا ربیل کے دینی مدرسہ پر جا لگی ، یوں باضابطہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہاں جا داخلہ لیا، اس زمانے میں اسی مدرسہ میں حضرت مولانا مرشد کامل زین العابدین صاحب مرحوم اور حضرت مولانا خطیب ارکان محمد علی صاحب مرحوم فاضل دارالعلوم دیوبند تشریف رکھتے تھے۔اور یہ مدرسہ بھی ان دونوں کا قائم کردہ ہے۔تو حضرت مولانا بطور خاص ان دونوں بزرگوں کے سایۂ لطف وعاطفت میں جا بیٹھے تھے، اور آپ نے وہاں خوب خوب جانفشانی ، پورے انہماک ، سرتوڑ محنت اور بڑی عرق ریزی سے درس نظامیہ کے ابتدائی مراحل طے کئے تھے، یوں ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ بحیثیت ایک ذہین وفطین طالب علم کے اطراف میں ہر کجا آپ کا نام بلند ہو گیا تھا، اور آپ کی اس شہرت نے حضرت کے اساتذۂ کرام کے لئے عزت وافتخار کا بھی سامان پیدا کر دیا تھا، اور یہ بات متحقق ہو گئی تھی کہ درخت پھل سے پہنچانا جاتا ہے، چنانچہ آپ کے اساتذہ کرام تا دم حیات آپ پر فخر وناز کیا کرتے تھے، مولانا کی اس وقت کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ جو بھی اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے کیوں نہ ہو آپ کی مجلس میں بیٹھا اور آپ کی علمی ومعقولی گفتگو سنا، وہ اس احساس سے سرفراز ہوا کہ ۔

بادصبا آج بہت اشک بار ہے ÷ شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلف یار ہے

سرزمین ارکان میں آپ کے اساتذہ :

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب نے سرزمین ارکان میں آپ کے اساتذۂ کرام کے حوالے سے بڑی تگ ودو اور پوری جانفشانی سے کام لیتے ہوئے تحقیق کی ہے، اس ذیل میں انہوں نے لکھا کہ ''خوب تفتیش وتدارک سے معلوم ہوا ہے کہ سرزمین ارکان میں چند جو حضرات علمائے کرام آپ کے استاد رہے تھے،، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں ۔

(۱) میاں جی کالا میاں صاحب مرحوم منگنماوی

(۲) میاں جی اسعد الدین صاحب مرحوم منگنماوی

(۳) بڑے مولانا، مولانا عبدالجبار صاحب مرحوم منگنماوی

(۴) مرشد کامل حضرت مولانا زین العابدین صاحب مرحوم کھولاربیلی، خلیفہ ومجاز بیعت حضرت شاہ صاحب تنگ بازاری بوسیدنگی۔

(۵) مولانا محمد علی صاحب کھولاربیلوی، خطیب ارکان مرحوم فاضل دیوبند

(۶) مولانا ابوالقاسم صاحب منگنماوی مرحوم مدفون عرب امارات

(۷) مولانا عبدالحق صاحب مرحوم پرامپوروی، مدرس جامعہ محمدیہ پرامپورو

(۹) مولانا محمد منور صاحب ۔

ظاہر ہے کہ آپ کے مذکورہ تمام اساتذۂ کرام کا تذکرہ یہاں کرنا ضروری ہے، مگر طوالت کے خوف سے ان میں سے صرف دو بزرگوں کا تذکرہ یہاں کیا جارہا ہے، ان میں سے ایک حضرت مولانا زین العابدین صاحب کھولاربیلی، اور دوسرے حضرت مولانا محمد علی صاحب معروف بہ ٹھنڈا مولوی صاحب کھلاربیلی ہیں۔

علی تعلیم کے لئے ہندو پاک کا سفر :

حضرت مولانا سید الامین کی اعلی تعلیم کے حوالے سے سفر کے متعلق ایک روایت ایسی بھی ملی کہ جب آپ نے جماعت ششم کی تعلیم مکمل کرلی تو آپ کے مخلص اور جوہر شناس اساتذۂ کرام نے مشورہ دیا کہ سید الامین کو اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان جانا چاہیئے، جب یہ بات مولانا کے کان پڑی تو مولانا نے اپنے شفیق اساتذہ سے عرض کیا کہ :

> ’’آپ حضرات ہمارے بڑے شفیق اساتذہ ہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ حضرات علم وعمل میں یکتائے روزگار ہیں، کیوں نہ میں آپ حضرات کی خدمت میں رہ کر اپنی تمام تعلیم مکمل کرلوں۔ اس میں کیا خرج ہے، جبکہ ہندوستان ہم سے بہت دور ہے، اگر وہاں کی تعلیم یہاں مل گئی تو اتنی مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے‘‘۔

بعد میں حضرات اساتذۂ کرام کے مشورے حکم میں بدل گئے، یوں آپ نے ہندوستان کی راہ لی، اور ہندوستان کا ایک معروف مدرسہ شاہی امروہہ میں داخلہ لیا تھا، ہندوستان میں آپ کی پڑھائی اور بعد میں پاکستان کے سفر کے متعلق مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ :

> ’’آپ اپنی اعلی تعلیم کے حصول کے لئے پاکستان نہیں بلکہ پہلے ہندوستان پہونچے تھے۔ وہاں مولانا اصغر علی صاحب رحمہ اللہ سمیت چند احباب کے مشورے بلکہ اصرار پر مدرسہ شاہی امروہہ میں داخلہ لیا تھا، جہاں آپ نے قطبی، بحث اسم اور اسی جماعت کی دوسری کتابیں پڑھیں، مولانا ارشاد چالی پرانگی کا بیان ہے کہ اسی مدرسہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا علامہ سنبھلی اور صدر مدرس مولانا محمد انور صاحبؒ آپ کی بہت بلند الفاظ میں تعریف کیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ہم نے اپنی عمر میں بہت سے طلبہ کو تعلیم دیا، مگر سید الامین جیسا ذہین کوئی طالب علم نہیں دیکھا، درس میں ہم جو کچھ پڑھاتے ہیں بعینہ اسی طرح ہمیں سنا سکتا ہے۔ پھر وہاں سے تبادلہ کے دوران اپنے بعض اساتذہ کی ہم راہ سرزمین اسلام پاکستان پہنچے، اور سیدھا جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور میں جا داخلہ لیا، جہاں آپ نے اپنی بقیہ تمام تعلیم مکمل کرلی، فنونات کی کتابیں حضرت العلاّمہ مولانا رسول خان صاحبؒ سے پڑھیں، جو شیخ المعقولات کے نام سے مشہور تھے، اور بخاری شریف حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نوراللہ مرقدہ سے پڑھی، اسی طرح اس ادارہ کی معروف شخصیت حضرت مولانا غلام محمد نورہ اللہ مرقدہ سے بھی بہت ساری کتابیں پڑھیں، مولانا وہاں کے دوران تعلیم مولانا غلام محمد صاحب کے حجرہ میں رہا کرتے تھے، اوران کے خادم خاص رہ چکے تھے، مولانا سے آپ کا خاص تعلق تھا، پڑھائی کے بعد بھی یہی تعلق برقرار رہا تھا، آپس میں دوطرفہ رابطے بھی رہتے تھے، ایک دفعہ حضرت مولانا سید الامین صاحبؒ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے تھے، دراں حالیکہ سرزمین ارکان اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت بہت

خراب چل رہی تھی، مولانا نے ایک تفصیلی رسالہ کے ذریعے اپنی اور سرزمین ارکان کی حالت زار کی اطلاع مولانا غلام محمد کو دی تو مولانا نے اپنے لائق شاگرد کو پاکستان میں ہجرت کرنے کا مشورہ دیا، اس جوابی خط میں اپنے شاگرد رشید کو بڑی محبت وشفقت بھرے الفاظ سے یاد کیا، اور فرمایا کہ اگر تم پاکستان آؤ گے تو دار العلوم کراچی جیسی موقر درسگاہ کی تدریسی خدمات تمہارے لئے حاضر ہیں، اسی طرح دیگر بڑی بڑی امیدیں بھی دلائیں ۔ ایک مرتبہ صاحب زادۂ گرامی مسٹر دین محمد صاحب بعض قومی وملّی امور کے حوالے سے پاکستان کا دورہ کیا ، اور اپنے والدگرامی کے شفیق استاد سے ملنے کراچی پہنچے، ملاقات کے دوران ان کا تعارف ہوا تو حضرت مولانا غلام محمد صاحب نے ان کو سینے سے لگایا، اور بڑے بلند الفاظ میں اپنے شاگرد رشید کو یاد کیا تھا''۔

جامعہ اشرفیہ لاہور میں آپ کی پڑھائی کے حوالے سے ایک روایت ایسی بھی ملی ہے کہ :

(۱) حضرت مولانا محمد حسن صاحب امرتسری خلیفۂ مجاز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نوراللہ مرقدہ سے توضیح تلویح نامی کتاب پڑھی ۔

(۲) مشکوۃ المصابیح حضرت مولانا ضیاء الحق صاحبؒ سے پڑھی۔

(۳) حضرت مولانا غلام محمد صاحب سے ہدایہ آخرین اور جلالین شریف پڑھی تھی۔

(۴) حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ سے بیضاوی اور بخاری شریف پڑھی۔

(۵) حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ جن کو استاد الکل کہا جاتا تھا سے ابوداؤد شریف پڑھی تھی۔

(۶) فنونات ومعقولات جن کی طرف آپ کی نسبت بڑی ہی گہری ہے کی اکثر وبیشتر کتابیں حضرت مولانا مہر محمد اور حضرت مولانا شریف اللہ صاحبؒ سے پڑی تھیں۔

مولانا حافظ محمد صدیق صاحب اپنی تالیف ''مشاہیر ارکان وبرما'' میں ہمارے حضرت مولانا سیدالامین کی لیاقت وصلاحیت اور استعداد کے متعلق ان کے استاد حضرت مولانا غلام محمد صاحب کی شہادت کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت ہی خوب لکھا ہے، ان کے مندرجہ عبارت سے قارئین کرام کو

پتہ چلے گا کہ مولانا سیدالامین پر اساتذۂ کرام کو کتنا ناز تھا۔ اور ان کے ساتھ اساتذہ کی کتنی توقعات وابستہ تھیں، لیجئے عبارت حاضر خدمت ہے :

''ممدوح کے استاد مولانا غلام محمد صاحب فاضل دار العلوم دیوبند تلمیذ (حضرت مولانا) مدنیؒ واستاد الحدیث جامعہ دار العلوم کراچی نے ۱۹۸۹ء میں دوران سبق فرمایا تھا کہ اے برمیو! تم یہاں کیوں آئے ہو، سارا علم تو سیدالامین برمی لے گیا ہے، پھر فرمایا کہ دار العلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد پہلی مرتبہ تدریس کے لئے جامعہ اشرفیہ لاہور میں میرا تقرر ہوا ، پہلے سال مجھے ہدایۂ آخرین ، جلالین اور میبذی جیسی کتابیں دی گئیں ، میں نے درسگاہ میں ایک برمی لڑکا دیکھا، بلا کا ذہین وفطین، سیدالامین اس کا نام تھا، اس کی محنت، فطانت وذہانت پر مجھے خود رشک آنے لگا، سیدالامین نے دورۂ حدیث جامعہ اشرفیہ میں پڑھا، اسی نے دورۂ حدیث کے سال اول پوزیشن حاصل کی، اس لئے انہیں سونے کا ہار انعام میں دیا گیا تھا۔ اور باقاعدہ سرکار کی طرف سے برما جانے کے لئے اعزازی ٹکٹ ملا تھا، مولانا نے مزید فرمایا کہ دار العلوم کراچی کے موجودہ ناظم واستاد الحدیث مولانا شمس الحق جلال آبادی دامت برکاتہم اور مولانا سیدالامین برماوی دونوں ہم کلاس تھے، انہوں نے مجھ سے ہدایہ آخرین اور جلالین پڑھیں، اگر روز محشر رب کائنات مجھ سے پوچھے کہ اے غلام محمد! تم کیا لے کر آئے ہو؟ تو میں سیدالامین اور شمس الحق کو پیش کردوں گا''۔

مولانا شبیر احمد صاحب نے ''سرزمین پاکستان میں آپ کے اساتذہ'' کے عنوان سے ایک اور تفصیلات دی ہیں، جہاں سے قارئین کرام کو مولانا کے دیگر اساتذہ اور ان سے کیا کیا کتابیں پڑھیں، اس حوالے سے کچھ معلومات حاصل ہوں گے، جہاں تک معلوم ہوتا ہے مولانا شبیر صاحب نے یہ تفصیلات خود حضرت مولانا کی زبان سے سنی ہوں گی ۔ چونکہ مولانا آپ کے تلمیذ رشید ہیں، چنانچہ ان کا بیان بڑا وزنی لگتا ہے، ملاحظہ فرمائے:

''سرزمین پاکستان میں حضرت مولانا سید الامین صاحب کے استادوں میں حضرت العلام رئیس التفسیر والحدیث مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ اور حجۃ الخلف بقیۃ السلف شیخ المعقولات مولانا رسول خان صاحب نور اللہ مرقدہ سر فہرست ہیں، ان کے علاوہ حضرت مولانا غلام محمد صاحب مرحوم بھی آپ کے شفیق استاد تھے، یہ تو ظاہر ہے کہ مولانا نے جماعت دوم سے لے کر دورۂ حدیث، پھر فنونات عالیہ جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور میں پڑھے، مولانا کے وہاں کے دوسرے اساتذہ جن سے آپ نے استفادہ کیا، ان کا اجمال کچھ یوں ہے کہ آپ نے حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ سے بخاری شریف اور بیضاوی شریف پڑھی، حضرت مولانا رسول خان صاحب سے قاضی مبارک، حمد اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، صدرا، شمس بازغۃ، شرح اشارات، توضیح تلویح اور ترمذی شریف جیسی کتابیں پڑھیں، اور حضرت مولانا غلام محمد صاحب جالندھریؒ سے ملاحسن، شرح مواقف، مشکوۃ شریف اوّل، امور عامہ، میبذی، مسلم الثبوت، حسامی اور تصریح نامی کتابیں پڑھیں، حضرت مولانا ضیاء الحق صاحبؒ سے مسلم شریف پڑھی، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ سے ہدایہ آخرین اور ابوداؤد، حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحبؒ سے جلالین شریف، دیوان متنبی، دیوان حماسہ اور شرح عقائد جلالی نامی کتابیں پڑھیں''۔

دورۂ حدیث میں اوّل پوزیشن اور تفوق کل :

حضرت مولانا تو ظاہر ہیں کہ بڑے ذہین اور غضب کے حافظہ کے مالک تھے، ابتدائی تعلیم سے لے کر متوسطہ اور اعلی درجات کے کسی بھی مرحلہ میں آپ ہمیشہ امتحانات میں درجۂ اوّل حاصل کررہے تھے۔ جامعہ اشرفیہ میں آپ کا حال ہمیشہ یہی رہا تھا، آپ کے ہم جماعتوں میں بہت ہی غضب کے ذہین طلبہ تھے، مگر کسی نے بھی آپ پر فوقیت حاصل نہ کرسکی تھی۔ یوں دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں بھی ایک طرف جماعت میں آپ نمبر اوّل آئے، اور اسی طرح کل جامعہ کے طلبہ میں بھی آپ نے تفوق کلی

کا پوزیشن حاصل کرلیا تھا۔ ادھر اس زمانہ میں ایک بات ایسی ہوگئی تھی کہ برصغیر کے تین نامور اسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور جامعہ اشرفیہ لاہور غرض تینوں درس گاہوں میں اتفاق سے دورۂ حدیث کے امتحان میں تفوق کل حاصل کرنے والے تینوں ارکانی طالب علم تھے، ان میں سے ایک تو ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید الامین تھے، جنہوں نے جامعہ اشرفیہ لاہور میں تفوق کلی کا پوزیشن حاصل کیا تھا، باقی دو میں سے ایک حضرت مولانا عبد السبحان صاحبؒ گھرا خالوی تھے، جنہوں نے دارالعلوم دیوبند سے اور دوسرے حضرت مولانا داعیۃ العصر فیض الاسلام تنگ بازاری تھے، جنہوں نے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے تفوق کلی کا پوزیشن حاصل کیا تھا۔ ان تینوں بزرگوں کی ان کامیابیوں کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق لکھتے ہیں کہ :

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ارکان برما کی زمین جس طرح زرخیز ہے اس طرح مردم خیز بھی ہے۔ اس خطۂ زمین میں قابل قدر اولیاء، ممتاز علماء اور جہاں دیدہ شخصیات و مشائخ پیدا ہوئے، لیکن نیرنگئ تقدیر اور گردش زمانہ کے تحت عالم اسلام ان قابل سپوتوں اور ہیروں سے ناآشنا اور ناواقف ہیں، یہ ضرب المثل تو پاکستان میں بھی مشہور ہے کہ اراکانی طلبہ کا حافظہ نہایت مظبوط، آواز سریلی اور تحریر بے حد اچھی ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء میں عالم اسلام کے تین بڑے نامی دینی اداروں سے تین ارکانی طالب علم نے دورۂ حدیث کے سال تفوق کل (پورے مدرسہ میں اوّل پوزیشن) حاصل کرکے ریکارڈ قائم کرنے کے ساتھ مدارس کے انتظامیہ و وابستگان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ جبکہ یہ طلبہ اہل لسان بھی نہیں ہیں۔ وہ قابل قدر مایہ ناز ہستیاں یہ ہیں :

(۱) محدث ارکان مولانا عبد السبحان گھرا خالوی، فراغت از دارالعلوم دیوبند تفوق کل کے ساتھ۔

(۲) مولانا سید الامین منگنماوی، فراغت از جامعہ اشرفیہ لاہور پاکستان۔ تفوق کل کے ساتھ۔ (۳) مولانا فیض الاسلام تنگ بازاروی، فراغت از مظاہر علوم

سہار نپور، تفوق کل کے ساتھ،، (محدث ارکان ص: ۱۴-۱۵)

اور مولانا مشتاق احمد صاحب استاد حدیث جامعہ دار العلوم مرنگلو اصاحب مولانا عبدالسبحان صاحب کے تذکرہ میں ایک واقعہ حضرت مولانا سیدالامین صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''علمی لیاقت اوران کی عظمت ووقعت پر یہ دلیل کافی ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے شیخ جامع المعقولات والمنقولات شیخ الحدیث حضرت مولانا سیدالامین صاحب منگنماوی نے تقریر کے دوران تحدیث بالنعمہ کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالسبحان صاحب مدظلہ العالی نے ساری دنیا کے سب سے بڑا مدرسہ جامعہ دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے سال ۱۹۵۶ء میں تمام طلبہ سے ممتاز تفوق کلی لے کر کامیابی حاصل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عجیب شان اور عجیب حسن اتفاق ہے کہ اس طرح حضرت شیخ الحدیث مولانا فیض الاسلام صاحب تنگ بازاریؒ نے جامعہ مظاہر علوم سہار نپور میں دورۂ حدیث کے سال ۱۹۵۶ء میں تمام طلبہ سے تفوق کلی لے کر کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح ناکارہ (حضرت شیخ الحدیث علامہ سیدالامین منگنماوی) بھی جامعہ اشرفیہ دار العلوم لاہور میں دورۂ حدیث کے سال ۱۹۵۶ء میں تمام طلبہ سے تفوق کلی لے کر کامیابی حاصل کی۔ اب میری آخری گزارش ہے کہ ہر مسلمان پر عموماً اور علماء پر خصوصاً ضروری ہے کہ اس بزرگ پیشوا کی صفات حسنہ اور سیرت جمیلہ کو مظبوطی سے پکڑ کر دونوں جہاں کی کامیابی حاصل کریں گے،، (محدث ارکان ص: ۱۳۰)

اس طرح مولانا ابوطاہر بن ابوبکر گھراخالوی صاحب نے بھی حضرت مولانا سیدالامین صاحب کی ایک تقریر کا تذکرہ اپنے مقالہ میں کیا ہے:

'' اس سال حضرت محدث صاحبؒ (حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب) بعض وجوہات کی بناء پر مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ پارہ سے منتقل ہوکر مدرسہ اشرف العلوم اودنگ آگئے، جب اس برس کا آخری وقت ہوا تو مدرسہ میں سالانہ جلسہ منعقد

ہوا، جس میں شمالی منگڈو کے استاذ مولانا سیدالامین کو دعوت دی گئی، اس دعوت کو قبول کر کے حضرت استاذ موصوف حاضر مجلس تھے، جلسہ میں وعظ کا سلسلہ جاری رہا، جہاں حضرت محدث سیدالامین منگنماوی نے بیان کیا، موصوف نے فرمایا کہ پہلے تمہید کے طور پر کہتا ہوں کہ مساجدوں میں جس طرح ام المسجد مسجد الحرام ہے اسی طرح مدرسوں میں بھی ام المدارس دار العلوم دیوبند ہے، اس تمہید کے بعد فرمایا کہ جس سال بندہ ناکارہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحبؒ سے دورۂ حدیث پڑھ رہا تھا اسی سال پاکستان کے اخبار میں آیا ہے کے مدرسہ دار العلوم دیوبند میں ایک ارکانی طالب علم عبدالسبحان امتیازی شان سے یعنی کل مدرسہ کے اوپر تفوق کلی کی حیثیت سے فائز ہوا، یہ خبر سن کر ہم برما والے طالب علم پاکستان میں جتنے موجود تھے سب نے خوشی منائی تھی، اور دعوت کا اہتمام کیا تھا''۔

ظاہر ہے کہ مولانا ابوطاہر صاحب کی اس تحریر میں مولانا سیدالامین صاحب کے تفوق کلی کا ذکر نہیں ہے، مگر آنجناب کی اس تحریر سے ایک بات یہ معلوم ہورہی ہے کہ حضرت مولانا سیدالامین صاحب اپنے معاصرین کے بڑے بلند الفاظ میں اعتراف فرماتے تھے، جوان کا ایک بڑا پن تھا، جبکہ بڑے بڑوں میں بار ہا ایسا دیکھا گیا ہے کہ اپنے معاصرین کے بلند الفاظ میں تذکرہ تو دور اعتراف بھی نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ حضرت کو بلند مقام عطا فرمائے۔

مولانا کے چند ہم سبق فضلاء :

مولانا شبیر احمد صاحب نے مولانا مرحوم کے ساتھ پڑھنے والے ایسے نامور ہم سبق فضلاء کے اسمائے گرامی لکھے ہیں، جو علم وعمل، درس وتدریس، رشد وہدایت کے حوالے سے اپنے اپنے علاقے میں مقتدا رہ چکے ہیں، ان سات فضلاء میں سے چھ تو ارکان سے تعلّق رکھتے ہیں، باقی ایک فاضل کا تعلق پاکستان کا صوبہ سرحد سے ہے، مولانا نے اس فہرست میں حضرت مولانا شمس الحق صاحب جلال آبادی ناظم واستاد حدیث دار العلوم کراچی کا نام گرامی درج نہیں کیا، یہاں ان کے اضافے کے ساتھ مولانا

کی دی ہوئی فہرست حاضر خدمت ہے۔

(۱) مولانا شمس الضحی صاحب پرامپوری مرحوم۔

(۲) مولانا محمد اسماعیل صاحب گرجنڈیہ، علی تائن جو، مدفون جنۃ البقیع۔

(۳) مولانا محمد سلطان صاحب، ناظم مدرسہ کائندہ فارا، منگڈو۔

(۴) مولانا عبدالاٗحد صاحب سرحد، پاکستان، سابق مدرس دارالعلوم کراچی۔

(۵) مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم منگنماوی۔

(۶) مولانا ارشاد صاحب، چالی پرانگی۔

(۷) مولانا شمس الحق صاحب جلال آبادیؒ، ناظم واستاد حدیث دارالعلوم کراچی۔

(۸) مولانا قاری بدرالاسلام صاحبؒ کھولا ربیلی استاد حدیث مدرسہ دارالسنہ نہلا، ٹیکناف۔ ظاہر ہے کہ ہندو پاک میں ان کے ہم سبق اور بھی بہت سارے فضلاء ہوں گے، مگر سردست ان کے نام ملنا مشکل نہیں بلکہ تقریباً ناممکن بھی۔

وطن واپسی :

روایت ملی ہے کہ حضرت مولانا سید الامین نے جامعہ اشرفیہ لاہور سے فراغت کے بعد جب وطن لوٹنے کا ارادہ کیا تو ان کے بعض اساتذۂ کرام نے مشورہ دیا تھا کہ تم ارکان جیسے ایک علاقہ میں مس فٹ ہوگے، وہاں تمہاری قدردانی شاید اتنی ہو سکے گی جتنی سرزمین پاکستان میں ہونے کا امکان ہے، اسی لئے تم پاکستان میں رہ جاؤ، یہاں تمہارے لئے امکانیات کا دروازہ کھلا ہے، مگر مولانا نے اپنے مخلص اساتذہ کو یہ کہہ کر جواب دیا تھا کہ :

''آپ حضرات جانتے ہیں کہ سرزمین ارکان میرا مادر وطن ہے، جہاں میری والدہ حین حیات ہیں، اور انگنت رشتے واقارب بھی وہاں موجود ہیں، جو میرا انتظار کر رہے ہیں، علاوہ ازیں سرزمین ارکان کو میری بہت ضرورت ہے، وہاں جا کر میں اپنا وطن اور وہاں کے مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، یہاں پاک وہند میں

اہل علم ودانش کی کوئی کمی نہیں، مگر ارکان میں خاصی کمی ہے، جبکہ دین ودعوت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جہاں دین دعوت، رشد وہدایت اور درس وتدریس کی اہلیت رکھنے والوں کی کمی ہوگی، وہاں جا کر اس کی اہلیت رکھنے والوں کو کام کرنا چاہئے''۔

حضرت مولانا کے اس جواب پر اساتذہ بڑے خوش ہوئے اور دعائیں دے کر حضرت کو رخصت کر دیا۔ چونکہ روایت کے مطابق حضرت کو حکومت پاکستان کی طرف سے وطن واپسی کے لئے اعزازی ٹکٹ مل چکا تھا، یوں وطن واپسی میں کوئی دشواری نہیں ہوئی، یوں مولانا نے اپنے اساتذہ اور دوستوں سے رخصت لئے وطن کی راہ لی، مولانا کے اقربا میں سے ایک صاحب کا بیان ہے کہ :

''مولانا سید الامین صاحبؒ کی فراغت کے متعلق جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ نے ۱۹۵۶ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور سے فراغت حاصل کی تھی، آپ فراغت کے بعد سیدھے وطن لوٹے، ہمارے بزرگوں میں مولانا مرحوم اس حیثیت سے بہت داد کے مستحق ہیں کہ آپ پاکستان کے کسی بھی بڑے ادارے میں اعلی مدرس کے بطور تعلیم دے سکتے تھے، لیکن انہوں نے اپنے وطن آ کر علم کی ضیاپاشی کو مناسب سمجھا تھا، اور بعد میں متحقق ہوا کہ ہزاروں طالبان علوم نبوت نے آپ سے فیض حاصل کیا، آپ کے بڑے بڑے تلامذہ میں کس کس کا نام لوں اور کس کس کو چھوڑوں، سینکڑوں ایسے بھی ہیں، جنہوں نے اپنے لائق وفائق استاد کی طرح درسگاہِ علوم نبوت میں بیٹھے تشنگان علوم نبوت کو سیراب کیا، اور اب بھی بہتوں ایسے ہیں کہ جن کے فیوض وبرکات ملک کے گوشے گوشے میں نظر آتی ہیں''۔

ظاہر ہے کہ مولانا جس وقت فارغ ہو کر وطن واپس لوٹ رہے تھے اس وقت پاکستان دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں تھا، اس لئے مولانا کو اپنے وطن واپسی میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی، البتہ یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا مولانا کی واپسی بذریعۂ ہوائی جہاز ہوئی یا بحری جہاز، بہر حال مولانا صحیح سلامت ٹیکناف پہنچ گئے تھے۔ چونکہ مولانا کی وطن واپسی کی اطلاع خویش واقارب کو مل چکی تھی، یوں سب چشم براہ منتظر فردا تھے۔ چنانچہ مولانا کی وطن واپسی کے حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب کے بیان کا

ایک اقتباس لانا مناسب سمجھتا ہوں کہ :

''آپ جامعہ اشرفیہ لاہور کے ممتاز طلباء میں سے تھے، جہاں سے تکمیل علوم وفنون کر کے آپ وطن واپس ہوئے، ادھر آپ کی وطن واپسی کی خوش خبری سن کر ان کی آبائی بستی منگنما کے لوگ سمیت دیگر بستیوں کے لوگ آپ کے شاندار استقبال کے لئے بھر پور تیاری کے ساتھ منتظر فرما تھے، چنانچہ چند دن کے بعد خبر ملی کہ آپ صحیح وسلامت سرحدی قصبہ ماشاء اللہ آج کل پورا شہر بن گیا ہے ٹیکناف آپہنچے، چوں کہ لوگ پہلے ہی سے تیار بیٹھے ہوے تھے کہ خبر ملتے ہی چند لوگ کشتی پر سوار ہو کر حضرت کو لانے کے لئے ٹیکناف جا پہنچے، اور بروز پیر بعد الظہر حضرت کی کشتی دریائے ناف عبور کر کے منگنما بستی کے پار لگ گئی تو ہزاروں لوگوں نے نعرۂ تکبیر بلند کر کے آپ کا شاندار استقبال کیا، طلبۂ مدارس دینیہ اور بچوں کی ایک جم غفر نے استقبالیہ اشعار گاتے گاتے آپ کو گھر لایا''۔

رز مین ارکان میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ اگر کوئی طالب علم فراغت کے بعد وطن واپس ہوتے تو یہاں اس کے استقبال کے لئے ایک شاندار مجلس قائم کی جاتی تھی، جس میں علاقے کے بڑے بڑے جید علمائے کرام اور دانشوران عظام سمیت گاؤں کے ارباب حل وعقد مدعو کئے جاتے تھے، جس میں قرآن کریم کی تلاوت کے بعد مدحیہ ونعتیہ کلام پڑھے جاتے، علماء وعظ ونصیحت فرماتے، اور جس طالب علم کے استقبال پر یہ مجلس قائم کی جاتی تھی وہ اس مجلس میں قرآن وسنت کی روشنی میں خطاب کرتا تھا، چنانچہ حضرت مولانا کے لئے بھی گھر کے آنگن میں بعد العشاء ایک استقبالیہ جلسہ منعقد کیا گیا تھا، جس میں عام دستور کے مطابق علاقہ بھر کے علمائے کرام، دانشوران عظام، گاؤں اور اطراف کے رؤساء مدعو کئے گئے تھے، اس استقبالیہ جلسہ میں تلاوت کلام اللہ کے بعد مدحیہ ونعتیہ کلام پڑھے گئے، چند جید علماء نے وعظ ونصیحت کی باتیں کیں، اور آخر میں مولانا کو خطاب کرنے کے لئے بلایا گیا تھا، مولانا کے خطاب کے متعلق مولانا شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''حضرت کی آمد کی خبر سنتے ہی اقرباء نے گھر کے آنگن میں مجلس استقبالیہ جسے

''مجلس وعظ'' کہا جاتا تھا کی تیاری کر لی تھی، چنانچہ آمد کے فوراً بعد بعد العشاء مجلس قائم کی گئی تھی جس میں علاقے بھر کے بڑے بڑے علماء، دانشوران اور گاؤں کے رؤساء بلائے گئے تھے، اور عوام کی بھی ایک بھاری تعداد تھی، آپ نے اس مجلس میں ایسا خطاب کیا کہ علماء متحیر اور دم بخود رہ گئے تھے، ہر طرف سے شاباش اور مرحبا مرحبا کی صدائیں بلند ہونے لگیں، یوں بھی حضرت کی آواز بڑی بلند تھی، اور موضوع بھی پر لطف، مولانا نے اپنے اس خطاب میں قرآن سنت کی روشنی میں علم وعمل کا ایک سمندر بہا دیا تھا، اس پر مستزاد کہ آپ نے اپنے خطاب میں یہ دکھا دیا تھا کہ روہنگیا زبان میں بھی کتنی مٹھاس اور شیرینی ہوتی ہے، اور دیگر زبانوں کی طرح اس میں بھی بذات خود کتنی فصاحت وبلاغت ہوتی ہے، مولانا نے اپنے خطاب کے دوران ایسے ایسے عجیب وغریب حیرت انگیز اور عبرت ناک واقعات بیان کئے، جنہیں سن کر خود حاضرین میں سے خاص طور پر علماء کہنے لگے کہ ہم نے اپنی زندگی میں ایسے واقعات نہیں سنے، یوں سارے علماء آپ کی فصاحت وبلاغت، زبان کی شیرینی ومدھور پن کی داد دینے لگے تھے، اور اس بات پر حیراں تھے کہ خطاب کا ہر ایک پیرایہ قرآن وحدیث سے مزین، فصاحت وبلاغت کا مرقع ہے، اور ہر ایک آپ کی لیاقت ولباقت، تبحر علمی اور انداز خطاب پر ششدر رہ گئے تھے، اور ان کی بس ایک ہی خطاب کی کرشمہ سازی تھی کہ آپ کی شہرت نہ صرف علاقے بھر میں بلکہ دور دراز کے علاقوں میں پھیل گئی تھی، منگڈو، بوسیدنگ سمیت سرزمین ارکان کے دار الحکومت اکیاب تک میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ سید الامین نامی ایک عالم سرزمین پاکستان سے پڑھ کر وطن واپس آ چکے ہیں''۔

دھر مولانا کی وطن واپسی کے حوالے سے حضرت مولانا محمد اسلام صاحب نے ایک واقعہ بتایا ہے کہ :

مولانا سید الامین صاحب جامعہ اشرفیہ سے فراغت کے بعد وطن واپس آرہے تھے، جس دن آپ ٹیکناف پہنچے اس دن منگنما میں ایک دینی جلسہ ہو رہا تھا۔ حضرت مولانا عبد الجبار معروف بہ فقیر مولوی

صاحب اس جلسہ کے صدر نشین تھے۔ اچانک مولانا نے کالا میاں رواسوگری جو اس جلسہ کے منتظم اعلی تھے کو قریب بلا کر فرمایا کہ تمہارے گاؤں میں ایک دین اور علم کا چراغ آرہا ہے، اس کے کچھ دیر بعد ادھر سے ایک آدمی دوڑے دوڑے آرہا تھا، جلسہ کے چند لوگ اس کی طرف بڑھے، شاید کوئی ناگہانی بات ہوگئی تھی، اس دوڑنے والا سے دوڑنے کا سبب پوچھا گیا تو بتایا کہ آمنہ بازار میں۔ مولوی سید الامین پہونچے ہوئے ہیں۔ باوجودیکہ ہم اس وقت عمر کے لحاظ سے بہت چھوٹے تھے۔ خبر ملتے ہی بستی کے لوگ پرچم لئے استقبال کو آگے بڑھے۔ استقبال کے دوران لوگوں نے مولوی سید الامین زندہ باد کا نعرہ لگایا، مگر مولانا نے فرمایا تھا کہ مولوی سید الامین زندہ آباد نہ کہو، بلکہ کہو کہ شاکر محمد زندہ آباد، اب لوگوں نے شاکر محمد زندہ باد کا نعرہ بلند کیا تھا اور یادرہے کہ میں بذات خود اس جلوس میں شریک تھا۔

شادی خانہ آبادی :

وطن واپسی کے فوراً بعد مولانا کی والدہ اور خویش واقارب نے یہ ضروری سمجھا کہ سب سے پہلے مولانا کی شادی خانہ آبادی ہوجانی چاہئے، اور یوں بھی ہمارے یہاں ایک عام دستور ہے کہ ہر ایک طالب علم کو فراغت کے متصل بعد شادی کرایا جاتا ہے، اور مولانا کی بھی یہی حالت ہوئی تھی، خویش واقارب ایک لائق لڑکی کی ڈھونڈھ میں مشغول تھے، ہر طرف سے شادی کے پیغامات آنے لگے تھے، ہر ایک اعلی خاندان یہی چاہ رہا تھا کہ ان کی لڑکی سے مولانا کی شادی ہوجائے، شادی کے حوالہ سے بڑی بڑی پیش کش بھی ہورہی تھی، کوئی کہتا ہے کہ جہیز میں ہم یہ دیں گے، وہ دیں گے، سونے چاندی، جائدادیں اور زمینوں کی پیش کش پر پیش کش ہورہی تھی، مگر قدرت کو اور کچھ منظور تھا، بالآخر مولانا کی ایک ایسی لڑکی سے شادی ہوگئی تھی، جو کہنے میں یتیم تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی کے اندر وہ ساری خوبیاں بھردی، جو حضرت مولانا کی اہلیہ ہونے کی شایان شان ہوں، اللہ تعالیٰ نے اپنی اس بندی کو ظاہری اور باطنی حسن وخوبی سے نوازا تھا، فیاض ازل نے اس کے مقدر میں سرزمین ارکان کے وقت کے سب سے بڑے عالم دین کی رفیقۂ حیات بننے کی بات لکھ دی تو اس کے اندر وہ ساری خوبیاں بھی بھردیں، جن سے حضرت مولانا زندگی بھر محظوظ ہوسکے، مولانا کی اس شادی خانہ آبادی کے حوالے سے مختلف

باتیں روایات کی شکل میں سننے میں آئیں، ان تمام باتوں میں سے مولانا شبیر احمد صاحب کی روایت اس لئے قابل قدر ہے کہ مولانا ایک طرف حضرت مولانا کے داماد ہیں، تو دوسری طرف ان کے لائق وفائق اور ماشاء اللہ ہر ایک اعتبار سے مستعد شاگرد رشید بھی، علاوہ ازیں مولانا شبیر احمد صاحب کی روایت اس لئے بھی قابل قدر ہے کہ آپ کی عدالت وثقاہت پر ہر ایک اعتبار سے مہر تصدیق لگا ہوا ہے، لیجئے مولانا کا بیان :

''مولانا کی شہرت چاردانگ عالم میں پھیل گئی تھی، بڑے بڑے مدارس دینیہ سے خطوط آنے لگے تھے کہ حضرت وہاں تدریسی خدمات انجام دینے کے لئے آئیں، ان تمام خطوط میں سے مدرسہ عالیہ شقدار پارہ کا خط بڑا قابل قدر ہے، اس جامعہ کے ارباب حل وعقد نے مختلف دلائل کے ساتھ ایک خط مولانا کے نام بھیجا، اور بتایا ہے کہ منگڈو کے شہر میں ہونے کی وجہ سے اسی جامعہ کو آپ جیسے باصلاحیت اور مستعد مدرس کی بڑی ضرورت ہے، ایک طرف تدریسی خدمات کی بات چل رہی تھی، تو دوسری طرف شادی خانہ آبادی کے لئے مختلف مقامات سے پے درپے پیغامات آنے لگے تھے، بالآخر حضرت مولانا اصغر علی صاحب (جو مولانا کے نہ صرف دیرینہ ساتھی تھے بلکہ مولانا کو بہت چاہنے والے مدح سراؤں میں سے بھی تھے، مولانا بھی ان کو ہمیشہ اپنا مخلص یار غمگسار سمجھتے رہے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ آپ کے لئے بعض اعتبار سے محسن بھی تھے) نے یہ خیال ظاہر کردیا کہ مولانا نور الکبیر مجذوب بن حضرت مولانا سید اکبر کی صاحب زادی محترمہ مساۃ شفیقہ بیگم کو میں نے مولانا سید الامین کیلئے پہلے ہی سے منتخب کررکھا ہے، اس کے علاوہ کسی دوسری جگہ کی کسی بھی لڑکی سے شادی کی بات کہنا مناسب نہیں ہوگا، مولانا اصغر صاحب مرحوم کی یہ تحکمانہ انداز میں گزارش تیر بہدف ہوگئی تھی، مولانا سید الامین صاحب کی والدہ ماجدہ جو نہایت غریب پرور اور علماء دوست خاتون تھیں کہ انہوں نے بلا چوں چرا مولانا اصغر علی صاحب کی بات قبول کرلی، اور چند دنوں کی تیاری پر اللہ

تعالیٰ کی مہربانی سے شادی ہوگئی، اس شادی میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شادی بڑی سادگی سے ہوئی، ایسی شادی جو ایک عالم دین اور آنے والے وقت کے سر زمین ارکان کے سب سے بڑے مرجعیہ کی حیثیت رکھنے والی شخصیت کی شایان شان ہو، جس میں شور وغل، نازیبا حرکات وسکنات، بدعت وخرافات کا کوئی شائبہ تک نہ رہا تھا''۔

حضرت کی رفیقۂ حیات شفیقہ بیگم

حضرت مولانا سید الأمین صاحبؒ کی رفیقۂ کی حیات محترمہ شفیقہ بیگم کا گھرانہ اور خاندان ایک علمی اور فکری گھرانہ اور خاندان ہے، زمانۂ قدیم سے اس خاندان میں بڑے بڑے علماء اور خدا رسیدہ درویش اور قوم وملّت کے خدام پیدا ہوتے رہے تھے۔

محترمۂ مرحومہ شفیقہ بیگم کی شادی سے قبل ان کا نانا مولانا سید اکبر صاحب رحمۃ اللہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ طیبہ کی نیت سے حجاز مقدس چلے گئے، اور بحکم خداوندی عین میدان حج میں ان کا انتقال ہوگیا تھا، یہاں مرحوم کے دو صاحب زادے تھے، مولانا قاری عبد الماجد اور مولانا محمد حسین صاحب، دونوں لائق فائق اور اخلاق فاضلہ کے مالک تھے، والد بزرگوار کی حالت جذب میں انتقال کے بعد محترمہ شفیقہ بیگم اپنے دونوں ماموں مولانا قاری عبد الماجد اور مولانا محمد حسین کی کفالت میں تھیں، ظاہر ہے کہ محترمہ یتیمہ بن چکی تھیں، کیوں کہ ان کے والد مولانا نور الکبیر صاحب مجذوب ٹیکناف اور شاہی فریدیب کے جنوب میں پائے جانے والے جزیرہ میں چلے گئے تھے۔ اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا تھا، محترمہ کے نانا حج بیت اللہ کو جاتے وقت اپنے لائق وفائق فرزندوں سے وعدہ لیا تھا کہ شفیقہ بیگم کی شادی میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہئے، اور ان دونوں نے بھی اپنے والد صاحب کو دیئے گئے وعدہ نباہنے میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی، شادی میں دیگر سر وسامان کے علاوہ کچھ زمینیں بھی بطور ہدیہ دی گئی تھیں۔

غرض یہ تھے محترم شفیقہ بیگم کے خاندان کے چند بزرگان دین، جن کا تذکرہ چند سطور میں کر دیا گیا، جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ محترمہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ننیہال میں پھلی بڑھیں، لائق نانا اور دونوں عالم دین ماموں کی زیر سرپرستی ان کا پروان چڑھا، گاؤں کے مکتب میں قرآن کریم اور

دینیات کی چند کتابیں پڑھیں، بڑی ذہین وفطین تھیں، اور جو کچھ بھی پڑھیں، اس پر عمل کرنے کی تادم آخر کوشش کی، ان کا انتقال اپنے قابل قدر شوہر حضرت مولانا سعید الامین کی رحلت سے چھ مہینے پہلے ہوگیا تھا، اور اپنے سسرال کی بستی منگنما میں مدفون ہیں۔

شادی کے بعد مولانا مرحوم کی خانگی زندگی کے حوالے سے کچھ باتیں فاضل مکرم مولانا شبیر احمد صاحب نے لکھیں، ان کی تحریر سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

''حضرت مولانا کی رفیقۂ حیات محترمہ ومرحومہ شفیقہ بیگم بڑی پارسا عابدہ خاتون تھیں، اور جب سے شادی ہوئی حضرت مولانا نے کبھی اور کسی بھی حالت میں اپنی رفیقۂ حیات سے دور رہنا گوارہ نہیں کیا، جامعہ عالیہ شقدار پارہ کی تدریسی زندگی میں ان کے لئے جامعہ کے احاطے میں ایک مکان کا اراکین جامعہ نے بندوبست کر دیا تھا، جس میں حضرت کی پہلی صاحب زادی محترمہ شوکت آرا کی ولادت ہوئی، آپ جب جامعہ اسلامیہ محمدیہ پرامپور میں چلے آئے تو یہاں بھی اراکین جامعہ نے حضرت کے لئے ایک خاص مکان کا بندوبست کر دیا تھا، جس میں حضرت کی مذکورہ بیٹی شوکت آرا کی شادی ناکارہ راقم سطور شبیر احمد صاحب منگالوی فاضل جامعہ اسلامیہ نیوٹاون کراچی سے ہوئی، (یہ مولانا شبیر احمد صاحب وہی فاضل محترم ہیں، جن کی تحریر کے اقتباسات ان سطوروں میں بار بار لائے جا رہے ہیں) محترمہ شفیقہ بیگم اپنے شوہر تاریخ ارکان کا درخشندہ ستارہ مولانا سید الامین کی مقدور بھر خدمت کرتی رہیں، آپ کی وفات حسرت آیات کے چھ مہینے قبل شفیقہ بیگم کی وفات ہوگئی تھی، انّا للہ وانّا الیہ راجعون''۔

مولانا کی عادات واطوار کے متعلّق اہلیہ محترمہ کا بیان :

فاضل گرامی قدر مولانا شبیر احمد صاحب نے حضرت مولانا مرحوم کی اہلیہ محترمہ مرحومہ کا ایک طویل بیان درج کیا ہے، اور یہ پورا بیان مولانا کے اخلاق وعادات پر روشنی ڈالتا ہے، اس پورے بیان میں سے کچھ ضروری چیزیں نمبروار یہاں درج کی جا رہی ہیں۔ اہلیہ محترمہ کا بیان ہے کہ :

(۱) میرے فاضل شوہر گرامی حضرت مولانا سیدالامین صاحب ہمیشہ خشیت الٰہی میں رہتے تھے، اللہ تعالیٰ کا ڈران پر ہمیشہ سوار رہتا تھا، اور فرمایا کرتے تھے کہ بندے کے دل میں ہمیشہ خوف خدا رہنا چاہئے، جس بندے کے دل میں خدا کا ڈر نہیں ہوگا، وہ زندگی میں جبھی چاہے گا نازیبا حرکت کر سکے گا۔
(۲) حالت غضب میں آپ کی زبان سے نازیبا باتیں اگر چہ تادیبًا ہی سہی نکل جاتیں تو فورًا اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوجاتے تھے، اور بار بار استغفار پڑھا کرتے تھے۔
(۳) متعلقین، شاگردوں یا اپنی ہی اولاد سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوجاتی تو آپ غضب وغصّہ سے بھڑک اٹھتے، اور الّو الّو گدھے کے الفاظ سے ڈانٹ ڈپٹ کیا کرتے تھے، جبھی غصہ رفو ہوجاتا تو جسے ڈانٹا گیا اسے پاس بلاتے اور نصیحت کیا کرتے تھے، دوران نصیحت یہ فرماتے کہ دیکھ یہ تیری نازیبا حرکت ہے اور یہ میرے غصّہ کی حالت، اب تو تیری نازیبا حرکت بھی نہیں ہے اور نہ میرے غصّہ کی حالت، میں نے صبر کیا اور تجھے معاف کردیا، آئندہ ایسی حرکت سے ہمیشہ باز رہنا۔
(۴) حضرت کو ایسا بھی دیکھا گیا تھا کہ مدرسہ کے بعض منتظمین کی بے جا حرکتوں سے بے اطمینان ہوکر کھڑے ہوجاتے، اور غصّے میں آکر زمین پر بار بار پاؤں مارتے تھے اور نام لے لے کر بلاتے، انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے تھے، اور جبھی غصّہ ختم ہوجاتا تو ان کو پاس بلا کر بٹھاتے اور اصلاح کیا کرتے تھے۔
(۵) عبادت الٰہی اور خاص طور پر قرآن کریم کی تلاوت میں ہمیشہ سرشار رہتے تھے، انہیں کلام اللہ سے اس قدر محبت وشغف تھا کہ خود تو پڑتے ہی تھے، کبھی کبھار قارئین کرام کو بلاکر قرآن کریم کی سورتیں سنتے تھے، اور ان پر مستی ومحو کی حالت طاری ہوجاتی تھی۔
(۶) مطالعۂ کتب سے کوئی مفید اور انوکھی باتیں ملتیں تو فورا گھر کے تمام افراد کو پاس بلاتے، اور انہیں سنا کر خود بھی محفوظ ہوتے اور ان کو بھی مستفیض کرتے تھے، بعد ازاں محلّے کی مسجد میں بعد نماز لوگوں کو سنایا کرتے تھے، اور لوگ حضرت کی باتیں سننے کے لئے ہمیشہ مشتاق رہتے تھے۔
(۷) حضرت کو اہل بیت سے خاصی محبت تھی، خاص طور پر حضرت سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑی عقیدت تھی، ان کی شہادت کی باتیں سنا سنا کر رویا کرتے تھے، اس سلسلے میں حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کی تصنیف ''انسانیت موت کے دروازے پر'' ہمیشہ مطالعہ میں رہتی تھی، مطالعہ کے دوران

حالت وجد میں آجاتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ چاہے لوگ مجھے شیعہ کہے، اس سے کوئی پرواہ نہیں، سب جانتے ہیں کہ میں شیعہ نہیں ہوں، میں اہل سنت والجماعت میں سے ہوں، مگر مجھے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت گوارہ نہیں، اور نا قابل برداشت بھی۔
(۸) نیم شبی اور نالۂ سحر گاہی آپ کی زندگی بن چکی تھی، آخری شب میں اہل خانہ کو جگاتے ہوئے یہ آیت زبان پر ہوتی تھی :

وأمر اهلک بالصلاة واصطبر عليها۔

مولانا کی دوسری اہلیہ خدیجہ بیگم :

حضرت مولانا کی اہلیہ شفیقہ جسمانی اعتبار بہت کم زور ہوگئی تھیں، اور ایک روایت کے مطابق آنکھوں کی بینائی بھی بہت کمزور ہوگئی تھی، جبکہ گھر میں حضرت کے سب سے چھوٹے صاحب زادہ عرفان دماغی مرض کا شکار تھا، ایسے حالات میں مولانا کی خانگی زندگی بہت ہی خراب ہوگئی تھی، تو مولانا کو مجبورا اور ایک شادی کے لئے سوچنا پڑا تھا، یوں بڑی تگ ودو کے بعد رشتہ داروں میں سے محترمہ خدیجہ بیگم بنت واعظ کریم منگنماوی پر نظر پڑی، یوں مولانا کا یہ خیال جب واعظ کریم صاحب نے سنا تو بڑے خوش ہوئے اور بلا چوں چرا اپنی بیٹی کا ہاتھ پیلا کرنے کے لئے راضی ہوگئے تھے۔
خدیجہ بیگم کے والد جناب واعظ کریم منگنماوی بڑے دین دار اور خدا ترس انسان تھے، تبلیغی جماعت کے ساتھ منسلک تھے، اور دعوت لوگوں تک پہنچانے کے لئے بڑے سرگرم تھے، علاقہ میں ان کو امیر صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، عالم دوست اور غریبوں کے بڑے خیر خواہ تھے، بعد میں انہوں نے وطن عزیز سے ہجرت کی، آج کل بنگلہ دیش کا معروف علاقہ کھوٹا کھالی میں ہجرت کی زندگی گزار رہے ہیں، یہاں بھی آپ نے دعوت دین کو زندگی کا حرز جان بنا رکھا ہے۔
خدیجہ بیگم سے مولانا کی شادی ہوئی، عرصۂ دراز گزر گیا تھا، مگر اولاد سے محروم، علاج ومعالجہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے بطن سے ایک بیٹا عطا فرمایا تھا، مگر قدرت کی کرشمہ سازی تھی کہ پیدائش کے چند مہینے گزرتے نہ گزرتے وہ بھی داغ فراغ دے چلا، انّا للہ وانا الیہ راجعون۔
حضرت مولانا کے صاحب زادۂ گرامی مولوی ڈاکٹر دین محمد صاحب کا بیان ہے کہ :

’’میری ماں محترمہ خدیجہ بیگم بڑی نیک سیرت خاتون ہیں، میرے والد کی زندگی میں وہ آئیں تو بڑی بہار بن کر آئیں، میرے والد تو خیر ان کے قابل قدر شوہر تھے، انہوں نے میری ماں شفیقہ بیگم کی ایسی خدمت کی جیسے ایک باوفا چھوٹی بہن بڑی بہن کو کرتی ہے، میری ماں شفیقہ بیگم بڑی کمزور اور لاغر ہو گئی تھیں، انہوں نے اپنے شوہر گرامی کے ساتھ ساتھ کہنے میں ان کی سوتن کی خدمت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی، خیر میری ماں شفیقہ بیگم تو اس جہان فانی سے رخصت لے چلیں، مگر ماں خدیجہ ہمارے آبائی گھر میں حین حیات ہیں، میری مریض بھائی عرفان کی دیکھبال ان کا ذمہ ہے، اور وہ اپنی ذمہ داری بڑی خوبی سے نباہ رہی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے‘‘۔

حضرت مولانا کی اہلیہ خدیجہ بیگم کے متعلق مولانا شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ :

’’عمر کے آخری مرحلہ میں حضرت مولانا کی رفیقۂ حیات شفیقہ بیگم کا ضعف حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا، گھر میں ایک صاحب زادہ عرفان مدہوش پڑا ہوا ہے، ایسے حالات میں حضرت کو اور ایک شادی کا سوچنا پڑا تھا، یوں آپ نے خدیجہ بیگم سے شادی کر لی تھی، انہوں نے بھی اپنے لائق شوہر اور اپنی سوتن محترمہ شفیقہ بیگم کی جان ودل سے خدمات کی تھیں، حضرت کی وفات سے چھ مہینے پہلے شفیقہ بیگم کا انتقال ہو گیا تھا، یوں خدیجہ بیگم کے ہاتھ میں حضرت مولانا اس دار فانی کو خیر باد کہہ کر دار البقاء کو چل بسے انا للہ وانا الیہ راجعون‘‘۔

بیویوں کے ساتھ مولانا کی حسن معاشرت :

اس بات میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ خاوند کو اپنی بیوی پر ایک فوقیت اور برتری حاصل ہے، فطرت خداوندی نے مرد کو عورت ذات پر فوقیت اور فضیلت بخشی ہے، اور اللہ تعالی نے اپنے پاک

کلام میں اس حقیقت کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا ہے : **وللرجال علیھن درجة** البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔

اور سورۃ النساء میں فرمایا ہے کہ :**الرجال قوامون علی النساء**
مرد عورتوں پر حاکم وسربراہ ہیں۔

لیکن ان کا یہ منصب محض مرد ہونے کے سبب سے نہیں، بلکہ اس کی دو وجوہ ہیں، جو خود اللہ تعالی نے اس آیات میں یوں بیان فرمائی ہے کہ :

بما فضل اللہ بعضھم علی بعض و بما انفقوا من اموالھم

اس لئے کہ اللہ تعالی نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے، اور اس لئے بھی مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

فرائض اور حقوق کے ذکر سے قبل خود بیوی کے انتخاب کا مسئلہ آتا ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے کہ:

خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة (مسلم)

دنیا کی بہترین متاع ایک نیک صالح بیوی ہے۔اور جہاں تک انتخاب کا سوال ہے کہ سید ولد آدم ہادی عالم ﷺ نے اس کا تجزیہ کس قدر کامل ومکمل فرمایا ہے :

تنکح المرأة لاربع لمالها ولحسبها ولجمالها ولدینها فاظفر بذات الدین تربت یداک۔

عورت سے شادی رچانے کے لئے چار باتیں دیکھی جاتی ہیں، اس کی مالی حیثیت، اس کا حسب ونسب، اس کا حسن وجمال اور اس کی دین داری، تمہیں چاہئے کہ دین داری کو پیش نظر رکھو، کیونکہ دین دار عورت ہی مرد کے حقوق ادا کرتی ہے۔

ان تمام چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے راقم سطور کا خیال ہے کہ حضرت مولانا نے اپنی دونوں بیویوں کا انتخاب ایک عالم دین کی حیثیت سے اس حدیث کی روشنی میں کیا تھا،

جہاں تک مجھے پتہ چلا کہ دونوں بیویاں حسب ونسب کے اعتبار سے بڑے دین دار گھرانے سے تھیں اور ہیں، حضرت نے ان دونوں کے انتخاب کے دوران ظاہر ہے کہ مال ومتاع کی طرف نہیں دیکھا، بلکہ ان مذکورہ چہاروں صفات میں سے ان کی دین داری کی طرف حضرت کی نظر گئی تھی، اور ان دونوں نے اپنی طویل عائلی وخانگی زندگی میں اس بات کا بین ثبوت دیا کہ عملا دونوں بڑی دین دار اور

پرہیزگار خاتون تھیں۔

مولانا کی خانگی زندگی میں جہاں تک دیکھا گیا کہ انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک حضور اکرم ﷺ کی ان احادیث پر عمل کیا ہے، مشہور بات ہے کہ حضرت رسول ﷺ نے حجۃ الوداع میں مردوں کو ان کے اس فریضہ کی طرف ان الفاظ میں متوجہ فرمایا :

اتقوا اللہ فی النساء، وانکم اخذتموھن بامان اللہ ولھن علیکم وکسوتھن (مسلم)

تم عورتوں کے بارے میں خوف خدا دل میں رکھو، تم نے انہیں اللہ کی آمان کے ذریعے حاصل کیا ہے، ان کا کھانا پینا اور ان کی پوشاک دستور کے موافق تمہارے ذمے لازم ہے ۔

اور مولانا نے رسول خدا ﷺ کی اس حدیث پر زندگی بھر عمل فرمایا ہے، کہ حضرت حکیم بن معاویۃ قشیری نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم میں سے کسی پر اس کی بیوی کا کیا حق ہے؟ تو حضور پرنور ﷺ نے فرمایا :

ان تطعمها اذا اطعمت وتکسوا اذا کسیت (ابو داؤد)

یہ کہ تم جب کھاؤ اسے بھی کھلاؤ، اور جسے تم پہنوا سے بھی پہننے کو دو۔

پھر نان ونفقہ کے ساتھ ایک خاوند کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ حسن اخلاق وسلوک کے ساتھ پیش آئے، اس حوالے سے اللہ تعالی کا واضح فرمان ہے کہ :

وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسی أن تکرھوا شیئا ویجعل اللہ فیه خیرا کثیرا (النساء)

اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو، سو اگر وہ تم کو ناپسند ہوں، تو یہ عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالی اس میں بہت ہی بھلائی پیدا کردے۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ :

اکمل المؤمنین ایمانا أحسنهم خلقا وألطفهم باهله (ترمذی)

کامل ایمان اس مؤمن کا ہے، جس کے اخلاق اچھے ہیں، اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ نرم خو ہے ۔

یہ رہبر عالم ﷺ کی محض کوئی نظری تعلیم نہیں، بلکہ حضرت رحمت مجسم کی عملی زندگی کا مظاہرہ بھی یہی

ہے، اس حوالے سے ام المؤمنین صدیقہ بنت الصدیق ؓ بیان کرتی ہیں کہ :

خیرکم خیرکم لأهله وأنا خیرکم لأهلی (ترمذی)

تم میں سے بہتر وہ ہے جس کا سلوک اس کی بیوی سے اچھا ہے، مجھے دیکھ لو! میرا سلوک اپنے اہل کے ساتھ کتنا اچھا ہے۔ پھر سرور کائنات کی یہ حدیث بھی زیر نظر رہے کہ :

استوصوا بالنساء خیرا فانهن خلقن من ضلع (بخاری ومسلم)

میں عورتوں کے ساتھ بھلائی کے ساتھ پیش آنے کی وصیت کرتا ہوں، کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں، جو کبھی اوپر ہوتی ہے، اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو وہ ٹوٹ جائے گی، اور اگر اسے چھوڑ دو تو ٹیڑھی رہ جائے گی، استوصوا بالنساء: لہذا میں تمہیں عورتوں کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔

تو ظاہر ہے کہ حضرت مولانا سید الأمین کی پوری زندگی قرآن کریم کی تلاوت وتفسیر، احادیث نبوی کے درس وتدریس میں گزر گئی ہے، دنیا ان کو شیخ الحدیث کے نام سے یاد کرتی رہی اور انشاء اللہ ہمیشہ یاد کرتی رہے گی، تو انہوں نے قرآن وحدیث کو جس طرح سیکھا اور دوسروں کو سکھایا، خود بھی ان پر عمل کرتے رہے تھے، انہوں نے قرآن کریم کی تلقین اور احادیث نبوی کی تعلیمات پر زندگی کے آخری دم تک عمل کیا ہے، حضرت مولانا نے اپنی بیویوں کی ہر حال میں دل جوئی کی، اور بدگوئی اور بے زاری یا دوسرے الفاظ میں دل آزاری سے پرہیز کیا ہے۔

پھر یہ ایک کھلی سی بات ہے کہ اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان کے درمیان عدل وانصاف اور کامل مساوات رکھنے میں لوگ ہچکولے کھاتے ہیں، اس حوالے سے حضرت مولانا نے ان احادیث پر عمل کیا تھا کہ :

اذا کانت عند الرجل امرأتان فلم یعدل بینهما جاء یوم القیامة وشقه ساقط۔ (ترمذی)

کسی مرد کی دو بیویاں ہوں، اور وہ ان کے درمیان انصاف نہ کرے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا نصف جسم خمیدہ ہوگا۔

اور حضرت ام المؤمنین سیدۃ عائشہ صدیقہ ؓ کی بیانی سنئے کہ حضرت سرور کائنات کا عمل کیا تھا۔

آپ ﷺ اپنی بیویوں کے درمیان انصاف سے تقسیم کرتے تھے، اور فرماتے تھے اے اللہ یہ

میری تقسیم ہے،جس پر میں اختیار رکھتا ہوں،جس بات پر مجھے اختیار حاصل نہیں تجھے اختیار ہے،اس پر مجھے ملامت نہ کرنا (ترمذی، ابو داؤد ، نسائی)۔

تلامذہ کے ساتھ حسن سلوک :

جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے تلامذہ سے بڑی محبت رکھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ یہ میرے تلامذہ نہیں بلکہ حقیقی اولاد ہیں ، آپ تلامذہ کی تکلیف میں ہر حال میں ساتھ دیتے ، مفلوک الحال تلامذہ کے مالی تعاون بھی کرتے تھے،اور تلامذہ کو مالی تعاون کرتے وقت یہ فرماتے تھے کہ یوں بھی تم میرے شاگرد ہو، اور شاگرد اولاد جیسا ہوتا ہے ، میں تجھے بطور ہدیہ تمہارے مصارف کے لئے کچھ دے رہا ہوں کہ ایسا سمجھنا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو کچھ مصاریف دے رہا ہے، میرے یہ ہدیہ لے کر تم اپنے آپ کو گرا ہوا نہیں سمجھنا۔

شاگردوں کے ساتھ مولانا کے حسن سلوک کے حوالے سے ان کا ایک شاگرد مولوی کمال احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ:

”مولانا کے اخلاق وحسن سلوک کے بارے میں کیا لکھوں ، جدھر دیکھوں حضرت کو اخلاق کا ایک مجسم پیکر نظر آتا ہے،مولانا رحمۃ اللہ علیہ تمام شاگردوں کو اپنی اولاد جیسی محبت کرتے تھے، دوران تدریس اگر کوئی لڑکا سوال کرتا تو مولانا بڑی خندہ پیشانی سے اس کی بات کو بغور سنتے تھے ، پھر بڑے پیار سے اس کا جواب دیا کرتے تھے ، تدریس میں شاگردوں کے ذہنی اور علمی ومعلوماتی سطح کا پورا لحاظ فرماتے تھے، آپ کی تقریریں اور بیانات مخاطب کے لحاظ سے ہوتے تھے، دوران تدریس بعض تقریریں ، بیانات اور فقرے کو دھرایا کرتے تھے ، تاکہ طالب علم کا ذہن نشین ہوجائیں ، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ مولانا کا ہر تلمیذ غبی ہو یا ذکی درس سے خوب خوب مستفید ہوسکتا تھا، درس کے دوران مولانا ہر طلبہ کو نام لے کر مخاطب کرتے تھے، اس سے جہاں تک سمجھ آیا کہ مولانا چاہتے تھے کہ درس کے ہر طالب کا ذہن ہمیشہ درس میں لگا رہے، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ درس یہاں لے

رہا ہے اور اس کا خیال کہیں چلا گیا ہو۔ اثنائے درس کوئی سوال کرتا تو مولانا کا جواب بڑا تسلی بخش ہوتا تھا، شاگردوں کے دلوں میں مولانا کی عظمت وہیبت ،عزت واحترام کے تہ بتہ بڑی ہی محبت ہوتی تھی ، ہر شاگرد مولانا کو دل سے چاہتا تھا، علاوہ ازیں حضرت شیخ ارکان بڑے سخی اور فیاض منش تھے،تو سخاوت میں آپ کو حضرت الامام ابوحنیفہ کا خوشہ چین جیسا پایا، حضرت کی سخاوت وفیاضی سے بہت سارے نادار طالب علم کو علم وعمل کی روشنی ملی ، نہ جانے کتنے طالب علم کے شاگرد تھے کہ آپ نے اپنے جیب خاص سے ان کی مدد کی تھی ، ایسے چند طالب علم جو ان کے شاگرد ہیں، جن کو میں جانتا ہوں کہ انہوں نے حضرت کی مدد وتعاون سے علم دین حاصل کیا ہے ۔مثال کے طور پر حافظ حسین احمد نارو بیلوی ، مولوی عارف اللہ زوفرانگی ، مولوی عبد المنان بوسید حاصل کیا ہے، غرض مولانا کی سخاوت وفیاضی دیکھ کر اسلام کے تاریخ کے بڑے بڑے سخیوں اور فیاضوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے ، اللہ تعالی مولانا اور ان کی فیاضی وسخاوت کو قبول کرے اور ہمیں بھی ان جیسے بننے کی توفیق عطا کرے، ”آمین“

حضرت مولانا کی اپنے تلامذہ سے محبت وشفقت کے حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب نے بہت تفصیلی بات لکھی ہے، اس میں سے ایک مختصر اقتباس یہاں حاضر خدمت ہے :

”بطور خاص خطہ ارکان کے ہزاروں خوشہ چیناں آپ کے باران علم سے خوب مستفیض ہوئے ، ہزاروں تشنگان علوم دینیہ نے آپ کے بحر علم وفیوض میں غوطہ زن ہوکر اپنی اپنی علمی وفکری پیاس بجھائی ، ایک طرف تلامذہ کا حال ایسا تھا ، دوسری طرف تلامذہ سے آپ کی محبت وشفقت کی کہانی بڑی طولانی ہے، مگر یہ کہانی روز روشن کی طرح واضح اور عیاں بھی ہے ، تلامذہ کے ساتھ آپ کی محبت وشفقت کی بات ضرب المثل بن گئی ہے، اسی لئے تلامذہ آپ پر فنا تھے، حضرت کو ہر تلمیذ ایک شفیق باپ سمجھا کرتا تھا “۔

شفقت ورحمت :

یہ ایک معروف بات ہے کہ حضرت مولانا بطور خاص اپنے تلامذہ و متعلقین کیلئے ایک شفیق باپ کی طرح تھے ۔ علاوہ ازیں حضرت مولانا مرحوم اپنے بزرگوں ، ہم عمروں اور ملنے والوں کے ساتھ ادب واحترام اور حسن سلوک کا معاملے فرمانے میں یکتائے روزگار تھے۔ اسی طرح اپنے چھوٹوں اور عزیزوں پر شفقت ورحمت کے حوالے سے اپنی مثال آپ تھے۔ مولانا کی شفقت ومحبت کے حوالے سے فاضل محترم مولانا شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ :

> ’’حضرت مولانا کی محبت وشفقت کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے ، ہر طالب علم یہ سمجھتا تھا کہ حضرت مولانا مجھ سے زیادہ کسی سے محبت نہیں کرتے ہیں ، اور مولانا سے عمر میں بڑے یا سن رسیدہ لوگ ایک شاگرد کی طرح آتے تھے اور مولانا بھی ان لوگوں کے موافق باتیں کرکے ان کے دل جیت لیتے تھے۔ اسی طرح ہم عصروں کے ساتھ ان کے موافق باتیں کرکے انہیں خوش کرنے میں یکتائے روزگار تھے، اور کم عمروں سے ایسی محبت اور الفت بھری باتیں کرتے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالی حضرت مولانا کی طرح ایک شفیق اور رحم دل انسان پیدا کرکے اپنی قدرت کا اظہار کردیا ہے‘‘۔

طلبۂ مدارس سے محبت وشفقت :

مولانا مرحوم کے متعلق یہ بات بہت مشہور ہے کہ آپ طلبۂ مدارس اسلامیہ سے بڑی محبت وشفقت کرتے تھے، امور تعلیم میں آپ کی سختی کے باوجود آپ نے طلبۂ مدارس اسلامیہ سے زندگی بھر وہ معاملہ کیا جو ایک شفیق باپ اپنی اولاد کے ساتھ کرتا ہے، آپ نے اپنی پوری زندگی میں طلبہ پر کسی قسم کی زیادتی برداشت نہیں کی تھی ۔ ہمیشہ ان کی تکلیف کو اپنی تکلیف اور ان کی راحت کو اپنی راحت سمجھتے رہے تھے۔ کسی بھی موقع پر کسی طلبہ پر زیادتی ہوئی تو اس زیادتی یا معمولی حق تلفی پر آپ بے چین ہوگئے، اور اس کی مکافات کی کوشش فرماتے رہے ۔

مولانا مرحوم اپنے مدرسہ کے علاوہ بعض وقت دوسرے مدارس کے طلبہ کے امتحانات بھی لیا کرتے تھے، امتحان کے لئے سختی سے پرچہ بناتے مگر طلبہ کو نمبر دینے میں بڑے فیاض تھے، یعنی سختی کے ساتھ ساتھ نرم گوشہ بھی رکھتے تھے۔

تربیت کے حولے سے مولانا کے باریک احساسات :

مولانا کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ تعلیم وتربیت کے لئے اور یوں بھی دیگر مثبت کاموں کے لئے اخلاص وللّٰہیت انسان کا ایک بنیادی وصف ہوتی ہے، جس کے بغیر کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا ہے، ایک معلم کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ تربیت واصلاح کے سلسلے میں صرف اور صرف اللہ تعالی کی رضا کو پیش نظر رکھے، نہ اپنی ذاتی کسی منفعت کا حصول اس کے سامنے ہو اور نہ کسی مادی اغراض کی تکمیل، بلکہ ہر معاملہ میں وہ اللہ تعالی کی رضا جوئی اور خوش نودی کے حصول کے جذبے سے سرشار ہو، وہ مدارس دینیہ میں تربیت کے لئے کوئی بھی قدم اٹھائے تو اس میں خلوص وللّٰہیت کی جھلکیاں نظر آتی ہوں، وہ کسی طالب یا کسی بھی اپنے خوشہ چین کو نصیحت وموعظت کرے یا زجر وتوبیخ سے کام لے، اس کا لب ولہجہ نرم ہو یا سخت، وہ پیار ومحبت سے سمجھائے یا سختی کرے، ہر عمل اور ہر اقدام میں اخلاص وللّٰہیت کی کارفرمائی ضرور ہونی چاہئے ، بغیر اخلاص وللّٰہیت کے جو کام بھی کیا جاتا ہے اگر چہ وہ بظاہر بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے مگر نتائج کے اعتبار سے موثر نہیں ہوتا ، بہت سے لوگ اپنے زیر اثر افراد کی تربیت کے سلسلے میں بہت ساری تدابیر اختیار کرتے ہیں ، تمام جدید وقدیم نفسیاتی پہلوؤں کا خیال رکھتے ہیں ، کہنے میں بہت سے حکیمانہ طریقے استعمال کرتے ہیں، مگر ان کی تمام جدوجہد اور ساری کاوشوں کے نتائج ان کے اندازے کے بالکل برعکس نکلتے ہیں، اس طرح کے واقعات کے اثرات ونتائج پر بغور نظر کریں گے تو معلوم ہوجائے گا کہ تربیت کے وقت معلم کے یہاں للّٰہیت واخلاص کا فقدان رہا تھا۔ اسی لئے ہم ذرا شائبہ وتامل کے بغیر کہہ سکیں گے کہ حضرت مولانا نے زندگی میں جتنی بھی تعلیم دی، جتنے افراد کی تربیت کی، اس میں اخلاص وللّٰہیت کی کوئی کمی نہیں تھی ۔

ان تمام باتوں کے علاوہ بھی حضرت کو اس بات کا بہت ہی احساس تھا کہ اخلاص میں یہ بات بھی شامل

ہے کہ ایک انسان دوسروں کی تربیت کرتے وقت اپنی ذات سے بھی غافل نہ رہے، اپنے کو دوسروں سے بالاتر نہ سمجھے، اپنے بارے میں کبھی اس خوش فہمی کا شکار نہ ہو کہ میری ذات کی تربیت تو کب ہی ہو چکی ہے اور اب میں دوسروں کی تربیت کے منصب عظمیٰ پر فائز ہو گیا ہوں، یہ انداز فکر اصلاح و تربیت کے بجائے بگاڑ و فساد کا سبب بن جاتا ہے، اسی لئے تو ہم جماعت تبلیغ والوں کو دیکھتے ہیں کہ بظاہر یہ لوگ دوسروں کی اصلاح، تعلیم، تربیت اور دعوت دین کی خاطر نکلتے ہیں، مگر ان کی تقریر، تلقین، اصلاح و تربیت اس بات کی غماز ہے کہ دراصل وہ دوسروں کو اصلاح کرنے سے زیادہ خود اپنے آپ کو اصلاح کرنے کے درپے ہوتے ہیں، اسی لئے ان کی دعوت، ان کی تربیت، ان کی تلقین اور تقریروں میں بہت تاثیر ہوتی ہے، اور مولانا رحمۃ اللہ کو اس حوالے سے اس بات کا بھی احساس تھا کہ تعلیم و تدریس اور تربیت و اصلاح کرنے والے اللہ تعالی کے ساتھ مخلص ہونے کے ساتھ ہی ساتھ انہیں اپنے زیر تربیت افراد کے لئے مخلص ہونا چاہئے، ان سے دلی محبت اور قلبی ہم دردی ہونی چاہئے، تربیت واصلاح کرتے وقت ان کی نجات کی فکر ہر وقت دامن گیر رہے، اور یہ خیر خواہی اتنی واضح ہو کہ ان کے زیر تربیت افراد ان کی ہر بات اور ہر نصیحت کو خواہ کتنے ہی سخت لب ولہجہ میں کی جائے، اپنے لئے باعث خیر سمجھیں، اور انہیں یہ یقین کامل ہو کہ ان کو نصیحت اور فہمائش کرنے والے ان کے خیر خواہ ہیں۔

زیر اثر اور زیر تربیت افراد کے ساتھ مولانا کا یہی معمول اس بات کا اصل راز ہے کہ مدارس کے طلبہ چاہئے ان کا تعلق اعلی درجات سے ہو یا نچلے درجات سے، حضرت پر فدا اور وارفتہ رہتے تھے۔

حضرت مولانا نے یہ بات اور کسی سے نہیں خود حضرت سید الاؤلین والآخرین کی زندگی اور ان کی روشن سیرت سے سیکھی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے لئے اس قدر مخلص اور خیر خواہ تھے کہ ہر صحابی یہی سمجھتا تھا کہ اللہ تعالی کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں، نہ صرف اپنے اصحاب اور اہل ایمان کی اصلاح و تربیت کی فکر آپ کو ہر وقت دامن گیر رہتی تھی، بلکہ آپ اپنے دشمنوں کی ہدایت کے لئے بھی بے چین رہتے تھے۔

حکیمانہ اصول تربیت سے آگاہی :

حضرت مولانا بذات خود ایک بلند پایہ کے حکیم تھے، ان کے ہر قول ہر فعل سے حکمت و دانائی، بصیرت و فراست ٹپکتی تھی۔ ان کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ نئی نسل کی تربیت کی ذمے داری ادا کرنے کے لئے وافر علم کے ساتھ ساتھ تربیت کے قواعد اور حکیمانہ اصولوں سے آگہی کی بہت ضرورت ہے، اسی لئے انہوں نے ذاتی تجربے اور مطالعہ کے ذریعے ان اصولوں کو حاصل کیا، حالات، جذبات اور نفسیات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی، اسی لئے مولانا کی پوری تعلیمی اور تدریسی زندگی شاہد ہے کہ انہوں نے اپنے زیر تربیت افراد کی ذہنیت کو تاڑا، ان کی نفسیات کو سمجھا، اور ان کے ذہن وخیالات کے مطابق کام کیا تو حضرت کے ہر قول، ہر فعل کی تاثیر بڑھ گئی تھی۔

بے مثال صبر وتحمل :

حضرت مولانا نے اپنی طویل تدریسی اور تعلیمی زندگی میں بڑا صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا ہے، اس باب میں صبر وتحمل کا مفہوم حضرت کے نزدیک یہ تھا کہ معلم بات بات پر ناراضگی اور غصے کا مظاہرہ نہ کرے، اور زیر تربیت و تعلیم افراد کی معمولی معمولی باتوں کو نظر انداز کردے۔ اسی طرح صبر وتحمل کے مفہوم میں یہ بھی داخل تھا کہ معلم اپنے جذبات کو باتوں باتوں میں مشتعل نہ ہونے دے اور جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے۔ ان چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت نے ہر کام کو سکون وطمانیت اور ٹھہراؤ کے ساتھ ہی انجام دیا تھا، اگر ان کی بعض کاوشوں کے نتائج فوراً ظاہر نہ ہوئے تو وہ مایوسی اور اضمحلال کے شکار نہ ہوئے تھے، بلکہ بڑی بلند حوصلگی کے ساتھ مسلسل محنت کرتے رہے تھے۔ یوں بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ جب دوسروں کی تربیت کرتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھتے تو بددل ہو کر تربیت کا کام چھوڑ دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ تربیت کے نتائج دیر سے ظاہر ہوتے ہیں، اسی لئے اس سلسلے میں جلد بازی کرنا اور فوری نتائج کی امید رکھنا صحیح نہیں ہے، ظاہر ہے کہ بری عادتیں آہستہ آہستہ چھوٹتی ہیں اور اچھی خصلتیں تدریجاً پروان چڑھتی ہیں، اسی لئے معلم تربیت کو مایوس کبھی بھی نہیں ہونا چاہئے، اور تربیت ایک صبر آزما کام ہے، اس اہم فریضہ کو ادا کرتے ہوئے انسان کو بلند ہمتی سے

کام لینا چاہئے ، دوام اور تسلسل کے ساتھ اپنی جدو جہد کو جاری رکھنا چاہئے ، اس حوالے سے مشتعل ہوکر کوئی غلط قدم نہیں اٹھانا چاہئے ، اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوگئی تو اسے برداشت کرنا چاہئے ، مسلسل ناکامرانیوں کے باوجود بھی ہمت نہیں ہارنا چاہئے ، اور یادرکھنا چاہئے کہ تربیت کے سلسلے میں بڑے سخت مراحل بھی آتے ہیں ، ان میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا بہت ضروری ہے ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''کشتی میں پچھاڑنے والا طاقتور نہیں ، اصل طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے'' (بخاری)

ہر معلم کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے زیر تربیت افراد کی خوبیاں اور خامیاں نہایت باریک بینی سے نوٹ کرے ۔ خوبیوں پر ہمت افزائی کرتے ہوئے انہیں پروان چڑھائے ، اور خامیوں کو دور کرنے کے لئے ہمت اور تدبر کے ساتھ کوشاں رہے ، اگر کسی خامی یا کمی پر قابو پانے میں دشواری محسوس ہو تو بد دل یا مایوس نہ ہو ، بلکہ عزم وحوصلے کے ساتھ اپنی جدو جہد جاری رکھے ۔

حضرت مولانا تربیت کے ان مذکورہ اصولوں کے نہایت پابند تھے ، تربیت کے دوران انہوں نے بڑی بلند حوصلگی اور صبر وثبات سے کام لیا تھا ، اور ہر کام میں حکمت اور دانائی سے کام کیا تھا ، اس حوالے سے مولوی قاری اشاد صاحب جو آپ کے تلامذہ میں سے ہیں کی روایت ہے کہ :

> ''جمعہ کی رات تھی چندلڑکے جو جامعہ محمدیہ کے طالب علم تھے اور حضرت کے تلامذہ ، رات گئی بستی کے ایک کنارے میں جاکر انہوں نے شعروشاعری کی محفل سجائی ، خوب گائے پیٹے ، یہ خبر معلمین تک پہنچی تو انتظامیہ میں سے ایک معلم مشتعل ہوکر ان طالبعلموں کو زجروتوبیخ کرنے لگے ، حضرت مولانا نے اس معلم کو ایسی حالت میں دیکھا تو حضرت نے اس معلم پر اپنی ناراضگی کا برملا اظہار کیا ، اور فرمایا کہ اصلاح کا طریقہ ویسا نہیں ہے ، حضرت نے مزید فرمایا کہ اصلاح کرنے میں حکمت اور دانائی سے کام لو ، اور صبر کرو ، ان کے معاملے ہم پر چھوڑ دو ، ہم دیکھتے ہیں ، بعد میں یہ دیکھا گیا کہ حضرت نے ان طالب علموں کی بڑی حکمت اور بصیرت سے کام لیتے ہوئے پوری اصلاح کردی تھی'' ۔

حضرت کی نرالی گفتار :

حضرت مولانا کی زبان ، لب ولہجہ ، انداز تخاطب اور طرز گفتار بڑا ہی نرالا تھا ، آواز میں شیرینی اور بڑا مٹھاس تھا ۔ یہ آپ کی خوش گوار اور میٹھی آواز کی کرشمہ سازی تھی کہ طالب علموں کو آپ کی تدریس وتعلیم میں کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی ، ان کے ذوق سماعت پر کبھی بار محسوس نہیں ہوتا تھا ۔ یعنی آپ کی آواز کرخت ، بھدی اور بہت چیخ والی نہیں تھی ، آپ کی باتوں سے طلبہ متنفر نہیں ہوتے تھے ، اور بات بھی دل کی گہرائیوں سے کرتے تو اس کی وجہ سے طلبہ کے دلوں پر بہت اثر ہوتا تھا ۔ مولانا چوں کہ حدیث وقرآن کے بہت بڑے عالم تھے ، آپ نے یہ چیز حضرت رسول انسانیت کی زندگی سے سیکھی تھی ۔ شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ حضرت امّ معبد رضی اللہ تعالی عنہا روایت کرتی ہے کہ : ''الفاظ نہ ضرورت سے زیادہ تھی نہ ضرورت سے کم نہ کوتاہ سخن نہ طویل'' اسی طرح حضرت مولانا فضول گوئی اور لا یعنی گفتگو سے بہت ہی اجتناب کرتے تھے ، وہ اس بات سے واقف تھے کہ ضرورت کے بغیر انسان گفتگو کرنے سے شخصیت بہت مجروح ہوجاتی ہے ، جس کی وجہ سے ایک طرف اس کی بہت ساری کم زوریاں ظاہر ہوجاتی ہیں تو دوسری طرف اس کی باتوں میں اثر بالکل نہیں رہتا ہے ، علاوہ ازیں اس کی فضول گوئی سے خود بہت سارے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں ، اور حضرت یہ بھی جانتے تھے کہ لایعنی گفتگو سے طلباء اکتا جاتے ہیں اور اصل مدعا محفوظ رکھنا مشکل ہوجاتا ہے ، اسی لئے آپ کی طویل زندگی کو جاننے والے کہتے ہیں کہ آپ لایعنی اور فضول گوئی سے بہت ہی دور تھے ، البتہ یہ الگ بات ہے کہ آپ درس وتدریس میں خصوصاً ضرورت سے کم گفتگو بھی نہیں کرتے تھے ، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ طلباء مدعا کو نہ سمجھ پائے ، یوں بھی تعلیم وتربیت ، دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں انسان کو گفتگو بہترین ڈھنگ سے کرنی چاہیے ، جہاں طوالت سے اجتناب ضروری ہے وہیں بہت ہی کم گفتگو ہو ، البتہ گونگے پن کی حد تک پہنچنے سے بھی بچنا چاہئے ، یعنی موضوع کے مطابق حسب ضرورت بات ہونی چاہئے ، اس سلسلے میں آیئے ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے کچھ درس بھی حاصل کرلیں :

> ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلاضرورت گفتگو نہیں فرماتے تھے ، ابتدا سے انتہا تک آپ منھ پر بولتے یعنی ایسا نہیں کہ آدھی بات اندر ہی رہ جائے ، آپ کی ہر بات فیصلہ

کن ہوا کرتی تھی۔اہل مجلس کی گفتگو میں غیر متعلق موضوع نہیں چھیڑتے تھے، بلکہ جو سلسلۂ کلام چل رہا ہوتا آپ اس میں شریک ہوجاتے۔اگر کسی بات سے کبھی صحابہ کرام کو اکتایا ہوا محسوس کرتے تو اسے بدل دیتے، گفتگو کے دوران ہر فرد مجلس پر توجہ فرماتے، تاکہ کوئی بھی یہ محسوس نہ کرسکے کہ آپ نے اس پر کسی دوسرے کو فوقیت دی ہے۔گفتگو کرنے والے کی جانب سے اس وقت تک منھ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منھ نہ پھیر لیتا، کسی کی بات کو کبھی نہ کاٹتے، سوائے اس کے کہ کوئی بات خلاف حق ہو۔کھڑے کھڑے کسی اہم موضوع پر گفتگو کرنے کو ناپسند فرماتے۔گفتگو کے دوران صحابۂ کرام کے ساتھ ہنستے بھی اور دلچسپی کا اظہار بھی فرماتے، آپ نہ کسی کی برائی میں زبان کھولتے، نہ کسی کی عیب بینی کرتے اور نہ کسی کے راز جاننے کی کوشش کرتے، جب کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پوری طرح متوجہ ہوتے۔زبان پر کوئی گندی بات نہیں لاتے تھے، نہ چیخ کر بولتے۔لایعنی باتوں سے پرہیز کرتے، اور دوسروں کو بھی روکتےتھے۔کلام سے پہلے سلام کا اہتمام فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں حسب ضرورت اتار چڑھاؤ ہوتا تھا۔ گفتگو میں کسی طرح کا کوئی تصنع وتکلف نہ ہوتا تھا۔ بلکہ سادگی اور بے ساختگی ہوتی تھی۔گفتگو میں تبسم کی آمیزش رہتی تھی۔گفتگو کے دوران کسی بات پر زور دینا ہوتا تو ٹیک سے اٹھ کر سیدھے ہوکر بیٹھتے۔خاص باتوں کو بار بار دھراتے تھے۔اپنی بات کی وضاحت کے لئے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشاروں سے مدد لیتے تھے۔تعجب کی باتوں پر ہتھیلی کو الٹ دیتے تھے‘‘۔

شمائل ترمذی میں حضرت زید بن ثابت کی ایک روایت ہے کہ :

’’جب ہم دنیوی امور کے بارے میں گفتگو کرتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس موضوع پر تکلم فرماتے۔اور جب ہم کھانے پینے کی کوئی بات چھیڑتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس میں شامل رہتے،،۔

تعلیم وتربیت کے حوالے سے آپ کا حسن کردار :

ایک مثالی مدرس، معلم، مبلغ ومرشد کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ دوسروں کی تعلیم وتدریس، تبلیغ وتلقین سے پہلے خود اپنی تربیت کرے۔دوسروں کو اچھائی اور بھلائی کی عادی بنانے سے پہلے خود اچھائیوں بھلائیوں کا عادی بن جائے۔دوسروں کو بری عادات واطوار سے چھٹکارا دلانے سے پہلے خود بری عادتوں سے پوری طرح کنارہ کش ہوجائے۔ظاہر ہے کہ انسان کا اپنا کردار دوسروں کے لئے باعث کشش ہوتا ہے۔جوان پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔تو ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید الامین بھی ایسے تھے۔ان کے روشن کردار میں روایت کے مطابق ہم ساری چیزوں کی جھلکیاں نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔ماشاء اللہ تعالی ان کی گفتار وکردار میں کوئی تضاد نہیں تھا ۔قول وفعل میں ہم آہنگی اور بڑی یکسانیت تھی، جس کی وجہ سے ان کی کوششوں اور جہد مسلسل سے بڑے بڑے نتائج ظاہر ہوئے تھے، آپ کے حسن کردار اور متقیانہ زندگی نے عوام الناس کو عموماً اور طلبۂ دینی مدارس کو خصوصاً بہت ہی متأثر کیا تھا۔

مولانا کا شاندار درس اور طلباء کا ہجوم :

حضرت مولانا سید الامین رحمۃ اللہ کے بعض نامور تلامذہ کے بیان کے مطابق آپ کا درس بڑا نرالا اور شاندار ہوتا تھا۔درس میں آپ باوضو آیا کرتے تھے، اور آخر تک باوضو ہی رہتے تھے، چاہئے اس کا تعلق درس قرآن کریم واحادیث نبویہ سے ہو یا معقولات ومبادیات عربیہ سے۔ بہر حال وضو کی حالت میں درس دیا کرتے تھے۔بعض تلامذہ کا بیان ہے کہ مولانا اگر کسی عذر کی وجہ سے درس نہ دے سکتے تو آپ کی طبیعت اداس سی ہوجاتی تھی، اس حوالے سے فاضل گرامی مولانا شبیر احمد صاحب کی فاضلانہ تحریر کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

’’آپ تفسیر وحدیث، منطق وفلسفہ، مبادیات عربیہ کے بہت بلند پایہ کے عالم تھے۔ایک ہی فقرہ میں کہا جائے تو آپ منقولات ومعقولات کے سنگم تھے، آپ سارے فنون کو بڑی دل جمعی سے پڑھایا کرتے تھے، تفسیر وحدیث کے علاوہ معقولات میں آپ کی بڑی بڑی فتوحات ہیں، جن کی تفصیلات کے لئے ایک بڑی

اور شاندار کوشش کی ضرورت ہے، گویا درس وتدریس اور تعلیم وتربیت کے ساتھ آپ کا گہرا فطری تعلق تھا، آپ بیان فرماتے تھے کہ میرا بخار اور میری بیماری درس دینے سے دور ہوجاتی ہے، اگر کسی عذر کی وجہ سے سبق نہ پڑھا سکوں تو میری طبیعت خراب ہوجاتی ہے''۔

تفسیر قرآن کریم میں علامہ بیضاوی کی معرکۃ الاراء تفسیر ہمیشہ آپ کے درس میں رہتی تھی اور حدیث نبوی کی کتابوں میں حضرت امام بخاری کی ''صحیح بخاری'' اور امام ترمذی کی ''سنن ترمذی'' بطور خاص آپ کے درس میں رہتی تھیں، اور معقولات میں یوں تو دیگر متداول کتابیں بھی آپ پڑھایا کرتے تھے، مگر سلم العلوم، ملاحسن، میبذی بڑی شان سے پڑھایا کرتے تھے، جہاں تک پتہ چلا کہ معقولات میں ان تینوں کتابوں کے ساتھ آپ کو خاص مناسبت تھی، ان مذکورہ کتابوں کے درس میں شامل ہونے کے لئے دور دراز سے طلبہ سمیٹ سمیٹ کر آپ کے گرد جمع ہوجاتے تھے۔ اس کے متعلق مولانا شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''بیضاوی شریف، بخاری شریف، ترمذی شریف کے علاوہ معقولات میں سلم العلوم، ملاحسن، میبذی جیسی کتابیں آپ کے درس میں ہمیشہ رہا کرتی تھیں، آپ کے ان کتابوں کا درس بہت مشہور تھا، بہت دور دراز سے لڑکے حضرت کے درس میں شامل ہونے کے لئے آتے تھے۔ برما کے دیگر علاقوں سے عموماً ارکان کے تقریباً تمام مضافات سے خصوصاً طلبہ حضرت سے پڑھنے کے لئے بڑے شوق سے آتے تھے۔ خصوصاً اکیاب، روہانگ، بوسیدنگ، تنگ بازار، چوکپرو، غرض منگڈو بوسیدنگ کے جنوبی وشمالی علاقہ جات سے بڑے ذہین اور جید طلبہ آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہوجاتے تھے، اور حضرت کے علوم وفنون سے مستفید ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ کے تلامذہ میں بہت سارے ایسے بھی ہیں کہ وہ بیک وقت مفسر بھی ہیں، محدث بھی، فقیہ بھی ہیں، معقولی بھی، اور بہت سارے جید تلامذہ ایسے بھی ہیں جو حضرت سے تعلیم حاصل کرکے ملک کے گوشے گوشے میں مدارس قائم

کئے دین کی خدمات بڑی خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ بہت سارے ایسے بھی ہیں جو حضرت سے تعلیم حاصل کرکے سیاست وقیادت کے میدان میں نبرد آزما اور بڑی عزیمت کے کام انجام دے رہیں، غرض حضرت نے اپنی زندگی میں انگنت محدث ومفسر، فقیہ ومعقولی افراد تیار کئے ہیں، ہر ایک آپ کے حوالے دے دے کر اپنے اپنے درس میں تقریر کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھار اپنے محسن استاد کی یاد آتی تو ھدایا تحایف لئے زیارت سے مشرّف ہونے آتے ہیں، یوں بھی ملاحظہ کیا گیا ہے کہ جس نے بھی حضرت سے کچھ پڑھا اس نے ہمیشہ حضرت کے ساتھ تعلقات کو بحال رکھا ہے، اور کوئی کوئی دور دراز سے حضرت کی پرچھائیوں کی برکات اور علوم فنون کے فیوضات کے تذکروں کے ساتھ شکریہ نامہ ارسال کرتا رہتا ہے''۔

تدریس کے حوالے سے آپ کا ایک معمول:

ہمارے مدارس میں بعض اساتذہ کا یہ حال رہا ہے کہ سال کے شروع میں کتابوں کے ابتدائی حصوں پر بہت لمبی چوڑی تقریر کیا کرتے ہیں، اور بعد میں جاکر **''چلو بھئی چلو''** کا مظاہرہ کرتے، مگر حضرت مولانا مرحوم اس قسم کی تدریس سے بڑے متنفر تھے، آپ پورے سال یکساں طور پر پڑھانے کا نظریہ رکھتے تھے۔ مدرسین کا یہ جو قاعدہ شروع سال میں کتابوں پر طول طویل بحث کرتے اور چند دن گزرتے نہ گزرتے کتاب پوری کرنے کی خاطر ورق گردانی پر اکتفاء کرتے ہیں، اور مختصر سے مختصر بحث کرکے کورس پورا کردیتے ہیں، تو جس طرح عرض کی گئی ہے کہ حضرت مولانا مرحرم ایسے طرز تعلیم کے بڑے مخالف تھے، اور بذات خود اپنے درس وتدریس میں توازن اور یکسانیت پر عمل کیا کرتے تھے، علاوہ ازیں درس وتدریس میں آپ کی تقریر جامع ومانع ہوتی تھی، صاف اور عام فہم الفاظ میں آپ تقریریں کیا کرتے تھے، ماشاء اللہ تعالی آپ کی آواز بھی بڑی اونچی تھی اور موقع موقع پر طلبہ کو اعتراض کرنے کا موقع بھی دیتے تھے، اگر دوران تدریس کسی طلبہ نے اعتراض کردیا تو آپ مسکراہٹ اور خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ دوران تقریر آپ کی زبان سے علوم وفنون کے پھول جھڑتے تھے، ہر ایک تقریر گویا موتیوں کی لڑی ہوتی تھی، حضرت کی تدریس کے حوالے سے آپ کے

شاگرد، سفر حضر کا ساتھی اور رشتے میں۔ مولانا افضل حسین بن عبدالرشید صاحب کا بیان ہے کہ :

''اثنائے درس حضرت مولانا سید الامین صاحب کبھی کبھار جوش میں آجاتے تھے، آواز تو ماشاء اللہ فیاض ازل نے بلند ہی دی، پھر جب جوش میں آجاتے تو حضرت کی آواز کا مدھور پن اور بھی بڑھ جاتا تھا، اسی طرح وعظ ونصیحت کے دوران بھی مولانا کی آواز کبھی کبھار بہت بلند ہو جاتی تھی، اگر سامعین بھی اچھے ہوں، اور حضرت کی باتوں کو توجہ سے سننے والے میسر ہوں تو حضرت مولانا کی تقریر ایسی ہوتی تھی، جیسے دریا میں طوفان آیا ہو۔غرض حضرت کی آواز میں بڑی کشش تھی، کراہت بالکل ہی نہیں تھی ''۔

مبتدی طلبہ میں استعداد لانے کی فکر:

حضرت مولانا کو مبتدی طلبہ میں استعداد لانے کی ہر وقت فکر ہوتی تھی، آپ نے اپنے طویل تعلیمی اور تدریسی تجربہ کے مطابق یہ نظریہ رکھا کہ مبتدی طلبہ میں استعداد کا پختہ ہونا بہت اہم اور ضروری ہے، ورنہ ان کی زندگی میں آخر تک کم زوری باقی رہ جائے گی، اور بڑی کوششوں کے باوجود ان کی یہی کم زوری رفع نہیں ہوسکتی، اسی لئے آپ نے جس مدرسہ میں بھی تعلیم دی تھی، وہیں اس بات کا خیال رکھا کہ مبتدی طلبہ میں استعداد کی بڑی حد تک پختگی ہو۔

طلباء میں بحث ومناظرہ :

ہمارے مدارس دینیہ میں طلباء کے درمیان بحث ومناظرہ ہوا کرتا ہے، بحث کو یہاں عام طور پر ''تکرار'' کہا جاتا ہے، ابتدائی اور متوسطہ کے طلباء اساتذۂ کرام سے جو سیکھتے ہیں، اس پر بحث کرتے ہیں، اعلیٰ جماعتوں میں اس کا عام رواج نہیں ہوتا۔ یہ ظاہری بات ہے کے علم میں ملکہ حاصل کرنے کے لئے سب سے بہترین ترکیب بحث ومناظرہ ہے۔جس سے بہت جلد طالب علم میں صلاحیت پیدا ہوکر ملکہ کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ اور تھوڑے دنوں میں مقصود حاصل ہوجاتا ہے۔ ادھر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اکثر طلباء استاد کے سامنے خاموش بیٹھے رہتے ہیں، انہیں کتابیں حفظ کرنے کے سواء اور کوئی کام نہیں آتا۔ وہ اس طرح عرصۂ دراز تک تعلیم پانے کے بعد بھی تعلیم وتعلم میں تصرف کی مہارت پیدا

نہیں کرپاتے۔ اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی یہ کمی ان سے نہیں نکلتی، انہیں سمجھانے کا ملکہ حاصل ہوتا ہے اور نہ بیان کرنے کا۔ البتہ بعض کو ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ مسائل بہ نسبت اوروں کے ان کو زیادہ یاد ہوتے ہیں۔ کیوں کہ طالب علمی کے زمانے میں حفظ کو انہوں نے مقصود سمجھ رکھا تھا۔

مولانا سیّد الامین صاحب طلباء میں بحث ومناظرہ کو بہت ہی ضروری سمجھتے تھے، تکرار پر بہت زور دیا کرتے تھے، اور جہاں تک معلوم ہوا کہ ہفتے میں ایک دن بحث ومناظرہ کے لئے تعیین کرتے، اور ایک موضوع مقرر کیا جاتا، طلباء اس کے لئے تیاری کرتے اور ہر ایک چاہتے کہ اس مناظرہ میں بازی اس کے ہاتھ آئے، بسا اوقات گروپ بھی بنایا جاتا، یوں ہر گروپ اپنے مخالف گروپ پر بازی لے جانے کے لئے مطالعہ اور کتب بینی کرتا، جس سے طلبہ میں علم کے ساتھ ساتھ خطابت اور زور بیان کا ملکہ حاصل ہوجاتا ہے۔

امورِ تعلیم میں سختی :

جہاں تک مولانا مرحوم کے متعلق معلوم ہوا کہ آپ تعلیمی امور میں سختی سے کام لیتے تھے، اس حوالے سے آپ میں لچک نہیں تھی، اور امتحان لیتے وقت بھی سختی سے کام لیا کرتے تھے، مگر صحیح جواب دینے والے طلبہ کو نمبر دینے میں بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس حوالے سے ظاہر ہوا کہ آپ تعلیمی امور میں طلبہ کی رعایت اور تساہل کے سرے سے قائل نہیں تھے، نہ خود رعایت اور نرمی کرتے بلکہ دوسروں کو سختی سے کام لینے کے لئے تلقین کیا کرتے تھے۔

اساتذۂ کرام کی توقیر :

مولانا نے زندگی بھر اساتذۂ کرام کا نام بڑی توقیر واحترام سے لیا ہے، ان کا تعلّق ہندو پاک کے بڑے اساتذہ سے ہو یا سرزمین ارکان کے اساتذہ سے، اثنائے درس میں بطور خاص اگر کسی استاد کا نام لینا ہوتا تو انہیں ایسے بلند الفاظ میں یاد کرتے تھے کہ دل چاہتا تھا کہ پردار بن کہ ان کی زیارت سے مشرف ہوکے آئے، مولانا کے اپنے اساتذہ کی توقیر واحترام کے متعلّق مولوی کمال احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے شیخ ارکان بننے کی توفیق بخشی تھی، پھر باوجود اس

کے کہ آپ اپنے وقت کے شیخ ارکان تھے، مگر آپ اپنے اساتذہ کرام کی اتنی عزت کیا کرتے تھے کہ گویا ایک مکتب کا طالب علم اپنے موقر استاد کے سامنے ہو، مکتب کے زمانے کے اساتذہ کے سامنے مولانا کا یہی حال تھا۔ مثال کے طور حضرت مولانا محمد علی کھولا ربیلی کو سامنے لایا جاسکتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ حضرت مولانا کے محسن استادوں میں سے تھے، حضرت نے زندگی بھر ان کی توقیر اور عزت واحترام کرنے میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی، جبھی وہ حضرت کو بلاتے، یا کسی لاینحل مسئلہ کے حل کے لئے دعوت دیتے تو مولانا ایک بچے کی طرح دوڑتے، اور اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوجاتے تھے، پھر ان کے سامنے اتنے ادب واحترام سے بات کرتے کہ جیسا ایک مکتب کا طالب علم اپنے بزرگ استاد کے سامنے بیٹھا ہوا ہو، اور دیکھنے والوں کو رشک آتا تھا کہ شاگرد ہو تو ایسا''۔

اساتذۂ مدرسہ کا احترام :

مولانا مرحوم اپنی پوری زندگی میں مدرسہ کے کسی استاد کے ساتھ بے احترامی کے ساتھ پیش نہیں آئے، طلبہ کے ساتھ ان کی شفقت ومحبت تو بہت مشہور ہے، ساتھ ہی ساتھ اساتذۂ کرام کا پاس ولحاظ بھی ہمیشہ کیا کرتے تھے، اور کسی بھی ایک استاد کو اپنے سے کم تر نہیں جانتے تھے۔ کوئی استاد آپ کے سامنے آتے تو آپ خوش کلامی اور مسکراہٹ کے ساتھ اس کی اوبھگت کیا کرتے تھے اور کسی حال میں بھی بڑے اور چھوٹے کی تمیز نہیں کرتے تھے، اسی طرح کسی استاد کی بے اعتدالی یا سختی پر متنبہ کرنا ہوتا تو طلبہ اور عزیزوں کے سامنے نہیں کرتے تھے، تاکہ اس کی عزت پر حرف نہ آنے پائے۔ ایسے امور میں آپ بڑی حکمت اور دانائی کا مظاہرہ کرتے تھے، حضرت مولانا مدرسہ کے اساتذوں میں مولانا قاری عبدالکریم صاحب منگنماوی کے بڑی پاس ولحاظ رکھتے تھے، یوں تو مولانا ایک بلند پایہ کے مفسر، محدث اور فقیہ تھے ہی، مگر بعض مسائل کے حل کے لئے مولانا عبدالکریم صاحب کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ مولانا افضل حسین صاحب کا بیان ہے کہ :

''مولانا سیدالامین صاحب رحمۃ اللہ تو ظاہر ہے کہ بڑے مفسر، محدث، فقیہ انسان

تھے، مگر بعض مسائل کے حل کے حوالے سے آپ مولانا قاری عبدالکریم صاحب منگنماوی جو جامعہ محمدیہ پر، امپورو کے اعلی درجہ کے استاد تھے کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، جہاں تک میں نے مولانا کو دیکھا مولانا ان کی طرف رجوع کرنے میں کسی قسم کی عار محسوس نہیں کرتے تھے، اس طرح چلتے چلتے اور ایک بات بتادوں کہ حضرت مولانا سیدالامین صاحبؒ اپنے ہم عصر دو عالم دین کے بہت گن گاتے تھے، ان میں سے ایک حضرت مولانا میر احمد صاحب امیر حرکت جہاد اسلامی، دوسرا حضرت مولانا سراج الحق کوار بیلیؒ''۔

دوعالم دین کی عزت وتکریم :

اس بات میں کسی قسم کی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت مولانا سیدالأمین سرزمین ارکان کے وقت کے ایک حیثیت سے سب سے معروف اور بلند پایہ کے عالم دین تھے، مگر مولانا کے اندر تواضع کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، مولانا جہاں بھی جاتے اور جس مجلس میں تشریف فرما ہوتے تواضع، انکسار اور خاکساری کے پیکر بنے نظر آتے تھے، ان کی جلالت علمی اپنی جگہ تھی، مگر انہوں نے اپنی کسی بھی گفتار وکردار میں تواضع کو ہاتھ سے کبھی جانے نہیں دیا تھا۔ یوں مولانا اپنے ہم عصر کسی بھی عالم یا اپنے وقت کے کسی بھی دانشور کو اپنے سے بلند پایہ تصور فرمایا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ مولانا فرماتے تھے کہ علم ایک سمندر ہے، اس سے کس نے کتنا پی سکا اور کتنی پیاس بجھا سکی وہ تو عالم السرائر ہی جانتا ہے، مگر ہمارا اخلاقی اور دینی فریضہ ہے کہ ہر عالم کی قدردانی کریں۔ ہر علم کے حامل کی توقیر کریں ۔

ظاہر ہے کہ مولانا اپنے وقت کے تمام علماء کی قدردانی اور تکریم فرمایا کرتے تھے۔ مگر دو عالم کو صاف صاف الفاظ میں اپنے سے زیادہ جلیل القدر مانتے تھے، ان میں سے ایک سرزمین ارکان کے معرف ومائیہ ناز عالم دین سیاستدان اور مرد مجاہد حضرت مولانا میر احمد مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرا حضرت مولانا سراج الحق کواربیلی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس حوالے سے حضرت مولانا کے ایک شاگرد رشید مولوی بدرالعالم بن حضرت مولانا سعیدالعالم بن بدیع الرحمن چالی پرانگی کا بیان ملاحظہ کیجئے :

'' حضرت مولانا سیدالامین معروف بہ محدث صاحب سے ہم نے بہت کچھ پڑھا

اور بہت کچھ سیکھا، کبھی کبھار حضرت مولانا کے ساتھی بن کر مختلف مقامات کے سفر بھی کئے، مولانا بڑے پایہ کے عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ بلند اخلاق کے مالک انسان تھے، مولانا جس بستی میں جاتے اس بستی کے پیش امام کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے، کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ مولانا کو امامت کی پیش کش کی گئی اور مولانا نے نماز پڑھائی ہو، اس حوالے سے فرمایا کرتے تھے کہ: اگر میں امامت کروں اور بستی کے امام صاحب کے پیچھے نماز ادا نہ کروں تو بستی والوں کے دلوں سے اس مسجد کے امام صاحب کی عزت وتوقیر میں کمی آسکتی ہے، اگر میں خود اس امام صاحب کے پیچھے نماز ادا کروں تو انشاءاللہ اس کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ مولانا مرحوم کی زبان سے میں نے بارہا سنا تھا کہ اس وقت سرزمین ارکان میں دو عالم دین علم وعمل کے حوالے سے بہت بلند پایہ کے ہیں، ان میں سے ایک حضرت مولانا میر احمد مبارک معروف بہ ناظم صاحب اور دوسرے حضرت مولانا سراج الحق صاحب کو اربیلوی۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ مولانا میر احمد مبارک اور مولانا سراج الحق صاحبان دونوں علم کے ٹھاٹے مارتے ہوئے سمندر ہیں، ان دونوں علماء کے علم پر حیران ہوں''۔

سال کے اختتام میں حدیث نبوی کا آخری درس:

سرزمین ارکان کے ان مدارس دینیہ میں جہاں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے، درسی سال کے اختتام میں ''**آخری درس بخاری**'' کے نام سے ایک شاندار محفل سجائی جاتی ہے، جو ہم نے بنگلہ دیش میں بھی دیکھی ہے، رہا ہندوستانی وپاکستانی مدارس کا جہاں تک سوال ہے، میں ان کے بارے میں اس حوالے سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا، وہ اس لئے کہ ندوے کے علاوہ ان دونوں ملکوں کے کسی بھی مدارس میں میری پڑھائی نہیں ہوئی، جب کہ ندوۃ العلماء میں اس قسم کی کوئی مجلس نہیں دیکھی گئی۔ بہر حال ان محفلوں میں عمومی طور پر چند چیزیں دیکھی جاتی ہیں، جو بڑی ایمان افروز ہیں، مثلاً:

(۱) بخاری شریف کے اس آخری درس میں شامل ہونے کے لئے قریبی علاقوں کے علی الرغم دور

دراز کے علاقہ جات سے عوام الناس، علماء اور دانشوران سمیٹ سمیٹ کر آتے ہیں، درس بخاری میں شریک ہوکر اپنے ایمان ویقین کو تازہ کرتے ہیں۔

(۲) یہ درس بڑا شاندار، پرسکون اور بڑا ایمان افروز ہوتا ہے، درس کے اختتام پر طول طویل دعائیں ہوتی ہیں، ہر ایک دعا میں شامل ہوکر اپنی مغفرات کی التجا بارگاہ ایزدی میں کرتا ہے۔

(۳) دعا ومناجات کے بعد فارغ ہونے والے طلبہ اپنے شیخ سے لپیٹ لپیٹ کر روتے ہیں، اور شیخ کی دعاؤں کے طلب گار ہوتے ہیں۔

یہ اور ان جیسی چیزیں ان محفلوں میں ہوتی ہیں، تو حضرت مولانا کی ساری تدریسی زندگی میں ایسا معمول دیکھا گیا تھا، اور اس حوالے سے فاضل گرامی مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ:

اور ؎

آہ تو اے شیر ارکان حامل دین متین ÷ زندگی رشک ملائک آپ کی تھی بالیقین
فقہ وسنت کا تھا مخزن درس وافتا کا امام ÷ اور محافظ تھا سلف کے علم وحکمت کا تمام
زندگی تیری مجسم پیکر حلم ووقار ÷ تیری فرقت سے ہوئی اب باعث صد اضطرار

اور پھر ؎

سب کشتۂ غم ہیں کوئی دل شاد نہیں ہے ÷ اک درد ہے جس سے کوئی آزاد نہیں ہے
اس بزم سے کیا چل بسے وہ رونق گیتی ÷ اب نور بھری محفل ارشاد نہیں ہے
کیا چل بسے مخدوم جہاں حضرت سیّد ÷ اب شاد کوئی مجمع وافراد نہیں ہے
اے کاتب اعمال نہ لکھ شبیر کی تقصیر ÷ روداد ہے یہ شکوۂ بے داد نہیں ہے

عام مقبولیت ومحبوبیت:

سرزمین ارکان اور برما میں یوں تو علماء صلحاء مشائخ وبزرگان دین کی کمی نہیں تھی اور الحمدللہ آج بھی نہیں ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو یہاں بڑی مقبولیت ومحبوبیت عطا کی تھی، ایسی مقبولیت ومحبوبیت کہ علماء ہو یا دانشوران، عوام ہو یا زندگی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھنے والے یعنی ہر کس وناکس کا دل

آپ کی طرف کھنچتا تھا۔ علماء وتلامذہ کا تو آپ سے تعلق تھا ہی، اور عوام کو بھی، اس لئے کہ آپ میں شفقت ورحمت، خوش کلامی وصلہ رحمی، سادگی وخاکساری ایسی تھی کہ غریب سے غریب، مفلوک سے مفلوک الحال لوگ آپ کو اپنا سمجھتے رہے تھے، آپ سے وحشت واجنبیت تو درکنار ہر ایک آپ کو اپنا فریادرس سمجھتے تھے۔

علوم اسلامیہ میں ملکۂ تام :

حضرت مولانا سید الامینؒ کو علوم اسلامیہ میں ملکۂ تام حاصل تھا اور یہ ایک مسلم بات ہے کہ عالم کو جب کسی علم کے اصول وقواعد پر حاوی اور اس کے مسائل ومتعلقات کی معرفت کے بعد استنباط فروع پر قادر ہو کر ملکۂ تام حاصل ہوتا ہے تب وہ اپنے علم کا ماہر کہلاتا ہے اور جب تک یہ کامل ملکہ پیدا نہیں ہوتا تو اس کا علم بھی ناقص رہتا ہے، اس حوالے سے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کامل ملکہ محض مسائل کے حفظ کر لینے اور سمجھنے سے نہیں ملتا۔ کیوں کہ حفظ وفہم تو بعض مسائل علمی کے متعلق عوام سے خواص تک مبتدی سے منتہی تک غرض سب کے مابین مشترکہ پایا جاتا ہے، لیکن ملکہ کسی بڑے عالم اور ماہر فن کو حاصل ہوتا ہے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ملکہ تام مسائل علمیہ کے حفظ وفہم کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، جو حضرت مولانا کو حاصل تھا، اور یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے کہ کہنے میں تو عالم ہر ایک کو کہا جاتا ہے مگر علوم میں ملکہ تام حاصل کئے ہوئے علماء کہنے نے میں بہت ہی کم ملتے ہیں۔ اب حضرت مولانا کے متعلق ہم دعوی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کو تفسیر ہو یا حدیث، فقہ ہو یا اصول غرض علوم اسلامیہ کے متعلقہ ہر ایک فن سے گہری مناسبت ہو گئی تھی اور ان تمام فنون میں اپنی خداداد صلاحیت اور انتھک محنت وجد وجہد سے ملکہ تام حاصل ہو چکا تھا۔

مولانا بحیثیت مفسر قرآن کریم :

عام طور پر حضرت مولانا سیّد الامین صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث صاحب کے نام سے مشہور ومعروف تھے، سرزمین ارکان میں دور آخر میں گنے چنے چند حضرات محدث صاحب کے نام سے معروف تھے، ان میں ایک جنوبی منگڈو کے نامور عالم دین حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے، اور دوسرا شمالی منگڈو میں ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید الامین صاحب تھے۔ یوں تو ارکان میں

محدث صاحب کے نام سے اور بھی چند حضرات علماء کرام کو جانا جاتا ہے، مگر مذکورہ دونوں حضرات کے نام کے ساتھ حدیث کی یہ نسبت عام طور پر مسلّم تھی، اور دونوں اپنے زمانے کے مسلم شیخ الحدیث بھی تھے۔

> ’’ختم بخاری شریف کے دن لوگ جوق در جوق حلقۂ درس میں شامل ہوتے ہیں، صحیح بخاری کی آخری حدیث پر حضرت کی شاندار تقریر وتوضیح ہوتی، درس کے آخر میں دربار الٰہی میں بڑی بلند آواز سے دعائیں اور التجائیں ہوتی ہیں، عوام الناس، مدرسین، طلبہ اور دانشوران ہر ایک افراد رو رو کر چلا چلا کر دعائیں کرتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دار الحدیث کی سطح پٹ رہی ہے اور آسمان سے رحمت کی بارش برس رہی ہے، یہ حلقۂ درس نہایت بارقار، پرسکون اور حشمت وعظمت سے بھرا رہتا، دوران درس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک اعلیٰ پایہ کے محدث، مفسر، متکلم اور مجتہد نے تفسیر وحدیث منطق وفلسفہ، نحو وصرف، ادب وبلاغت کے آسمان میں علوم وفنون کی گل کاری کا کام انجام دے رہا ہو۔ میدان جتنا بھی خشک وبنجر کیوں نہ ہو، کہ آپ کی آب پاشی سے تر وتازہ ہو رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپ علوم وفنون میں یکتائے روزگار تھے، آہ! آج حضرت اس دنیا میں نہیں ہیں اور آپ کی وفات حسرت آیات سے سرزمین ارکان میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے، اس کا پورا ہونا از حد مشکل ہے، شاید امکانِ بعید کا عین مرادف بھی‘‘۔

مولانا سید الامین صاحب علوم قرآنیہ میں بڑے ہی درک رکھتے تھے، قرآن کریم جو عرب کی لغت اور ان کی بلاغت کے اسلوب پر نازل ہوا، حضرت مولانا قرآن مجید کے لفظ لفظ اور جملہ جملہ کے معنی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چوں کہ قرآن کریم ظاہر ہے کہ ایک مرتبہ میں نازل نہیں ہوا تھا بلکہ تھوڑا تھوڑا آیت آیت بحسب ضرورت نازل ہوا تھا، تاکہ وحدانیت کی تعلیم دی جاسکے، مذہبی فرائض بتائے جاسکیں، جہاں ایمان وعقائد کی تعلیم بھی ہو اور اعمال جوارح کی تعلیم بھی، یوں قرآن کچھ پہلے نازل ہوا اور کچھ پیچھے اس لئے اس میں کچھ ناسخ ہے اور کچھ منسوخ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ضرورت سمجھتے تھے مجمل کی تفصیل فرمادیتے تھے۔ اور ناسخ ومنسوخ کو الگ کر دیتے تھے۔ اس طرح صحابہ

کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کو وقت وقت پر ان باتوں کا علم ہوتا رہاتھا، وہ جانتے تھے کہ فلاں آیت کیوں اور کس وقت نازل ہوئی، اور کون سی بات نزول وقت کے مقتضی تھی۔ ان صحابہ کرام کے یہ ساری باتین تابعین نے نقل کیں، آگے یہ سلسلہ جاری رہا، بعد میں قرآن کریم کے حوالے سے معارف ذہنیہ علوم بنے اور بہت ساری کتابیں مدوّن ہوئیں۔ اور بہت ساری برگزیدہ ہستیوں نے قرآن کریم کی تفاسیر لکھیں۔ تو حضرت مولانا سید الامین صاحب تفسیر اور علوم قرآن کے حوالے سے مذکورہ ان سارے حقائق ومعارف سے مطلع تھے۔ انہوں نے اپنی تدریس میں طلباء کو وہی کچھ سکھایا تھا جو رسول خدا، صحابہ کرام، تابعین وتبع تابعین سے سلسلے وار منتقل ہوکر ان کے یہاں پہنچا تھا۔ تفسیر قرآن کے حوالے سے ان کے شاگردان ایسے نکات بیان کرتے ہیں جو عام طور پر کتابوں میں نہیں ملتے، یہ وہی علوم ہیں، جو ان کے تلامذہ نے اپنے شیخ واستاد سے سیکھے تھے۔

مولانا سید الاٴمین صاحب علوم لسانیہ یعنی لغت، اعراب، بلاغت وادب اور نحو وصرف کے بڑے ماہر استاد تھے، اور اہل زبان کے کلام کے اصول وضوابط سے واقف بھی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ تفسیر نقل کے جملہ فنون سے واقف عالم دین تھے، تفسیر نقل سے میری مراد وہ تفسیر ہے، جس میں اسلاف امت کی روایتیں ہوتیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کون سی آیت ناسخ ہے اور کون سی آیت منسوخ۔ اور آیات کی شان نزول کیا تھی اور ان کے مقاصد کیا تھے، یہ ساری باتیں بالکل نقل پر منحصر ہیں، اور متقدمین مفسرین بالاستیعاب ان باتوں کو تفاسیر میں لکھ چکے تھے، رویات میں بعض وجوہات کی بنیاد پر جو رطب ویابس شامل ہوگیا تھا، جس طرح کہ تفسیر میں اسرائیلی روایات، تو حضرت مولانا ایسی رطب ویابس رویات سے بھی بخوبی واقف تھے، تدریس کے دوران طلباء کو ان ساری باتوں سے مولانا واقف کراتے تھے، اہل علم ان باتوں سے بخوبی واقف ہے کہ تفاسیر میں مصادر کی حیثیت رکھنے والے کتب دوطرح کی ہوتی ہیں، ان میں سے ایک تفسیر نقل اور دوسری لسانی نکات کی تفاسیر۔ ان میں سے موخر الذکر تفاسیر جن میں زبان وحرکات اور وضاحب کی لمبی چوڑی بحث کی گئی ہے، ان تفاسیر میں ہم دیکھتے ہیں کے جن سے لغت واعراب، فصاحت وبلاغت کے حوالے سے تو بحث ہوئی مگر معانی قرآن، قصص واخبار سے تعرض ہی نہ کیا گیا، اس طریقہ پر جو تفسیریں لکھی

گئیں، ان میں تفسیر کشاف بڑے رتبہ کی تفسیر ہے، اس کے مصنف علامہ زمخشری اگرچہ معتزلی تھے، ان کی اکثر وبیشتر حجتیں بے جا تھیں، جمہور اہل السنت والجماعت ان کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن وہ عربی زبان ولسان، ادب وبلاغت پر پوری مہارت رکھتے تھے۔ تو حضرت مولانا ان تمام باتوں سے واقف تھے کہ مفسرین میں سے کون کس درجہ کے تھے، اور کون کس فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دوران درس مولانا ان تمام باتوں کو تلامذہ کے سامنے کھل کر بیان کرنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

حدیث اوراس کے ساتھ مولانا کی دل چسپی :

علوم اسلامیہ میں علم الحدیث بڑا وسیع علم ہے، اور اس کے اقسام بھی بہت سے ہیں۔ اس لئے اس فن میں مہارت حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم تھا اور اس کی خاص عنایات تھیں کے حضرت مولانا سید الاٴمین صاحب رحمہ اللہ اس فن شریف کے کامل ہو پائے تھے۔

حضرت مولانا اس فن شریف میں بڑے ہی راسخ العلم تھے اور یہ جو دنیا ان کو محدث صاحب کے نام سے جانتی پہنچانتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت اس نسبت کے قابل انسان تھے۔

ایک حیثیت سے علم حدیث ایک کٹھن علم ہے، علماء جانتے ہیں کے حدیث میں بہت ساری احادیث کا تعلق ناسخ ومنسوخ سے ہے، کیوں کہ بحسب مصلحت امت شارع علیہ السلام نے ایک حکم کے بعد بعض وقت دوسرا حکم واجب العمل قرار دیا ہے، تا کہ بندگان خدا کو سہولت ہو، اس لئے ناسخ منسوخ میں فرق کرنا، اس کے بعد متعارض احادیث میں تمیز کرنا، پھر ان کے مراتب مقرر کرنا بذات خود ایک کٹھن کام ہے، جس کے لئے بڑے وسیع علم، معلومات اور ادراک کی ضرورت ہے، علاوہ ازیں جب دو حدیثیں مثلاً نفی اثبات میں متعارض ہوں، اور جمع بین الاحادیث کسی بھی تاویل سے ممکن ہی نہ ہو اور معلوم ہو جائے کہ فلاں حدیث پہلے ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ دوسری یا پچھلی حدیث ناسخ ہے، غرض یہی ناسخ منسوخ کا علم بذات خود فن حدیث میں جو ایک مشکل ترین کام ہے، ان سارے علوم پر عبور حضرت مولانا مرحوم کو حاصل تھا۔ جہاں تک معلوم ہوا کہ حضرت مولانا نے فن حدیث کی معروف

ومتداول ساری کتابیں پڑھائیں، صحاح ستہ کے علاوہ مثلاً مشکوۃ المصابیح کا درس بھی دیا، البتہ صحاح ستہ میں چوں کہ صحیح بخاری کا درجہ سب سے بلند تر سمجھا جاتا ہے، یہ کتاب شریف ہمیشہ آپ کے درس میں رہی تھی، اور یہ کون نہیں جانتا ہے کہ ہمارے مدارس اسلامیہ میں شیخ الحدیث اسے کہا جاتا ہے، جو صحیح بخاری شریف کا درس دیتے ہوں، اسی لئے حضرت مولانا ہر زمانہ اور ہر جگہ جہاں انہوں نے درس دیا، شیخ الحدیث کے منصب جلیلہ پر فائز رہے تھے۔ اب یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کرام سے اس فن شریف کے حوالے سے کچھ ضروری باتیں عرض کردوں، تاکہ علم وآگہی میں اضافہ ہوجائے۔

ابتدائی زمانے میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا دارومدار نقل ہی پر تھا۔ حضرت امام مالک وہ پہلے بزرگ ہیں جو نہایت جہد مسلسل سے احادیث صحیحہ کو غیر صحیحہ سے الگ کرتے رہے تھے، یہاں تک تمام ضعیف احادیث کو نکال کر صحیح کو الگ کردیا تھا، اور اپنی مشہور کتاب ''موطا'' لکھی تھی۔ جس میں آپ نے متفق علیہ احادیث کے اصول لکھ کر فقہی طریق پر ابواب کی تقسیم کی اور احادیث کو بالاستعاب بیان فرمایا۔

اس کے بعد حفاظ حدیث نے اختلاف اسناد کی طرف توجہ کی اور حدیث کے ساتھ انہیں بھی حفظ کرنے لگے، چوں کہ کثرت سے ایسی حدیثیں موجود تھیں، جن میں سے ایک ایک حدیث کو متعدد راویوں نے اپنے طریقہ سے بیان کیا تھا، اور معانی کے اختلاف کی وجہ سے وہ حدیثیں کئی کئی بابوں میں آسکتی تھیں۔ اس لئے امام المحدثین محمد بن اسماعیل البخاری نے اپنے زمانے میں اپنی کتاب صحیح بخاری میں احادیث کو حجازی شامی وعراقی طریقوں سے بیان کیا۔ اور صرف وہ حدیثیں لکھیں جو متفق علیہ ہیں۔ اور چوں کہ ایک حدیث متعدد معنوں کی وجہ سے کئی باب کے تحت آسکتی تھی، اس لئے بخاری شریف میں ایک ایک حدیث کئی کئی بار آتی ہے۔ یہاں اور ایک بات عرض کردوں کہ صحابہ وتابعین کے زمانے میں راویان حدیث کے تمام حالات ان کے ہم وطنوں کو معلوم تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ کون ثقہ ہے اور کون غیر ثقہ، کس کی طبیعت میں احتیاط ہے اور بے احتیاطی کس کے مزاج پر غالب ہے، غرض روایت کے لئے جو اوصاف لازمی ہیں، لوگ راویوں کے ان اوصاف سے باخبر تھے۔ اور راویان حدیث کا گروہ حجاز، بصرہ، کوفہ، عراق، شام، مصر میں پھیلا ہوا تھا۔ ان کے جاننے

والے ہر زمانہ میں موجود تھے۔ انہی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اہل حجاز کا طریق روایت کے لحاظ سے سند میں باقی اور تمام جگہوں کے راویوں کی نسبت زیادہ مضبوط اور اعلی درجہ رہا۔ اس لئے کہ حجازیوں نے راویوں کی عدالت وحفظ کا ہمیشہ پورا خیال رکھا اور کبھی بھی مجہول الحال کی روایت کو اختیار نہیں کیا۔ حجازی راویوں کی روایت کی سند اسلاف کرام کے بعد حضرت امام مالک قرار پائے، جو اپنے زمانے میں آپ ہی اپنی نظیر تھے۔ اور عالم مدینہ کہلائے۔ آپ کے بعد روایت کا مدار زیادہ تر آپ کے شاگردان بزرگ حضرت محمد بن ادریس الشافعی اور امام احمد بن حنبل وغیرہ جیسے اکابر ہوئے۔

حضرت امام محمد بن ادریس الشافعی علم الحدیث میں بڑے راسخ العلم بزرگ تھے۔ اور ایسے کامل السند شروط کا آپ کو علم تھا، جن سے حدیث واجب العمل ہوسکتی ہے۔ چوں کہ وجوب عمل ظن صدق پر منحصر ہے۔ اس لئے آپ کی تمام تر کوشش یہی ہوتی تھی کہ ظن صداقت حاصل ہوجائے۔ اور ظن صدق حاصل ہوتا ہے عدالت وضبط کا علم ہونے سے اور پھر یہ علم منحصر ہے محض اس طرح کہ ان راویوں کو علماء ملت وقابل اعتماد راوی نے جرح وقدح سے بری کیا ہو۔ تاکہ ان کی روایتیں قابل عمل وقبول ہوسکیں۔ اور پھر تمام علمائے ملّت جنہوں نے راویوں کے حفظ وضبط، عدالت اور عفت کی تصدیق یا تکذیب کی ہے۔ ایک مرتبہ کے نہیں۔ صحابہ ہوں یا تابعین ان کے مراتب بلحاظ علم وثقاہت خود متفاوت اور مختلف ہیں۔ اس طرح احادیث کی سندیں بلحاظ اتصال وانقطاع متفادت ہیں۔ مثلاً ایک راوی نے جو دوسرے راوی سے حدیث روایت کی، اس نے اس کا زمانہ پایا بھی تھا یا نہیں، اور پایا بھی تھا تو اسے دیکھا بھی ہے یا نہیں، اور اگر دیکھا بھی تھا تو دونوں راویوں میں کوئی ایسی بات تو نہ تھی جس کی وجہ سے ان کی روایت ضعیف ہوجائے۔ جو حدیث اس تمام معیار تنقید پر کھری اترتی ہے وہی قبول کی جاتی ہے۔ اور جو ہر امر میں مشتبہ ومشکوک ہوجاتی ہے وہ رد کردی جاتی ہے۔ ان دونوں اعلی وادنی مراتب کے درمیان اور بھی بہت سے متوسط یا متوسط کے قریب قریب احادیث کے مدارج ہیں۔ جن کے واسطے آئمۂ فن نے خاص الفاظ اصطلاح کے طور پر وضع کر رکھے ہیں، مثلاً صحیح، حسن، ضعیف، مرسل، منقطع، منفصل، شاذ، غریب وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر ہر قسم یا نوع کی حدیث کو ایک بات کے تحت میں لکھتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر حدیث کے متعلق آئمہ لسان کو جو اختلاف واتفاق ہوتا ہے، اس کی

تفصیل کرکے طریق روایت کی شرح کرتے ہیں ۔ کہ آیا ایک راوی نے دوسرے راوی سے حدیث پڑھ کر نقل کی یا لکھ کر، یا کسی اور طریقہ سے پہنچی ۔ اسی کے ساتھ اس کے رد وقبول کے متعلق علماء کی رائے کا اظہار اور حدیث کا درجہ مقرر کرتے ہیں ۔ اس کے بعد حدیث کے الفاظ کی نوبت آتی ہے ۔ غریب ومشکل الفاظ بتاتے ہیں ۔ دوراویوں نے دوجداگانہ لفظ یا ملتے جلتے ایک ہی حدیث میں روایت لئے ہوں تو ان کی بابت خاص اشارہ کرتے ہیں ۔

سطور بالا میں حضرت امام مالک، امام محمد بن ادریس الشافعی اور امام المحدثین حضرت امام بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ کا تذکرہ آیا ہے، اب امام مسلم بن الحجاج القشیری کا زمانہ آیا تو آپ نے بھی امام بخاری کی طرح صرف احادیث صحیحہ ومتفق علیہ کو اپنی زندہ وجاوید کتاب میں جمع فرمایا۔ اور احادیث مکرر کو خذف کرکے طریق روایت واسناد کو ایک ہی جگہ جمع کردیا، اور فقہی احول پر ابواب کی تقسیم کی، جس طرح حضرت امام مالکؒ نے موطا میں کرچکے تھے ۔

اگر چہ امام بخاری اور امام مسلم نے احادیث صحیحہ کے جمع کرنے میں نہایت سعی کی لیکن پھر بھی بہت سی صحیح احادیث چھوٹ گئیں ۔ جن کو دیگر بزرگوں نے پاکر اپنی کتابوں میں لکھا ۔ ان میں حضرت امام ابوداؤدسیستانی، امام ابوعیسی ترمذی، امام ابوعبدالرحمن النسائی قابل ذکر ہستیاں ہیں، جنہوں نے اپنی اپنی سنن میں امام بخاری اور امام مسلم سے زیادہ صحیح احادیث لکھی ہیں ۔ اور جن احادیث میں عمل کی شرطیں پائی گئیں وہی لی ہیں ۔ گویا ان کتابوں میں صحیح وحسن دونوں قسم کی حدیثیں ہیں، یہ ساری کتابیں مشہور اور امت میں مقبول ہیں ۔ اگر چہ اور بھی بہت سی کتابیں فن حدیث میں لکھی گئی ہیں اور بڑے رتبہ کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان سب کا ماخذ یہی کتابیں ہیں، انہی تمام شروط واصطلاحات کا جاننا جو اس فن کے ساتھ منسوب ہیں، یہی علم حدیث ہے، اور جو بزرگ ان سے باخبر اور واقف ودانا ہوتا ہے، اسے محدث کہا جاتا ہے ۔

چلتے چلتے حضرت الامام ابوعبداللہ الحاکم، ابوعمر بن الصلاح اور امام نووی کا تذکرہ بھی کردوں ۔ بات یہ ہے کہ بعض اوقات ناسخ ومنسوخ وغریب احادیث کو علیحدہ کرکے بعض بزرگوں نے ان کو مستقل فن بنا لیا ہے، اور اس سلسلے میں کتابیں لکھی ہیں، اسی طرح بعض بزرگوں نے مختلف وروشن ومشہور کو لیا ہے،

اور ان کو ایک جگہ جمع کرگئے ہیں ۔ علوم احادیث میں اگر چہ بہت علماء نے کتابیں لکھی ہیں، لیکن امام ابوعبداللہ الحاکم ان سب میں سبقت لے گئے ہیں ۔ ان کی مسند بہت ہی مقبول ومشہور ہے اور وہی پہلا بزرگ ہیں جنہوں نے علم حدیث کو تہذیب وترتیب کے اعلی درجہ پر پہنچا کر اس کے محاسن ظاہر کئے ہیں ۔ علاوہ ان کے متأخرین میں سب سے زیادہ مشہور حدیث کی کتاب ابی عمر بن الصلاح کی تالیف ہے، جو ساتویں صدی کے اوائل میں لکھی گئی ہے ۔ اس کے بعد امام محی الدین نووی اپنی تالیف کے حوالے سے ابی عمر بن الصلاح سے بڑھ گئے ہیں ۔ اور تمام فن حدیث کے لبّ لباب جمع کرکے بہت بڑا کام سرانجام دیا ہے ۔

امام طحاوی اور ان کی مسند کا جہاں تک سوال ہے، مختصر یہ ہے کہ امام طحاوی سے بہت سی احادیث منقول ہیں، اور ان کی کتاب مسند طحاوی حدیث کی بلند پایہ کتابوں میں شمار کی گئی ہے، گو کہ صحیحین کے رتبہ کو نہ پہنچی، کیوں کہ امام بخاریؒ وامام مسلمؒ نے جو شرطیں حدیث لینے کے لئے قائم کیں وہ امت کی متفق علیہ ہیں ۔ اور امام طحاوی کی شرطیں غیر متفق علیہ، امام طحاوی نے مجہول وغیرہ کی حدیث لے لی ہے، مگر امام بخاری ومسلم نے اسے جائز نہیں رکھا، اس لئے صحیحین کا رتبہ اس سے بڑھ کر ہے، صرف یہی نہیں بلکہ سنن ابی داؤد، ابن ماجہ اور نسائی کو بھی تقدم کے لحاظ سے طحاوی پر فضیلت دی جاسکتی ہے ۔ یہ تھی کچھ مختصر سی باتیں جو فن حدیث کے متعلق لکھی گئی ہیں ورنہ اس فن کے حوالے سے مجلدات لکھی جاسکتی ہیں، جو دنیا میں لکھی بھی گئیں ۔

الغرض یہ ہے کہ اس فن کے حوالے سے کچھ باتیں اس لئے بھی یہاں لکھی گئیں کہ ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید الامین اس فن شریف کے اصول وفروع سے کامل ومکمل دانا تھے ۔ یوں تو مولانا دیگر علوم وفنون جن میں منقولات بھی ہیں اور معقولات بھی عالم اور شناور تھے ۔ لیکن فن حدیث سے ان کو زندگی بھر جو دلچسپی رہی تھی ۔ شاید دوسرے فنون سے تھی ۔ اسی لئے دنیا ان کو مفسر نہیں ۔ نحوی، صرفی نہیں، بلکہ محدث صاحب کے نام سے جانتی اور یاد کرتی ہے ۔

فقہ اسلامی اور مولانا کا رجحان :

اللہ تعالی کے مکلّف بندوں کے افعال واعمال کے متعلّق احکام الٰہی (از قبیل وجوب وخطر کراہت واباحت وغیرہ) کا جاننا فقہ کہلاتا ہے ۔ یہ علم کتاب وسنت اور شارع علیہ السلام کے مقرر کردہ اصول

ومبادی واحکام سے ماخوذ ومستنبط ہے۔یعنی جو احکام کتاب وسنت کے مبادی اصول سے نکالے جاتے ہیں فقہی کہلاتے ہیں ۔

اسلاف کرام اپنی اصول ومبادی سے باختلاف رائے واجتہاد احکام نکالتے تھے۔ چنانچہ ان کی رائے کا اختلاف عام طور سے مشہور ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ اختلاف ہونا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ جو احکام کے اصول قرآن میں ہیں ان کے الفاظ کے مقتضات ومعانی کئ کئ نکلتے ہیں۔ اسی طرح سنت رسول صلوات اللہ تعالی وسلامہ ہے، کہ اس کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ اور ان میں سے بعض ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اور کسی ایک کو ترجیح دیئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اور ترجیح میں بھی محدثین مختلف پائے جاتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ واقعات ومعاملات نئے نئے پیش آتے رہتے ہیں، جن کے لئے متن کلام اللہ اور ذخیرۂ احادیث میں کوئی حکم بظاہر نہیں ملتا، یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے اختلاف سے چارہ نہیں رہتا، انہی امور کی وجہ سے اسلاف امت اور ان کے متبعین اور آئمۃ کبار میں اختلاف ہوا ہے، علم دین وشریعت سے نابلد لوگ ان اختلافات کو مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں، جب کہ اس حوالے سے اسلاف امت اور ائمۂ مجتہدین کے اختلافات دراصل امت کے لئے رحمت بنے ہوئے ہیں، ان سارے امور کی بڑی تفصیلات ہیں، اور اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں لکھی جاچکی ہیں، اس عجالہ میں ہم اس طرف جانے کو نہیں چاہتے۔ امت مسلمہ میں جو چار فقہی مکتب ومسلک رائج ومسلم ہیں، ان سے میں حضرت امام اعظم ابوحنیفۃ اور ان کے فقہ کا بہت بلند مقام ہے، فقہ میں جو بلند مقام اور عالی رتبہ انہوں نے پایا اور کسی بھی امام نے نہیں پایا، یہاں تک امام مالکؒ اور امام شافعیؒ بھی کہنے لگے تھے کہ فقہ میں کوئی امام ابوحنیفہ کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔

فقہ اسلامی میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بعد حجاز میں امام مالک بن انس اصبحی مسلّم ہوئے، آپ کو استنباط احکام کے لئے دیگر ائمۂ اہل السنت والجماعت کی نسبت ایک خصوصیت مزید حاصل تھی وہ ہے اہل مدینہ کا عمل، جو اہل مدینہ کو آباؤ واجداد سے مسلسل پہنچا تھا۔ جس کی اقتدا کو بہت ہی ضروری سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ان کے اسلاف زمانۂ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے چلے آتے تھے، وہی وہ بھی کرتے تھے، اور جو فعل آقا علیہ السلام کے زمانے سے اسلاف کا متروک تھا، امام صاحب

کے زمانہ والے بھی اس سے اجتناب وپرہیز کرتے تھے۔ گویا امام مالک بن انسؒ کو اہل مدینہ کا عمل دلیل شرعی تھا۔ یہاں تک کے لوگ خیال کرنے لگے کہ اہل مدینہ کا عمل اجماع کا حکم رکھتا ہے، لیکن علاّمہ ابن خلدون کے مطابق امام صاحب نے لوگوں کے اس فہم سے انکار کیا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ کہہ بھی دیا تھا کہ اجماع اہل مدینہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام امت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

حضرت امام مالک بن انسؒ کے بعد امام محمد بن ادریس الشافعیؒ مدینہ سے عراق گئے۔ اور امام ابوحنیفۃ کے اصحاب وتلامذہ سے پڑھے اور اکتساب فیض کیا، اور خصوصی طور پر فقہ حاصل کی، انہوں نے اہل حجاز کا طریقہ اہل عراق کے اصول سے ملا جلا کر اپنا فقہی مسلک الگ قائم کرلیا، اور اکثر مسائل میں حضرت امام مالک سے تعرض کیا۔

حضرت امام شافعیؒ کے بعد حضرت امام احمد بن حنبل کا زمانہ آیا جن کا مرتبہ حدیث میں بہت بلند تھا۔ ان کے اصحاب، تلامذہ اور شاگردوں نے امام ابوحنیفہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کئے۔ اور بڑے پایہ کے محدث ہونے کے باوجود فقہ حنفی سے مستفید ہوئے، اس طرح پر اہل السنت والجماعت کے چوتھے مذہب یا فقہی مکتب کی بنیاد پڑی، پھر ممالک اسلامیہ میں انہی چاروں فقہی مذاہب کی تقلید عام ہوگئی۔ اور ان کے علاوہ باقی جتنے اور مذاہب تھے اور جن میں اہل ظواہر قابل ذکر ہے بھولے بسر گئے۔

ادھر اہل ظواہر کے نام سے امت میں ایک گروہ نکلا، جس کا امام امام داؤد بن علی تھے۔ انہوں نے قیاس سے سراسر انکار کرکے قیاسی احکام کو بالکل باطل ٹھہرایا، اور تمام کو احکام نصوص واجماع پر منحصر وموقوف کردیا۔ یہاں تک کہ واضح اور علل منصوصہ تک کی تردید کی۔ اسی طرح اہل بیت نے بھی اپنے مذہب کے مطابق جداگانہ علم فقہ مدوّن کرلیا تھا، جس کی تاریخ بڑی طولانی ہے۔ ان کے اس مذہب میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ بعض اصحاب رسول اللہ صلی اللہ کی قدح اور ان کے ائمۂ کی معصومیت جیسے مسائل داخل اصول تھے۔ اسی طرح خوارج نے بھی اپنے وہمی اصول پر مبنی ایک اپنی فقہ تیار کرلی تھی۔ لیکن اصحاب ظواہر کی طرح ان کی یہ فقہ بھی جمہور امت کی قدح وانکار کا نشانہ رہی۔ جہاں وہ لوگ رہتے تھے وہاں ان کے خیالات کے جاننے والے تھے۔ باقی اسلامی دنیا میں علمی حیثیت سے انہیں کوئی جانتا نہیں تھا۔ اسی طرح جہاں اہل بیت کی حکومتیں تھیں۔ وہیں ان کی فقہ رائج تھی، اور جہاں تک

خوارج کا سوال ہے کہ خوارج جس ملک میں تھے وہیں ان کے احکام جاری تھے۔

الغرض اہل السنت والجماعت کے لوگوں نے انہی مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کی تقلید کو اپنے لئے لازم کرلیا، اس معاملہ میں یہاں تک تشدد برتا کہ ان مذاہب میں سے ایک اختیار کرنے کے بعد دوسرے مذہب وامام کی تقلید بھی جائز نہ رکھی۔ اسی لئے اہل السنت والجماعت میں انہی مذاہب اربعہ کی تقلید باقی رہ گئی۔

عالم اسلام میں انہی مذکورہ بالا مذاہب اربعہ کی تقلید ہوتی ہے، ان چاروں مذاہب میں سے امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد نسبتا کم ہیں، پھر شام، عراق، بغداد وغیرہ میں حنبلی المذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

عالم اسلام میں حنفی مذہب کے مقلدین نسبتاً بہت زیادہ ہیں، خصوصی طور پر ہندوچین کے علاقوں میں، اسی طرح عراق، ماوراء النہر اور تمام ممالک عجم میں حنفی مسلک کے ماننے والے پھیلے ہوئے ہیں، حضرت امام ابوحنیفہ کے شاگردوں نے خلفائے عباسیہ کی صحبتوں میں رہ کر بہت سی گرانمایہ کتابیں لکھیں، اور دیگر مذاہت کے لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے بڑی گہری نظر سے کام لیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا علم فقہ فقہی اصولوں کے مطابق کامل ہوگیا ہے۔

مذہب شافعی کو مصر میں زیادہ مقبولیت ملی۔ چوں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے مصر میں سکونت اختیار کی تھی، کچھ دنوں کے بعد مصر میں رافضیوں کی سلطنت اور ان کی فقہ رائج ہوئی تو اسی زمانے میں اہل سنت کی فقہ سے مصر تقریباً خالی ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت سلطان صلاح الدین ایوبی کا زمانہ آیا، اور انہوں نے عبیدیوں کی سلطنت کو مٹا کر اپنی سلطنت قائم کی اور فقہ شافعی کو از سر نو مصر میں رواج دیا تھا۔ چوں کہ اس وقت عراق وشام میں بھی شاگردان امام شافعی کثرت سے موجود تھے۔ یوں بہت جلد فقہ شافعی کی گرم بازاری ہوگئی تھی۔ فقہ شافعی کے حوالے سے امام محی الدین النووی اور عزالدین عبدالسلام نے ملک شام میں بہت بڑی شہرت حاصل کی۔ اسی طرح مصر میں ابن الرفعہ نے بڑا نام پایا، ان کے بعد تقی الدین بن دقیق وتقی الدین سبکی امام وقت مانے گئے۔ اور ایک زمانہ میں شیخ الاسلام سراج الدین بلقینی کے علم وفضل کا ڈنکا بجا تھا۔

حضرت امام مالک بن انس کا مذہب افریقہ کے دور دراز ممالک کے علاوہ اندلس میں زیادہ پھیلا، اس

کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان ممالک کے لوگ تحصیل علم کے لئے حجاز اور خصوصی طور پر مدینہ منورہ آتے تھے، یوں علمائے مدینہ سے ان کو زیادہ استفادہ کا موقع ملا اور مدینہ میں امام مالک یا ان کے شاگرد ہی مسند تدریس پر متمکن تھے، یوں یہاں سے علم حاصل کر کے جو گیا مالکی المذہب ہو کر گیا، اور اپنے اپنے ملک میں اس مذہب کا رواج دیا۔

مذاہب اربعۃ کی تقلید عام ہونے کے بعد جب ہر ایک امام کا مذہب ومسلک مستقل ہوگیا تو جزئیہ مسائل کے پیش آنے پر صراحت ونظیر مثال اور الحاق مسائل کی ضرورت پیش آئی، تا کہ بغیر اجتہاد جدید صاحب مذہب ہی کے اصول وقواعد کے موافق مسئلہ پیش آمدہ کسی مسئلہ مقررہ کے تحت میں لے لیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ توثیق وتطبیق کسی مذہب میں مہارت تامہ کے حصول کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہی ملکہ حاصل کرنا آج کل علم فقہ کہلاتا ہے۔

یوں ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید الامین صاحب کو علم فقہ کے حوالے سے یہی ملکہ حاصل تھا۔ چوں کہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے پورے علاقے اہل السنت والجماعت سے بھرے پڑے ہیں، اور اہل السنت والجماعت میں حنفی مسلک کے لوگوں کی بھاری اکثریت ہے، اور خصوصی طور پر دارالعلوم دیوبند اور اس کے مشرب پر مدارس دینیہ کی انگنت شاخیں ہیں، یوں ان مدارس دینیہ کی بدولت اس پورے علاقے میں حنفی مذہب کے پیروکاروں کی بڑی کثرت ہے، اس نسبت سے سرزمین ارکان روشن ومنور ہے، یہاں کے مسلمان سارے کے سارے اہل السنت والجماعت میں سے مذہب حنفی کے پیرو اور دیوبندی مشرب ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ یہاں اہل بدعت وخرافات کا راج نہ چلا اور نہ چلتا ہے۔

مولانا رحمہ اللہ کی پیدائش حنفی المذہب اور دیوبندی المشرب کے گھرانے اور ماحول میں ہوئی، ان کی تعلیم کی ابتدا بھی حنفی ودیوبندی المشرب میں ہوئی اور انتہاء بھی، اسی لئے ان کی پوری زندگی انہی مسلک ومشرب میں گزری ہے۔

لیکن حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالی اہل السنت والجماعت کے بعض دیگر حنفی ودیوبندی علماء کی طرح متشدد نہیں تھے۔ ان کے افکار واعمال میں وسیع المشربی تھی، وہ صحیح کو صحیح اور ان کے خیال میں غلط کو غلط

کہنے اور ٹھہرانے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تھے، اس حوالے سے حضرت مولانا کے ایک نامور شاگرد عالم دین مولانا سلیم اللہ بن عبدالرحمن مرنگلوی کا ایک مختصر بیان درج کر دیتا ہوں، جو انہوں نے راقم سطور سے ایک ملاقات میں دیا تھا۔

’’حضرت مولانا سید الامین صاحب بڑے جلیل القدر، وسیع الخیال، بالغ نظر اور فراخ دل عالم دین تھے۔ درس نظامی کی متداول کتابوں کے درس کے حوالے سے آپ کی نظیر ان کے زمانہ میں نہ تھی۔ میں نے حضرت مولانا سے درس نظامی کی چند مشکل کتابیں پڑھیں۔ ان کی تقریر بڑی دلنشین اور دلاویز ہوتی تھی۔ تفسیر، حدیث، اصول اور فقہ اسلامی کے علاوہ منطق وفلسفہ میں آپ یکتائے روزگار تھے، ہر ایک فن کے بڑے ماہر تھے۔ حنفی المسلک اور دیوبندی المشرب تو تھے ہی مگر دیگر بعض حضرات کی طرح متشدد نہیں تھے، قرأت خلف الامام اسی طرح آمین بالجہر وغیرہ کے حوالے سے آپ فرماتے تھے کہ احادیث کی روشنی میں دیکھا اور پر کھا جائے تو ان چند مسائل میں اہل حدیث کی آراء راجح ہیں، چوں کہ مسائل فروعی ہیں، اسی لئے ان فروعی اختلافات کے ذریعے ارکان کے مسلمانوں کو فتنے میں ڈالنے کی وقت کا تقاضا اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر گنجائش نہیں ہے۔ مولانا سلطان احمد صاحب پوئما لویؒ نے ببانگ دہل اعلان کر کے خود غیر مقلد ہونے کا الزام اپنے سر لے لیا تھا، فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ بڑی بڑی تکالیف ان کو برداشت کرنی پڑیں۔

اسی لئے حضرت مولانا سید الامین صاحبؒ ان فروعی مسائل کو سامنے لا کر ارکان کے مسلمانوں کو مزید فتنے میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا کے ہم عصروں میں حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب گرھا خالوی رحمہ اللہ بڑے پایہ کے عالم دین تھے۔ حنفی اور دیوبندیت کے دائرے میں رہنے والے تھے، حضرت مولانا سید الامین کی طرح حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب بھی تفسیر وحدیث، فقہ واصول

غرض علوم اسلامیہ کے ماہر عالم دین تھے‘‘۔

یہ تھی بات بعض فروعی مسائل کے حوالے سے مولانا کا رجحان اور خیالات، ورنہ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے فقہ وفتاوی میں جو ملکہ عطا فرمایا تھا، اس اعتبار سے لیا جائے تو مولانا طبقۂ مجتہدین میں سے بذات خود ایک مجتہد تھے، پھر بھی زندگی بھر مذہب حنفی کے پابند ہی رہے تھے۔

علوم عقلیہ کی مہارت :

حضرت مولانا سید الأمین صاحب جس طرح علوم نقلیہ کے ماہر تھے اسی طرح علوم عقلیہ کے بھی ماہر تھے، یعنی آپ رحمہ اللہ تعالیٰ معقولات ومنقولات کے سنگم تھے، ہمارے ملک میں اس عنوان سے دور آخر میں بہت سے علماء حضرات معروف ومشہور ہیں، لیکن صرف اگر معقولات کے حوالے سے بات کی جائے تو ایسے بہت ہی کم حضرات نظر آئیں گے جو معقولات کے جملہ اقسام سے واقفیت رکھتے ہوں، اس بات سے میرا یہ مطلب بھی نہیں کہ حضرت مولانا سید الامین صاحب بھی اس کلیہ سے خارج تھے، مگر یہ سچ ہے کہ مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ علوم عقلیہ کے اکثر وبیشتر اقسام کے عالم، ماہر اور معلم تھے۔

کہتے ہیں کہ علوم عقلیہ دنیا میں اس وقت سے پیدا ہونے شروع ہوئے جبھی انسان کا وجود اس عالم میں ہوا، انسان چوں کہ صاحب فکر ورائے ہے، اس لئے علوم عقلیہ اس کی طبیعت میں شامل ہیں، علوم عقلیہ کو علماء فلسفہ اور حکمت سے تعبیر کرتے ہیں، جو کہ چار اقسام پر مشتمل ہے :

(۱) علم منطق: جو موجودات اور اس کے عوارض پر غور وفکر کرتے وقت ذہن کو غلطی سے بچاتا اور امور معلوم سے نامعلوم تک پہنچاتا ہے۔

(۲) **علم طبیعی** : جس میں اجسام عنصریہ مثلاً معدنیات، نباتات، حیوانات، اجسام فلکی، حرکات طبیعیۃ ومبداء حرکات کی حقیقت سے بحث کی جاتی ہے۔

(۳) **علم الٰہی** : جس میں ایسے امور سے بحث ہوتی ہے جو جسمانی طبیعہ سے ماوراء ہیں، اور داخل روحانیت پائے جاتے ہیں۔

(۴) **علم التعالیم** : جس کا موضوع مقدار ہے، جس کی چار قسمیں ہیں :

(الف) ہندسہ : جو مقدار مطلق کے عوارض سے بحث کرتا ہے، عام اس سے کہ وہ منفصل ہو جیسے

معدودات، یا متصل ہو از قبیل خط وسطح وجسم ۔

(ب) **ارثماطیقی (ارتھمیٹک)** : جو مقدار منفصل یعنی اعداد کے عوارض کی بحث سے مخصوص ہے (ج) **تیسری موسیقی** : جس سے نغمہ وصوت کی باہمی نسبت کا علم حاصل ہوتا ہے، اسی علم سے الحان وگلوکاری کے اصول معلوم ہوتے ہیں۔

(د) **علم ہیئت** : جس سے افلاک کی اشکال واوضاع، سیاروں کی رفتار کی رجوع واستقامت، اقبال وادبار کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

فلسفہ کی سات اصول ہیں، ان تمام اصولوں میں منطق جس کی بحث سامنے آرہی ہے سب پر مقدم ہے، اس کے بعد ارتھمیٹک پھر اس کے بعد ہندسہ اور ہیئت کا نمبر آتا ہے، پھر ہیئت کے بعد موسیقی طبیعات والٰہیات کا درجہ ہے اور یاد رہے کہ ان علوم میں سے ہر علم کی کئی کئی شاخیں ہیں، مثلاً طبیعیات میں علم طب، علم الاعداد میں حساب، فرائض ومعاملات ہیئت میں زائچہ جس میں کواکب کی حرکات کا حساب اورحرکات کی تعدیل کا زائچہ تصویر ونقشہ لکھا جاتا ہے، تاکہ سیاروں کی حرکت ومقام کا حال آسانی کے ساتھ اس نقشہ سے معلوم ہوجائے، اسی طرح احکام نجوم بھی اس فن کی فروعات میں شمار ہیں۔

علوم عقلیہ کسی خاص قوم یا کسی خاص ملت سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قوم وملّت میں اس کے جاننے والے موجود تھے اور موجود ہیں۔ البتہ زمانہ قدیم میں جب تک یونانیوں کی حکومت رہی، علوم فلسفہ کا ان میں خوب رواج رہا تھا۔ ان میں بڑے بڑے حکماء پیدا ہوئے تھے، پھر ان مشائیوں سے رواقیوں نے طریقۂ تعلیم میں خاص کمال حاصل کیا، اور عرصۂ دراز تک سند تعلیم ان کے یہاں متصل رہی۔ کہتے ہیں کہ لقمان حکیم سے بقراط جوان کا شاگرد تھا نے علم حاصل کیا، اور بقراط سے افلاطون نے اور افلاطون سے ارسطو نے اور ارسطو سے سکندر افرادوسی وتاجسطیون وغیرہ بڑے بڑے نامور حکماء نے سند تعلیم حاصل کی تھی ۔

جب اسلامی دولت وعظمت بڑھی اور اسلامی تمدن نے جڑ پکڑی تو مسلمان علوم وصنائع کی طرف جھکے اور انہیں علوم فلسفہ کی حقیقت دریافت کرنے کا خیال آیا۔ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے شاہِ روم کو لکھا کہ ریاضی کی بعض کتابوں کا ترجمہ بھیجے، تو شاہ روم نے اقلیدس اور طبیعیات کی بعض کتابیں منصور کے

پاس بھیج دیں، اب مسلمانوں نے جب ان کتابوں کو پڑھا تو شوق اور بڑھ گئے، یہاں تک کہ فلسفہ کی دیگر کتابوں کی جستجو میں لگ گئے، بعد ازاں مامون الرشید کا زمانہ آیا تو اس نے ملوک روم کے پاس اپنے ایلچی بھیج کر یونانیوں کی کتابیں منگوائیں اور ترجمہ کا شعبہ قائم کرکے ان کتابوں کا ترجمہ کروایا، ان کتابوں کی اشاعت کے بعد مناظرین اسلام نے بھی وقت کی ضرورت دیکھ کر ان علوم کو حاصل کیا اور اس قدر کمال پیدا کیا کہ اور تو اور ارسطو جسے معلّم اول کہا جاتا ہے کی اکثر رائیوں سے اختلاف کرکے اپنا نیا مسلک اختیار کرلیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ معلم اول کی تردید پر کیا منحصر، ان مسلمان حکماء نے حکمائے یونان میں سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا، اور بڑی بڑی کتابیں علوم فلسفہ میں تصنیف وتالیف کر ڈالیں، ان مسلمان حکماء میں سے مشرق میں ابونصر فارابی، ابوعلی ابن سیناء اور اندلس میں ابن رشد القرطبی اور وزیر ابوبکر ابن الصائغ بڑے نامور ہوئے۔

اب علم منطق کا جہاں تک سوال ہے، تو ظاہر ہے کہ علوم عقلیہ یعنی فلسفہ وحکمت میں اس کا اوّل درجہ ہے، اس علم کے لئے متقدمین فلاسفہ وحکمت نے اس فن کے قدرے ضوابط وقواعد نکالے تھے، لیکن ارسطو کے زمانے تک اس کی تہذیب وترتیب نہ ہوسکی تھی، اور اس فن کے سارے مسائل بکھرے پڑے تھے، تو ارسطو نے اس فن کی تہذیب وترتیت کی، اس لئے اس فن کے حوالے سے اسے معلم اوّل کہا جاتا ہے۔

ارسطو کی منطق کی کتاب کا نام ”نص“ ہے جس میں آٹھ رسالے ہیں، چار میں صورت قیاس کی بحث ہے اور چار میں مادۂ قیاس کا حال۔ کیوں کہ مطالب تصدیقیہ کے چند اقسام ہوتے ہیں، بعض بالطبع یقینی ہوتے ہیں اور بعض ظنی، اور یقینیات وظنیات کے بھی متعدد مدارج ہیں۔ پس جس جس قسم کے مطالب ہوسکتے ہیں، ارسطو نے انہی قسموں کے قیاس بیان کئے ہیں۔ کہیں علمی قیاس لکھا ہے تو کہیں ظنی قیاس سے کام لیا ہے۔ کسی جگہ قیاس سے من حیث المطلوب بحث ہے تو کہیں من حیث الانتاج۔

مذکورہ بالا تقسیم کی وجہ سے کتاب منطق میں آٹھ رسالے یا آٹھ ابواب ہوگئے ہیں۔ جن کا اجمال یہ ہے کہ :

(۱) پہلے باب میں اجناس عامّہ کا بیان ہے، جن کے مافوق اور اجناس نہیں ملتیں، ارسطو نے اس باب کا نام کتاب المقولات رکھا ہے۔

(۲) دوسرے باب میں قضائے تصدیقیہ اوران کی قسمیں ہیں۔

(۳) تیسرے میں قیاس اوراس کے منتج ہونے کی بحث ہے۔اوراس باب کا نام قیاس ہے۔

(۴) چوتھی کتاب البرہان ہے،جس میں قیاس جس کانتیجہ یقین ہےاس کی شرطیں مفصل ومکمل طور پر لکھی ہیں اور اسی کتاب میں معرفت وحدود کا بیان ہے۔ کیوں کہ مطلوب کا یقین حدومحدود کی مطابقت کے بغیرممکن نہیں ہے۔اسی لئے متقدمین نے اسی باب یا کتاب کومنطق کی اصلی کتاب سمجھا اوراسی پرخاص توجہ کی تھی ۔

(۵) پانچواں باب جدل کے بیان میں ہے۔جس میں مقابل کا منہ بندکرنے کے اصول وقواعد بتائے گئے ہیں،اورساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ مجادل کے استدلال کا ماخذ کیا ہوتا ہے۔

(۶) چھٹے باب میں سوفسطہ کا تذکرہ ہے۔سوفسطہ وہ قیاس ہے جوخلاف حق کوثابت کرے،اور مناظرکومغالطے میں ڈالنے کے لئے کام میں لایا جائے ۔

(۷) ساتویں باب میں خطابت کی بحث ہے،اورایسےاصول وقواعد بتائے گئے ہیں،جن کے ذریعے خطیب اپنی تقریرکوایسے قیاسات سےلبریز کرسکے کہ جواس کے کہنے پر چلنے کے لئے تیار ہوجائیں۔

(۸) آٹھویں باب میں شعر کا بیان ہے،شعر دراصل وہی قیاس ہےجس سے تمثیل وتشبیہ کا کام لیا جائے۔اوراس تشبیہ وتمثیل کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں کسی خاص چیز کی نفرت یا محبت بھر دی جائے۔یہی آٹھ کتابیں متقدمین کے یہاں منطق کی مانی گئی ہیں۔

ارسطوکے زمانے میں جب منطق کی تہذیب وترتیب ہوچکی توحکمائے یونان نےکلیات خمسہ کے متعلق جومفیدتصورہیں ایک رسالہ اور بڑھا کرنوکتابیں کردیں،یہ ساری کی ساری کتابیں مسلمانوں نے ترجمہ کیں،اورفلاسفۂ اسلام نے ان کی شرحیں لکھیں۔

مسلمانوں میں فارابی،ابن سینااورابن رشدالقرطبی وغیرہ اس کے کامل اور ماہرگزرے ہیں۔ابن سینا نے اپنی کتاب ''الشفاء''میں تمام علوم فلسفہ کومفصل بیان کیا ہے۔

ان بزرگوں کے بعد جب متاخرین کا زمانہ آیا توانہوں نے منطق کے مصطلحات کو بدل ڈالا،اورکلیات خمسہ ہی میں کتاب البرہان سے حدورسم کا بیان لےکرلکھ دیا۔اورمختصرمقولات کا بھی ذکرکردیا۔کیوں

کہ منطق کومقولات سے بالذات کوئی بحث نہیں،اور کتاب العبارت میں عکس کی بحث لے آئے۔ اور پھر قیاس سے نتیجہ تک پہنچنے کے لئے بحث کی،نہ کہ بحسب مادہ،اگرچہ کہیں کہیں مادہ پر بھی نظر ڈالتے ہوئے نکل گئے ہیں۔اسی لئے برہان وجدل وشعروسبط ان سے چھوٹ گئے،اورجس نے کچھ لکھا بھی تو بہت کم،جونہ ہونے کے برابر ہے،حالانکہ منطق میں ان باتوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔پھراپنے اس وضع کئے ہوئے علم کوخواہ مخواہ وسعت دےکراسے ایک فن بنادیا ہے،اور یہ خیال ہی نہ کیا کہ یہ علوم کا آلہ ہے۔

سب سے پہلے یہ طریقہ امام فخرالدین رازی نے اختیارکیا ہے،ان کے بعدافضل الدین خونجی نے۔

اب اتنی ساری طول طویل بحث سے دراصل میرا مدعایہ ہے کہ ہمارادعوی ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہمارے ممدوح حضرت مولانا سیدالامین صاحب رحمہ اللہ علوم عقلیہ کے تمام اقسام یعنی منطق،طبعیات، الہیات اورعلوم التعالیم سب کے ماہر تھے۔مگر یہ بات یقینی ہے کےحضرت مولانا مرحوم علوم عقلیہ کے ان چاروں اقسام میں سے بطورخاص منطق والہیات میں یدطولی رکھتے تھے۔اور جہاں تک دورحاضر میں ہمارے علماء کا سوال ہے،ہمارے علاقے میں اس فن کے حوالے سے مولانا جیسا ماہر شاید گزراہو ۔جوکہ عام طور پر مشہور بھی ہے۔

محترم حضرت مولاناشبیراحمدصاحب مولانامعقولات ومنقولات کے سنگم تھے،کےعنوان سے لکھتے ہیں کہ :

> ''آپ کومعقولات میں شیخ المعقولات مولانا رسول خان صاحب کا صحیح وارث اور عکس کہا جائے تو بے جانہ ہوگا،مولانا خودتحدیث بالنعمۃ کے طور پرفرمایا کرتے تھے کہ سرزمین ارکان میں الحمدللہ تعالیٰ فنون عالیہ کی تمام کتابیں پڑھ کرطے کرنے والا میرا جیسااورکوئی نہیں ہے،میرا یہ دعوی کسی تکبروزور پرمبنی نہیں،بلکہ تحدیث بالنعمۃ پر ہے،چنانچہ مولانا منصب درس وتدریس پر براجمان ہوتے ہی قاضی،حمد اللہ،میبذی،ملاحسن،سلّم العلوم جیسی کتابوں سے موتیاں نکال نکال کرسرزمین ارکان پربکھیرنا شروع کردیا تھا،معقولات کے حوالے سے مولانا سرزمین ارکان میں آفتاب وماہتاب بن کرایسے چمکے کہ ان کے سامنے سارے ستارے ماند

پڑ گئے تھے، الہیات کے بڑے ماہر انسان تھے، خصوصاً علم الباری جل جلالہ کے حوالے سے ایسے ایسے موتیاں بکھیرتے تھے کہ لگتا تھا کہ اللہ تعالی نے آپ کو اسی فن کے لئے پیدا کیا ہے، حضرت سے مذکورہ کتابیں پڑھنے کے لئے سرزمین ارکان کے طول وعرض سے ذی استعداد طلبا آپ کے گرد جمع ہوتے، آپ سے پڑھتے اور آپ سے سیکھے ہوئے علوم اپنے اپنے علاقے میں لے جا کر بکھیرتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ خصوصی طور پر اس باب میں مولانا اللہ تعالی کی قدرت اور وحدانیت کی ایک جیتی جاگتی نشانی ہے، استاد المعقولات حضرت العلامہ قاری محمد الیاس (سابق مدرس جامعہ اسلامیہ پٹیہ) فرمایا کرتے تھے کہ میں جب جامعہ اشرفیہ لاہور میں پڑھتا تھا، اسی دوران مولانا سید الامین صاحب کے امتحانات کے نتائج دیکھے علاوہ ازیں اساتذۂ کرام کی زبانی بڑے بلند الفاظ میں ان کی تعریف سن کر حیران رہ گیا تھا، تب سے میں مولانا کے دیدار کا مشتاق ہو چکا تھا، عرصہ کے میری ان سے ملاقات ہوئی تو ان کو گلے سے لگایا، ان کی پیشانی چوما، اور اللہ تعالی کا شکر یہ ادا کیا کہ بالآخر ان کے دیدار سے مشرف ہونے کا موقع ملا، ہم ان جیسی شخصیت کو معقولات ومنقولات کی سنگم نہ کہیں تو اور کیا کہیں گے؟''۔

علم الکلام اور مولانا کا اس میں درک :

حضرت مولانا سید الامین صاحب علم الحدیث والتفسیر کے ایک جلیل القدر عالم ہونے کی حیثیت سے محدث صاحب کے لقب سے معروف اور مشہور ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی مشہور جو حقیقت پر مبنی ہے کہ حضرت مولانا علم المنطق، فلسفہ اور علم الکلام کے بھی ماہر انسان تھے۔ انہوں نے درس نظامی کی تعلیم دیوبندی مکتب فکر کے مدارس سے حاصل کی، اور زمانۂ طالب علمی سے ان کی شہرت چاردانگ عالم میں ہو چکی تھی، کون نہیں جانتا کہ درس نظامی کے متداول نصاب تعلیم میں قران وحدیث اور فقہ اسلامی واصول کے علاوہ منطق وفلسفہ وعلم الکلام کی درجن سے زیادہ کتابیں داخل تھیں اور اب بھی ہیں، جہاں تک معلوم ہوا کہ وہ ساری کتابیں جو منطق وفلسفہ اور علم الکلام کے حولے سے نصاب میں تھیں،

حضرت نے تقریبا ساری کتابیں پڑھیں اور پڑھائیں، ان کے معاصرین میں درجنوں بڑے بڑے علماء اس علاقے میں تھے، جو بھی معقولات میں خاصی شہرت کے حامل تھے اور جنھوں نے معقولات کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچونا بنایا تھا۔ ان سارے معاصرین کرام میں اس منطق کے حوالے سے آپ کا نام سب سے بلند تھا۔ حضرت مولانا نے معقولات کی اعلی درسی کتابیں جامعہ اشرفیہ لاہور میں پڑھی تھیں، جامعہ اشرفیہ لاہور منطق وفلسفہ کی تدریس کے حوالے سے شہرت کا حامل تو تھا لیکن خیر المدارس ملتان پاکستان سے کسی قدر کم، راقم سطور کو یہ بات حضرت مولانا ابوالحسین صاحب عرب شاہ پاروی کی ایک تحریر سے معلوم ہوئی، قصہ تھا کہ مولانا عرب شاہ پاروی حصول اعلی تعلیم کے سلسلے میں کراچی سے لاہور پہنچے اور انہی پہلے جامعہ اشرفیہ اس لئے پسند نہیں آیا تھا کہ خیر المدارس کی بہ نسبت جامعہ اشرفیہ میں منطق وفلسفہ کی تعلیم وتعلم کم تھا، اس لئے انہوں نے لاہور سے ملتان کا سفر فرمایا اور خیر المدارس میں داخلہ بھی لیا تھا، البتہ بعض وجوہات کی بنیاد پر انہوں نے خیر المدارس چھوڑ کر پھر جامعہ اشرفیہ میں داخلہ لیا تھا، اس سے پتہ چلا ہے کہ ان دونوں دینی مدارس میں سے خیر المدارس کا رتبہ منطق وفلسفہ کے حوالے سے بلند تھا، اللہ معلوم بات کہاں تک صحیح ہے۔

بہر حال مولانا سید الامین نے منطق وفلسفہ کی متداول اعلی درسی کتابیں جامعہ اشرفیہ لاہور میں بڑے بڑے ماہرین فن سے پڑھیں، ایک تو ظاہر کہ ذہین وفطین تھے، دوسری طرف ماہرین فن سے مستفید ہونے کی وجہ سے ان کو ان فنون میں درک اور ملکۂ تام حاصل ہو گیا تھا، اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ درس نظامی میں منطق کی کتنی اور کون کون سی کتابیں شامل تھیں اس کی فہرست درج کر دی جائے :

(۱) المنطق۔

(۲) مرقات۔

(۳) صغری کبری۔

(۴) میزان منطق۔

(۵) ایساغوجی۔

(۶) قال اقول۔

(٧) تہذیب۔

(٨) شرح تہذیب۔

(٩) قطبی۔

(١٠) میر قطبی۔

(١١) ملاحسن۔

(١٢) حمداللہ۔

(١٣) میر زاہد رسالہ۔

(١٤) غلام یحییٰ۔

(١٥) میر زاہد ملا جلال۔

(١٦) قاضی مبارک۔

(١٧) میبذی۔

(١٨) سلم العلوم۔

(١٩) شرح سلم ملا مبین۔

(٢٠) حاشیہ عبدالعلی بر میر زاہد رسالہ۔

ان مذکورہ کتابوں کے علاوہ بھی شاید اور دیگر کتابیں ہوں، جو درس نظامی میں شامل درس کی گئی ہوں، مگر فی الحال مذکورہ بالا کتابیں ہی سامنے آئی ہیں، البتہ ہم نے بھی ان مذکورہ کتابوں سے چند کتابیں پڑھیں، ہم نے منطق کے حوالے سے ایک رسالہ جو پڑھا تھا وہ ''**تیسیر المنطق**'' نام کا تھا، اردو میں شاید ہندو پاک یا بنگلہ دیش کے کسی مؤلف کا ہوگا، منطق کی مبادیات کے اعتبار سے یہ رسالہ مفید اور کارآمد تھا، ادھر ہم علم منطق کے حوالے سے کچھ ضروری باتیں فراہم کر چکے ہیں اور اب جہاں تک علم کلام کا سوال ہے، اس حوالے سے کچھ باتیں عرض کرتے ہیں کہ :

علم کلام دراصل دلائل کے ذریعے سے عقائد ایمانیہ کو ثابت یا جن لوگوں نے اسلاف امت اور اہل سنت کا عقائد کو چھوڑ کر عقائد جدیدہ اختیار کئے، ان کی تردید کرتا ہے، چوں کہ عقائد ایمانیہ میں چھوٹی کا

عقیدہ '' توحید '' ہے اس لئے اس پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

حوادث کے تمام تر اسباب دریافت نہ ہو سکے، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے جو کچھ ہم عادۃ دیکھتے ہیں اسی کو یا اس قبیل کی باتوں کو سمجھ سکتے ہیں، یعنی ہمارے علم و معلومات کا سارا مدار ظاہری اسباب پر ہوتا ہے، یہ ہمیں ہرگز معلوم نہیں ہے کہ اسباب کی تاثیر کی حقیقت کیا ہے اور کیوں کر اثر کرتے ہیں، قرآن کریم میں ارشاد باری ہے کہ

''وما اوتیتم من العلم الا قلیلا''

اسی لئے شریعت نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اسباب کو چھوڑو اور اسباب کے مالک اور موجد کل کی طرف متوجہ ہو، تا کہ توحید بالکل وجوہ نفس میں مرتکز ہو جائے، اگر ظاہری اسباب پر انقطاع اور بھروسہ کیا تو کفر میں مبتلا ہو گے اور اگر اسباب کے دریائے ناپید کنار میں عمر بھر غوطہ لگاتے رہو تب بھی اصل تک نہیں پہنچ سکو گے، تمہارے لئے مناسب یہی ہے کہ اسباب سے آنکھیں بند کر کے توحید مطلق کا اعتقاد رکھو اور کبھی اس وسوسہ میں نہ آؤ کہ فکر انسانی احاطۂ کائنات اور اس کے اسباب پر قادر ہے اور تفصیل وجوہ کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے، یہ دھوکہ ہی دھوکہ ہے، اس سے بچو اور یقین رکھو کہ احاطۂ کائنات بمافیہا عقل انسانی سے ممکن نہیں، کیوں کہ بادی الرائے میں ہر ایک قوت حس انسانی تمام موجودات عالم کو اپنے ہی مدرکات پر منحصر اور تمام سمجھتی ہے حالاں کہ یہ بالکل مختلف ہے، بقول علامہ ابن خلدون بہرا آدمی وجود کو باقی محسوسات اربعہ اور معقولات ہی میں منحصر سمجھتا ہے اور مسموعات کو وجود ہی سے نکال دیتا ہے اسی طرح پیدائشی اندھا مرئیات کو موجود نہیں جانتا صرف اپنے آباو اجداد اور آس پاس کے رہنے والوں کی تقلید میں ان کا اقرار کر لیتا ہے، لیکن بتقاضائے اسے سوائے انکار مرئیات کے کوئی چارہ نہیں ہوتا، ہماری حیات کی بس یہی کیفیت ہے کہ موجود کو صرف اپنی اپنی حسوں میں منحصر اور موقوف جانتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ ہمارے اور ادراک کے علاوہ بھی مدرکات ہوں، کیوں کہ ہمارے اور ادراک حادث و مخلوق ہیں اور مخلوق خدا مخلوق انسانی سے بہت زیادہ ہے، اور موجودات کا دائرہ وسیع تر ہے، اس لئے ضروری ہے کہ جب ہمارا تمہارا ادراک حصر موجودات کا ادعا کرے فوراً تکذیب کر لی جائے اور ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ ہم تم وہی مانیں جو ہمارے اور

تمہارے پاس شارع علیہ السلام سے پہنچا ہے، اس لئے کہ شارع علیہ السلام ہمارا اور تمہارا بڑا خیر خواہ تھے، ان کا علم وادراک بھی ہماری تمہاری عقل وادراک سے بہت ہی بلند اور وسیع تھا۔

عجز وقصور کے اعتراف سے عقل انسانی کو کچھ داغ نہیں لگتا، بلکہ اس سے عقل کی عقل مندی ثابت ہوتی ہے، عقلاء کے نزدیک عقل میزان ہے، عقل بے شک میزان ہے، اسکے احکام اپنی جگہ ٹھیک بھی ہیں، لیکن صرف عقل انسانی ہی توحید وآخرت، حقائق صفات الہیہ، حقیت نبوت جیسے امور کے پتہ لگانے سے عاجز اور درماندہ ہے، اس کی مثال بقول علامہ ابن خلدون بعینہ ایسی ہے کہ:

> ''کوئی کانٹے میں چاندی سونا تلتا ہوا دیکھ کر ارادہ کرے کہ اس میں ایک ہمالہ جیسا پہاڑ تول لے، کیا یہ ممکن ہے؟ ہرگز نہیں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کانٹا غلط تھا یا نارسا ہے، جہاں تک عقل کی رسائی ہے، وہاں تک رائے دیتی ہے، اور جو امور اس کی دسترس سے باہر ہیں، ان میں سراسر مجبور، عاجز درماندہ ہے، کیوں کہ وہ موجودات میں ایک ذرۂ ناچیز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی''۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ عقل کو احکام سماعیہ پر مقدم سمجھتے ہیں وہ سراسر غلطی پر ہیں، یہ ایک امر یقینی ہے کہ اس قسم کے علوم ومعارف سمجھنے میں عقل انسانی عاجز وقاصر ہے، گویا اب توحید لازم ہے، اسباب کے ادراک سے عاجز ہونے کی وجہ سے تفویض کل الی اللہ کے حوالے سے بعض صدیقین اور صاحب معرفت وحقیقت یہی کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

''العجز عن الادراک ادراک''

پھر یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس توحید سے جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا محض توحید ایمانی ہے، یعنی اقرار باللسان وتصدیق بالجنان ہی مراد ہے، کیوں کہ تصدیق حکمی تو محض نفسانی اقرار ہے، جو اقرار زبانی سے قدرے اعلی درجہ کا ہے، دراصل یہاں توحید سے مراد کمال توحید ہے، یعنی صفت توحید سے نفس کا متکیف ہوجانا۔ جس طرح اعمال وعبادات کا مقصود یہ ہے کہ طاعت وانقیاد ربانی کا ملکہ حاصل ہوجائے۔ گویا صرف علم توحید سے کام چل نہیں سکتا، جب تک توحید نفس میں حال کا درجہ پیدا نہ کرے۔ یاد رہے کہ ایمان جو تکالیف کا اصل اصول ہے، متعدد درجے رکھتا ہے، جن میں سے ادنی تصدیق

بالروح واقرار باللسان ہے۔ اس کی اعلی کیفیت وہ ہے جو اس اعتقاد قلبی اور پابندی اعمال سے ہوتا ہے، یہاں تک کہ تمام جوارح کے اعمال وافعال بھی اسی تصدیق ایمانی کی وجہ سے طاعت وعبادت کے درجہ پر پہنچ جاتے ہیں، اس مرتبہ کے حصول کے بعد مؤمن نہ صغیرہ کا مرتکب ہوسکتا ہے اور نہ کبیرہ کا، کیوں کہ نفسانی ملکہ اپنی مضبوطی کی وجہ سے اس کو منحرف ہی نہیں ہونے دیتا۔

شارع علیہ السلام نے ایمان کی بڑی اچھی تعریف کی ہے، جب آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایمان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: **''ان تؤمن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ''** اور یہی عقائد ایمانیہ ہیں جن کا کتب عقائد میں ذکر ہوتا ہے۔

شارع علیہ السلام نے خالق کل پر ایمان لانے کا حکم دیا جو تمام افعال کا خالق ہے اور ہمیں یہ بھی سمجھایا کہ اسی ایمان سے تم کو نجات ملے گی۔ انسان کی عقل خالق ومعبود کی کنہ وحقیقت کی دریافت کرنے میں عاجز ہے اور ساتھ ساتھ خالق ومعبود کا علم فی الجملہ ضروری بھی ہے، تو ہمیں صفات ''تنزیہ فی الذات'' کی تعلیم دی گئی ہے۔ تاکہ اللہ مشابہ مخلوق نہ مان لیا جائے۔ پہلے صفات نقص سے اسے منزہ بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد توحید ذاتی کا سبق پڑھایا گیا ہے، اس کے بعد علم وقدرت سے آگاہی بخشی گئی۔ اس کے ارادے سے مطلع کیا گیا، بعثت رسول کی ضرورت کا یقین دلایا گیا، جنت کی راحت وآرامیت کی امید دلائی گئی، عذاب جہنم سے ڈرایا گیا، یہ ساری باتیں عقائد میں اصل اصول ہیں۔ اور علم العقائد یہ ہے کہ جس میں یہ اور ان جیسی باتیں دلائل عقلی سے بیان کی جاتی ہیں، ان امور کے متعلق کتاب وسنت میں بھی بہت سی دلیلیں موجود ہیں۔ علمائے راسخ فی العلم نے ان باتوں کو سمجھا، ائمہ نے ان کی تحقیق تو کی لیکن ایک مدت کے بعد ان عقائد کی تفصیلات کے حوالے سے علمائے اسلام کی آراء مختلف ہوگئیں۔

دراصل ان کے اختلافات کی اصل وجہ آیات متشابہات تھیں، انہی اختلافات کی وجہ سے مناظرہ ومجادلہ کی نوبت آئی۔ بالآخر بہ نسبت نقل کے استدلال عقلی پر زور دیا گیا، اس طریقے سے علم الکلام کی بنیاد پڑی تھی۔ قرآن کریم کی اکثر آیات میں اللہ تعالی کی تنزیہ مطلق کا ذکر موجود ہے، جو ظاہر الدلالۃ ہیں، تاویل کی محتاج نہیں ہیں، شارع علیہ السلام کی احادیث اور صحابہ کرام وتابعین کے اقوال سے تنزیہ مطلق ہی کی تائید ہوتی ہے، لیکن قرآن مجید کی بعض آیتیں ایسی ہیں جن سے کہیں مشابہت ذاتی

اور کہیں مشابہت صفاتی کا مفہوم ہوتا ہے، صحابۂ کرام واسلاف تو تشبہ سے پاک کا ہی قائل اور مثال وتشبہ کو محال کہتے رہے، اور جن آیات میں تشبہ کا ڈر تھا ان کی نسبت صرف یہی کہتے تھے کہ یہ آیتیں کلام الٰہی ہیں، ان پر ہمارا ایمان ہے، نہ کبھی معنی سے تعرض کیا نہ تاویل کے پیچھے پڑے، اور اکثر یہی کہتے رہے کہ آیات قرآنی جیسی نازل ہوئیں اسی طرح پڑھتے جاؤ۔ تاویل وتفسیر کروگے تو بلا میں مبتلا ہوجاؤگے۔

علامہ ابن خلدون کے مطابق اسی زمانہ میں بھی کچھ لوگ آیات متشابہات کی وجہ سے تشبہ کے قائل تھے۔ اور ظواہر آیات کو دیکھ کر اللہ جل مجدہ کے لئے ہاتھ اور چہرہ ثابت کرتے رہے تھے۔ اس لئے یہ حضرات تجسم میں مبتلا ہوگئے۔ اور آیات تنزیہ کی سراسر مخالف جو قرآن کریم میں کثرت سے موجود ہیں اور واضح الدلالہ ہیں۔ ان سے متعارض ہوگئے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ جسم کے لوازمات کا مان لینا نقض وافتقار اور آیات تنزیہ کی تغلیب کا مقتضی ہے۔ آیات متشابہات کے پیچھے پڑنے والے یہاں تک کہہ دیئے کہ اللہ تعالی جسم ہے، لیکن عام اجسام کی مانند نہیں۔ علامۂ مذکور کے نزدیک ان کا یہ جواب دراصل شافی جواب نہیں۔ کیوں کہ نفی واثبات یہاں ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں۔ بالآخر اس جماعت نے مجبور ہوکر ''لیس کمثلہ شئی'' کا مسلک اختیار کرلیا، تا کہ فی الجملہ آیات متشابہات صادق آسکیں۔

ادھر دوسرا ایک فریق اٹھا کہ جو تشبہ فی الصفات مثلاً سمت، استواء، نزول حروف وصوت کے اثبات کے درپے ہوا۔ بالآخر اسے بھی تجسیم کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے اس نے بھی پہلے فریق کی طرح یوں جواب دیا کہ اللہ تعالی کی آواز ہے، مگر تمام آوازوں کی مانند نہیں ہے۔ علامہ ابن خلدون کے نزدیک ان کا یہ جواب بھی پہلے والوں کے جواب کی طرح شافی وکافی نہیں ہے۔

جب مسلمانوں میں تصنیفات کی کثرت، علم کی تدوین اور امور علم کی چھان بین ہونے لگی تو متکلمین اسلام نے تنزیہ کے متعلق کتابیں لکھیں، اس سلسلہ میں فرقۂ معتزلہ نے آیات تشبہ سے تنزیہ کو یہاں تک تعمیم دی کہ علم وقدرت، ارادت وحیات جیسی صفات کی بھی نفی کرنے لگے۔ اس دلیل کے ساتھ کہ ان صفات کو زائد ذات ماننے سے تعدد واجب لازم آتا ہے۔ حالاں کہ ان کا یہ خیال بالکل باطل ہے، کیوں کہ صفات نہ عین ہے نہ غیر۔ اسی طرح ان لوگوں نے سمع وبصر سے بھی انکار کردیا۔ تا کہ جسمانیت واجب ولازم نہ آسکے۔ یہ بھی ان کا نرا وہم ہی وہم ہے۔ کیوں کہ سمع وبصر سے مراد ادراک

مسموع ومبصر ہے۔ ان لوگوں نے اپنی صفات شش گانہ کے ساتھ کلام کی بھی نفی کی، اور کلام نفسی کی حقیقت وماہیت کو نہ سمجھ سکے۔ ان لوگوں نے قرآن کے مخلوق ہونے کا دعوی کیا، اور مذہب اسلاف سے دور جاپڑے۔ فرقۂ معتزلہ کی ان بدعتوں کا مسلمانوں میں بہت بڑا اثر پڑا تھا۔ عباسیہ میں سے بہت سے خلفاء بھی ان کے ہم خیال ہوگئے تھے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو مجبور کیا تھا کہ معتزلہ کے ان عقائد کو تسلیم کریں، مگر اہل السنت والجماعت کے ائمہ نے اس عقیدہ سے بالکل انکار کردیا تھا۔ اور بہت سارے قتل ہوئے۔ ان حالات کے پیش نظر علمائے اہل السنت والجماعت کو ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ دلائل عقلیہ سے ان عقائد باطلہ کی تردید کریں اور باطل عقائد ونظریات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک لیں۔

اللہ تعالی امام المتکلمین ابوالحسن علی بن اسماعیل معروف بہ امام اشعری کے درجات بلند فرمائیں، امام صاحب ۲۷۰ھ میں عالم اسلام کا علمی وفکری مرکز بصرہ میں پیدا ہوئے۔ اور بغداد میں ۳۳۰ھ میں وفات پائے۔ ابتدا میں ان کی تعلیم عبدالوہاب جبائی معتزلی سے ہوئی۔ اعتزال کے خم خانے میں ڈوبے ہوئے تھے، مگر اللہ تعالی نے ان کو ہدایت نصیب فرمائی۔ مذہب اعتزال سے سرعام توبہ کی۔ بغداد میں حدیث وفقہ اسلامی کی تکمیل کی، اور مذہب اعتزال کے رد میں بہت ساری کتابیں لکھیں، امام صاحب سے ہزاروں نے استفادہ کیا۔ جن میں ابوصعاد صعلوکی، ابوبکر قفال، ابوزید مروزی، زاہر بن احمد، حافظ ابوبکر جرجانی، شیخ ابوبکر طبری، ابوعبداللہ طائی، ابوالحسن باہلی اور بندر بن حسن صوفی مشہور ومعروف ہیں۔ لیکن دنیائے علم کلام میں حضرت امام کے شاگردوں کے شاگرد جن میں ابوبکر باقلانی، ابواسحاق اسفرائنی، ابوبکر بن فوزک، پھر ان کے شاگرد امام الحرمین اور بھی مشہور ہوئے۔ انہوں نے اشعری علم کلام کی عظمت واقتدار کو عالم میں مضبوط کردیا۔ جن کی وجہ سے امام اشعری کی تصانیف اطراف عالم میں پھیل گئیں۔

امام اشعری نے تنزیہ کے متعلق اسلاف کا درمیانہ مسلک اختیار کیا۔ تشبیہ کی نفی کی اور صفات مغلوبہ کو ثابت کیا۔ انہوں نے عقل ونقل سے معتزلہ کے خود ایجاد کردہ تمام عقائد کو توڑ ڈالا۔ یہاں تک کہ فن عقائد بہشت ودوزخ اور ثواب وعتاب وغیرہ کی مباحث سے مکمل ہوگیا تھا۔ چوں کہ اس زمانہ میں

فرقۂ امامیہ نے بھی اپنا عقائد لکھ کر مسئلۂ امامت کو داخل عقائد کرلیا تھا۔ اور یہاں تک غلو کیا کہ نبی کا فرض ہے امام مقرر کرجائے۔ اس لئے امام ابوالحسن اشعری نے امامت کیمتعلق بھی مفصل بحث کی اور ان امامیوں کے عقائد کی تردید کردی تھی۔ اوران مباحث کے مجموعہ کوعلم الکلام کا نام رکھا گیا تھا۔

امام اشعری کا مسلک عالم اسلام میں بڑا مقبول ہوا، ہر کجا اس کا چرچا ہونے لگا تھا۔ امام صاحب کے شاگرد مجاہد نے بھی ان کے مسلک کوخوبخو اختیار کیا، جن سے قاضی ابوبکر باقلانی نے استفادہ کیا۔ الغرض یہ کہ تھوڑے ہی دنوں میں علم کلام خالص ہوکر علوم دین اور نظریات میں ممتاز درجہ میں پہنچ گیا تھا۔

ادھر امام ابوالحسن اشعری کے قریب قریب زمانہ میں عالم اسلام کے ایک دوسرے سرے میں ایک اور عظیم عالم دین ومتکلم اسلام پیدا ہوئے۔ جن کا نام امام ابوالمنصور ماتریدی تھا۔ امام صاحب کی وفات ۲۳۳ھ میں ہوئی۔ انہوں نے علم الکلام اور عقائد اسلام کی طرف خاص توجہ دی تھی۔ آپ بڑے متوازن اور معتدل دماغ کے انسان تھے۔ حنفی المسلک تھے، جبکہ امام اشعری کا مسلک شافعی تھا۔

یہاں ایک بات جو قابل ذکر ہے کہ اب حنفیوں میں سے اکثریت نے امام ماتریدی کے علم کلام سے لو نہیں لگاتے، جبکہ کسی زمانے میں ایک حنفی کو اشعری ہونے پر تعجب کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ البتہ ماتریدی علم کلام کا اشعری علم کلام کے مقابلے میں کم شہرت کی وجہ یہ ہے کہ علمائے احناف نے شوافع کے مقابلے میں فن کلام پر بہت کم کتابیں لکھیں۔ یوں فن کلام میں معرکۃ الآراء تصانیف شوافع کی ہیں۔

امام ماتریدی کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ معتزلہ سے برسرپیکار رہنے کی وجہ سے اشعری علم کلام میں جو بعض نامناسب اور انتہا پسندانہ باتیں داخل ہوگئی تھیں اور اشعریوں نے جن کو مزید آگے پڑھایا تھا، امام ابومنصور نے حشو وزائد اور ایسے التزامات جو معتزلہ کے ضد میں اشعری علم کلام کا جزو بن گیا تھا اور ان کا ثابت کرنا اور بنا ہنا مشکل تھا علم کلام سے خارج کر کے اہل سنت والجماعت کو مزید تنقیح وتہذیب کی اوراس کو زیادہ سے زیادہ معتدل اور متوازن بنا کے پیش کردیا تھا۔ امام ماتریدی نے اشعری علم الکلام سے جو اختلافات کئے ان کی تعداد بعض علماء نے پچاس تک بتائی ہے۔ امام ماتریدی بڑے جلیل القدر مصنف تھے، معتزلہ، روافض اور قرامطہ کی تردید میں ان کی بہت بڑی فاضلانہ تصانیف ہیں۔ امام موصوف کی فاضلانہ کتاب ''تاویلات القرآن'' اپنے موضوع پر بلند مرتبہ کی تصنیف ہے۔

جس سے ان کی غیر معمولی اور خداداد صلاحیت کا پتہ لگتا ہے۔ حضرت مولانا علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ نے اشاعرہ کے عقائد کا خلاصہ یوں تحریر فرمایا ہے۔

مولانا کی تدریسی خدمات کا ایک گوشوارہ

مقامات تدریس وتربیت	از	تا	سال
مدرسہ عالیہ شقدارہ پارہ	۱۹۵۸ء	۱۹۶۵ء	آٹھ سال
جامعہ محمدیہ پرامپرد میں پہلی مرتبہ	۱۹۶۶ء	۱۹۷۴ء	نو سال
جامعہ محمدیہ پرامپرد میں دوسری مرتبہ	۱۹۷۶ء	۱۹۸۷ء	بارہ سال
جامعہ توحیدیہ منگنمامہ میں پہلی مرتبہ	۱۹۸۹ء	۱۹۹۰ء	دو سال
جامعہ محمدیہ پرامپرد میں تیسری مرتبہ	۱۹۹۱ء	۱۹۹۲ء	دو سال
جامعہ توحیدیہ منگنمامہ میں دوسری مرتبہ	۱۹۹۳ء	۱۹۹۶ء	چار سال
جامعہ حقانیہ نکھورہ میں	۱۹۹۷ء	۱۹۹۹ء	تین سال
جامعہ محمدیہ پرامپرد میں چوتھی مرتبہ	۲۰۰۰ء	۲۰۰۱ء	دو سال
جامعہ توحیدیہ منگنمامہ میں تیسری مرتبہ	۲۰۰۲ء	۲۰۰۸ء	سات سال

آپ کے بعض ارشد اور نامور تلامذہ :

سرزمین ارکان اور برما میں آپ کے بے شمار تلامذہ ہیں، جنہوں نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے، ان میں بڑے بڑے علماء وفضلاء بھی ہیں اور بعض اہل تالیف وتصنیف بھی، ان میں سے اصحاب درس وتدریس بھی ہیں اور مدارس کے منتظم اور بانی بھی، آپ کے تلامذے میں دعاۃ ومرشدین کا کیا شمار، اورتو اور قومی سطح پر تحریکوں کو چلانے والے بھی دیکھے گئے ہیں، ان میں سے ایسے تلامذہ بھی ہیں جن سے ہزاروں نے علم دین حاصل کیا، ان میں سے بعض ایسے ممتاز ومستعد علماء بھی ہیں جن کی اصلاحی کوشش اور تبلیغ سے بے شمار افراد کو یقین کی دولت حاصل ہوئی، الغرض آپ کے تلامذہ اور حلقہ

بگوشوں سے علم وعمل کی ایسی روشنی پھیلی کہ جس کا سلسلہ چلتا رہا اور انشاء اللہ چلتا رہے گا۔

یوں تو ظاہر ہے کہ مولانا کے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تلامذہ ہیں، ماشاء اللہ راقم سطور جہاں تک جانتا ہے، حضرت کا ہر ایک تلمیذ اپنے اپنے علاقے کے نامور علماء میں سے ہے، ہر ایک علم وعمل، درس وتدریس، تعلیم وتبلیغ اور رشد ہدایت کا مینارہ ہے، ہر ایک فیوض وبرکات کا دریا بھی ہے، مگر سر دست چند ایسے تلامذہ کا ایک گوشورہ حاضر خدمت ہے جن کی مشیخیت پورے ارکان میں مسلم ہے :

(۱) حضرت العلامہ مولانا دین محمد فرندنگی رحمۃ اللہ علیہ ۔

(۲) حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب مرنگلوی، شیخ الحدیث مدرسہ مرنگلوا ۔

(۳) حضرت مولانا حافظ عتیق الرحمن صاحب ندوی کوانچی بنگی، شیخ الحدیث مدرسہ اسلامیہ نکھورہ، منگڈو۔

(۴) حضرت مولانا حسین احمد صاحب کوار بیلی، محدث جامعہ توحیدیہ منگنما۔

(۵) حضرت مولانا اکبر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ، محدث مدرسہ نکھورہ۔

(۶) حضرت مولانا حسین علی صاحب دابری چونگی، شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ۔

(۷) حضرت مولانا میر احمد صاحب علی چونگی، شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ۔

(۸) حضرت مولانا حسین صاحب چالی پرانگی مرحوم، شیخ الحدیث جامعہ محمدیہ پرامپورو۔

(۹) حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم، محدث جامعہ محمدیہ پرامپورو۔

(۱۰) حضرت مولانا سراج الدین صاحب وابکی، محدث جامعہ توحیدیہ منگنما۔

(۱۱) حضرت مولانا مفتی محمد انس صاحب عرب شاہ پاروی، محدث جامعہ عالیہ شقدر پارہ۔

(۱۲) حضرت مولانا عارف اللہ صاحب زوفرانگی، شیخ الحدیث مدرسہ زوفرانگ۔

(۱۳) حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب سیندی فرانگی، محدث جامعہ سندی فرانگ۔

(۱۴) حضرت مولانا مفتی امین شریف صاحب اکیابی، سکرٹیری جمعیۃ علماء اکیاب۔شیخ الحدیث جامعہ وارلس پارہ اکیاب۔

(۱۵) حضرت مولانا شیخ الحدیث عبدالحکیم صاحب کوار بیلی۔

(۱۶) حضرت مولانا عبدالمنان صاحب امیر جماعت تبلیغ ومحدث مدرسہ اودنگ۔

(۱۷) حضرت مولانا سلیم اللہ صاحب مرنگلوی، حالیہ صدر روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن مقیم حال جدہ، سعودی عرب۔

(۱۸) حضرت مولانا رشید احمد صاحب مرنگلوی، محدث مدرسہ مرنگلوا،

(۱۹) حضرت مولانا احمد اللہ صاحب مانگالوی، مہتمم مدرسہ منگالہ۔

(۲۰) حضرت مولانا عبدالحمید صاحب تنگ بازاری، محدث مدرسہ عملہ پارہ اکیاب۔

(۲۱) حضرت مولانا ابوسعید صاحب نارو بیلی، محدث جامعہ توحیدیہ منگنما۔

(۲۲) حضرت مولانا حافظ احمد صاحب بالوکھالوی، محدث توحیدیہ منگنما۔

(۲۳) حضرت مولانا بشیر احمد صاحب منگنماوی، محدث جامعہ توحیدیہ منگنما۔

(۲۴) حضرت مولانا ابوالبشر صاحب واپرانگی، محدث جامعہ توحیدیہ منگنما۔

(۲۵) حضرت مولانا شمس الاسلام صاحب صدر جمعیۃ العلماء منگڈو، مہتمم جامعہ شجاع ڈیا، منگڈو۔

(۲۶) حضرت مولانا حمید حسین صاحب کلیچہ بانگاوی، محدث مدرسہ شجاع ڈیا۔

(۲۷) حضرت مولانا صوفی محمد الیاس صاحب خرانگ خالوی، بوسیدنگی، خلیفہ مجاز شیخ طریقت حضرت العلامہ محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ علیہ۔

(۲۸) حضرت مولانا عبدالمنان صاحب مرنگلوی، محدث جامعہ مرنگلوا۔

(۲۹) حضرت مولانا عبدالعلی صاحب قمریہ بیلی مرحوم، ناظم جامعہ علی ٹانجو۔

(۳۰) حضرت مولانا ابوصدیق صاحب بلیاپاوری، مہتمم المعہد الاسلامی عرب شاہ پارا۔

(۳۱) حضرت مولانا سلطان محمود صاحب بڑاشقدار پاروی، شیخ الحدیث مدرسہ گوجربیل۔

(۳۲) حضرت مولانا بدیع العالم صاحب رانگابالوی، شیخ الحدیث جامعہ بوسیدنگ۔

(۳۳) حضرت مولانا محمد جمال صاحب ڈابری چونگی، شیخ الحدیث جامعہ بوسیدنگ۔

(۳۴) حضرت مولانا عبدالخالق صاحب، مدرس اعلی مدرسہ چوکپرو۔

(۳۵) حضرت مولانا نورالاسلام صاحب، مدرس اعلی مدرسہ چوکپرو۔

(۳۶) حضرت مولانا عبدالمالک صاحب مدرس اعلیٰ گوالیہ ڈیل، اکیاب۔

(۳۷) حضرت مولانا محمد الیاس صاحب بارائنگار ڈیلی، محدث اعلیٰ۔

(۳۸) حضرت مولانا صاحب زادہ حافظ نور محمد صاحب، محدث مدرسہ توحیدیہ منگنما۔

(۳۹) حضرت مولانا نورالاسلام صاحب معروف بہ ارکانی حضور ۔

(۴۰) حضرت مولانا کبیر احمد صاحب، شیخ الحدیث مدرسہ کیانگ بنگ ۔

(۴۱) حضرت مولانا جمال احمد صاحب نائیسادنگی، شیخ الحدیث مدرسہ کومیر خالی ۔

(۴۲) حضرت مولانا عبدالمنان صاحب گودام پاروی، محدث مدرسہ انوارہ ۔

(۴۳) حضرت مولانا عبدالرشید صاحب کواربیلی، محدث المعہد الاسلامی عرب شاہ پارا۔

(۴۴) حضرت مولانا شبیر احمد صاحب داماد گرامی، حضرت مولانا سید الامین رحمۃ اللہ علیہ۔

داڑھی کے خلاف فتنہ اور مولانا کا کردار :

روہنگیا مسلمانوں میں الحمدللہ تعالی عمومی طور پر شعار اسلام کا بہت ہی احترام ہے، قرب و جوار کے ملکوں اور دنیا کے خطوں کے مسلمانوں میں سے بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو داڑھی جیسے شعار اسلامی سے نفرت کرتے ہیں اور داڑھی رکھنے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور اولاد میں سے کوئی داڑھی رکھنا چاہے تو اسے روکتے ہیں، بسا اوقات طعنے دیتے ہیں، اور تو اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو شادی کے لئے داڑھی صاف ہونے کی شرط تک لگاتے ہیں، مگر روہنگیا معاشرے میں ایسے بد طینت لوگ عمومی طور پر نہیں دیکھے گئے، مگر ان مسلمانوں میں بعض شاذ و نادر ایسے لوگ بھی ہیں جو داڑھی جیسے شعار اسلامی سے نفرت کرتے ہیں، میرے ناقص خیال میں پچھلے زمانے میں ایسے لوگ اس معاشرہ میں بالکل نہیں تھے، ۱۹۶۲ء کے بعد ملک پر کمیونزم اور سوشلسٹ جیسے اسلام دشمن نظریات کا دور چلا تو روہنگیا مسلمانوں میں اس نظریات سے متاثر ہو کر یا اسلام اور مسلمانوں کے دین اور شعار دین کے خلاف کی جانے والی سازشوں کے زیر دام ہو کر کچھ بد طینت نام نہاد مسلمان اس معاشرے میں بھی پیدا ہو گئے تھے، جن کا کام بھی دشمنوں کی طرح اسلام اور شعار دین سے مذاق اڑانا تھا۔ ورنہ روہنگیا مسلمانوں کے اہل علم و دانش اور ان مسلمانوں کے معاشرہ کو جاننے والوں کو یہ بات سمجھنے میں

تھوڑی دقت محسوس نہیں ہوگی کہ روہنگیا مسلمان دیگر شعار دین کو عموماً اور داڑھی کو خصوصاً بڑے احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان مسلمانوں کے معمر اور عمر ڈھلے حضرات کے چہرۂ زیبا میں علی العموم داڑھی ہی داڑھی نظر آئے گی۔

سرزمین ارکان میں گئی صدی کے آخری عشروں میں حکومت برمانے داڑھی اور داڑھی رکھنے والے مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑا فتنہ کھڑا کر دیا تھا، بہت سارے جید اور قابل قدر علماء اس فتنے کی لپیٹ میں آگئے یا لائے گئے تھے، ناظرین کرام کو یاد ہوگی کہ اس فتنے نے کتنے علمائے عظام کی زندگیاں کھالی تھیں، کتنوں کو اپنے وطن عزیز کے سایۂ عاطفت سے ہاتھ دھونا پڑا تھا،

حضرت مولانا مفتی محمد سلطان ریدویؒ بانی جامعہ اسلامیہ دارالعلوم میاں جان پور کو عرصۂ دراز تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑا تھا، حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب مرحوم (داماد حضرت العلامۃ مولانا میر احمد صاحب) جیسے نامور علماء کرام کی داڑھیاں منڈوا دی گئی تھیں، یہ تو تھیں یہاں دین اسلام اور شعار دین اسلامی کے خلاف مسلسل اور منصوبہ بندی کے ساتھ ظالم حکومت و حکمران کی سازشیں، رہا کہ جس طرح عرض کی گئی تھی کہ ان مسلمانوں کے معاشرے میں بعض شیطانی فطرت کے نام نہاد مسلمان بھی ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ جنہوں نے برملا داڑھی جیسے اسلامی شعار سے مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ یوں ہمارے ممدوح حضرت شیخ الحدیث مولانا سید الامین صاحبؒ کو حکومت اور حکمرانوں کے ساتھ ان نام نہاد مسلمان بد طینتوں سے ڈھٹ کر مقابلہ کرنا پڑا تھا، جہاں تک معلوم ہوا کہ حضرت نے اپنے دیگر قابل قدر معاصرین اور علمائے کرام کی طرح رخصت نہیں بلکہ عزیمت پر عمل کیا تھا، کہ خود فتنہ پردازوں سے ایسا مقابلہ کیا، کہ خود فتنہ پردازوں کو حضرت کے سامنے ہار ماننے پر مجبور ہونا پڑا، انہوں نے علمی، فکری، ثقافتی اور سیاسی غرض جتنے بھی ہو سکے بڑے تندھی سے اس فتنے کا مقابلہ کیا، اس حوالے سے حضرت کا ایک مکالمہ جو انہوں نے ایک فتنہ پرداز سے کیا تھا، مولانا شبیر احمد صاحب کی تحریر سے ملاحظہ کیجئے :

فتنہ پرداز : مولانا! داڑھی رکھنا کیسا ہے؟

حضرت مولانا : شریعت اسلامی کے مطابق واجب ہے۔

فتنہ پرداز : داڑھی منڈوانا کیسا ہے؟

حضرت مولانا : حرام ہی حرام ہے۔

فتنہ پرداز : چہرہ میں جنگل کا اگانا یہ ثقافت وتہذیب ہے؟

حضرت مولانا : حضرت مولانا نے اس فتنہ پرداز سے الٹا سوال کرتے ہوئے بتایا کہ داڑھی خواتین کے چہرے سے نکلتی ہے یا مردوں کے چہرہ ہے سے؟

فتنہ پرداز : مردوں کے چہرے سے داڑھی نکلتی ہے۔

حضرت مولانا : عورتوں کے چہرے سے داڑھی کیوں نہیں نکلتی ہے ؟ جبکہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے چہروں میں چربی زیادہ ہوتی ہے؟

فتنہ پرداز : یہ قدرت کا نظام ہے،

اب مولانا نے ایک لمبی تقریر کردی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر داڑھی مردوں کے چہروں میں سے نکلنا قدرت کا نظام ہے تو تم لوگ قدرت کے نظام کو کیوں توڑنا چاہتے ہو؟ پورے انسانی بدن میں ریش اور بال نکلنے کے حوالے سے عورت اور مرد برابر ہے، الا یہ کہ مردوں کے چہرے سے داڑھیاں نکلتی ہیں اور عورتوں کے چہروں سے نہیں نکلتی، تو قدرت کے اس نظام کو توڑنا اور پامال کرنا یہ کیسی عقلمندی ہے؟ حضرت مولانا نے عقل ونقل کے سہارے پر یہ تقریر کردی تو وہ فتنہ پرداز بالکل لاجواب ہوگیا، اور حاضرین میں سے جتنے لوگ تھے، حضرت کے اس عاقلانہ اور دانش مندانہ جواب پر حیران اور ششدر رہ گئے تھے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب اطال اللہ تعالی بقاؤہ حضرت مولانا سید الأمین صاحبؒ کے داڑھی والے فتنے کے سدباب کے حوالے سے رقم طراز ہیں :

> ’’حضرت مولانا نے داڑھی کے خلاف کی جانی والی سازش اور فتنے کا ڈھٹ کر مقابلہ کیا، مسلمانوں کی عام دینی محفلوں، مساجد و مدارس کے جلسوں میں کی جانے والی تقریروں میں داڑھی کی شرعی حیثیت کے حوالے سے طول طویل تقریریں کی تھیں، علاوہ ازیں درس تدریس میں بڑے عالمانہ انداز میں اس مسئلہ پر طول

> طویل بحثیں کی تھیں، متعلقین، شاگردوں اور علماء کرام کو داڑھی کے خلاف کی جانے والی سازش کے خلاف مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرلیا تھا‘‘۔

اس کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی کے متعلق کچھ چیزیں یہاں لکھ دوں، تاکہ ناظرین کرام کو معلوم ہوجائے کہ داڑھی کی شرعی حیثیت سے کیا ہے: اور ان سطور سے یہ بھی اندازہ ہوجائے گا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کی طرح دیگر علماء کرام نے اس داڑھی کے خلاف کی جانے والی سازش اور فتنے پردازوں کے خلاف جان وجگر کو ہتھیلی پر رکھ کر اتنا بڑا مقابلہ بلکہ جہاد کیوں کیا تھا۔

فرقہ مہیش بھنڈاری اور مولانا کا کردار:

مالی چاٹگام کا معروف علاقہ ناظر ہاٹ میں ایک فرقہ پایا جاتا ہے، جسے مہیش بھنڈاری فرقہ کہا جاتا ہے، مہیش بھنڈار نامی اس گاؤں میں اس فرقہ کا مرکز ہے، جو ایک حیثیت سے مرجع عام ہے، یہاں ایک مزار پایا جاتا ہے، جو اس فرقہ کے نزدیک روضہ شریف ہے، اس مزار میں جو مدفون ہیں ان کا نام مولانا احمد اللہ مہیش بھنڈاری ہے۔

ولانا موصوف اس فرقہ کا بانی ہیں، کہا جاتا ہے وہ ایک جید عالم تھے، اس فرقہ کے لوگ انہی سادات میں بھی بتاتے ہیں، انہوں نے اس فرقہ کی بنیاد ڈالی، سرزمین بنگال میں اس فرقے کے لوگوں کی کوئی کمی نہیں، سالانہ عرس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بنگال اور آس پاس کے علاقوں میں کتنے مہیش بھنڈاری جیتے ہیں۔تصوف کے نام پر اس فرقے کے لوگوں میں خاصی واہیات، بدعات اور شرکیات پائی جاتی ہیں، مولانا احمد رضا خان بریلوی برصغیر میں گویا ان کے امام ہیں۔ البتہ یہ سچ ہے کہ اس فرقہ نے مولانا احمد رضا خان بریلوی کا اتباع بھی نہیں کیا، بلکہ ایسے ایسے معاملے ان سے دیکھے گئے کہ اگر مولانا احمد رضا خان ان کو اس حال میں دیکھتے تو علی الاعلان کہہ دیتے کہ خاشا وکلا یہ میرے متبعین میں سے نہیں ہیں، میں ان سے بری ہوں اور وہ مجھ سے بری ہیں۔

ان کی طبیعت میں تصوف کے نام پر نام نہاد عشق ومحبت کا غلبہ ہوتا ہے، محبت باطنی کا حال تو بہر حال خدا معلوم۔ البتہ ظاہری محبت اور عشق ان سے بہت زیادہ پایا جاتا ہے، اپنوں سے

بہت محبت کرتے اور غیروں کے ساتھ اکثر وبیشتر جنگ جدال، مباحثہ اور جھگڑے کے بجائے پہلوتہی سے کام لیتے ہیں ۔

ان میں بعض علماء بھی پائے جاتے ہیں۔ نہ جانے وہ کیسے عالم ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے قبروں کے سجدے ہوتے، خانقاہ کے گدی نشینوں کو سجدۂ تحیہ وتعظیمیہ کے نام پر سجدے کرتے، لوگ نشے سے چور مختلف قسم کی غیر شرعی، غیر اخلاقی اور نازیبا حرکتیں کرتے، عبادت کے نام پر ناچتے، گاتے، اچھلتے کودتے ہیں اور یہ عالم نما لوگ سماع اور مزامیر کو حلال قرار دیتے ہوئے ان کو ایسے غیر شرعی امور کے لئے نہ صرف ابھارتے بلکہ خود ان کاموں میں شریک ہوتے ہیں۔

اس فرقے کے لوگوں کو جہاں تک مشاہدہ کیا گیا کہ یوں تو وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن امور دینیہ سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، صوم وصلاۃ کی پابندی نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے گن گاتے، مگر آپؐ کی سنت کا پاس ولحاظ نہیں ہوتا، طریقت وتصوف کے نام پر ایسی ایسی بدعات ایجاد کیں کہ انہیں دیکھ کر بعض بدعتی بھی شرما جاتا ہے، غرض بدعات، خرافات، واہیات اور نواہیات اس فرقے کا گویا دین ہوگئی ہیں، پھر جہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقے کے اولین نے ہندو جوگیوں سے متاثر ہوکر تصوف کے اندر ایسی ایسی چیزیں داخل کرلیں، جن کا دین اسلام کے تزکیہ و احسان سے دور کا بھی رشتہ نہیں۔ مگر یہ لوگ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ یہی اسلام کی روح اور دین کا نچوڑ ہے۔

ہمارے زمانے میں شاید اب بھی ہوں کہ سرزمین ارکان میں اس نام نہاد تصوف کے دم بھرنے والے کچھ لوگ پائے جاتے ہیں، ہم نے بذات خود ان کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کیا ہے۔

ہمارے ننہال علی چنگ میں ایک مزار پایا جاتا ہے، اس مزار میں خوابیدہ بزرگ کا نام مولانا حافظ مخلص الرحمن ہیں۔ میرے نانا جان مرحوم مفضل احمد کے بیان کے مطابق مولانا حافظ مخلص الرحمن ایک زندہ دل بزرگ تھے، انہوں نے اپنی آنکھوں دیکھے کچھ حالات ان کے بیان کئے تھے، صاحب کرامات ایک بزرگ تھے، نہ جانے مھیش بھنڈاری فرقے کے لوگوں سے ان کا کیا تعلق کہ یہ لوگ سال میں ایک مرتبہ ان کی مزار میں جمع ہوتے، عرس کرتے، مزامیر کے ذریعے سماع کرتے، اور کہتے کہ حافظ صاحب کا روحانی تعلق اس فرقہ کے بانی سے تھا، حافظ صاحب کے متعلق اگلی سطور میں باتیں

آرہی ہیں۔

منگڈو اور بوسیدنگ کے علاقے میں پائی جانے والی چند بستیوں میں اس فرقے کے چند لوگ پائے جاتے ہیں، بوسیدنگ میں داپینگ سرا نامی ایک بستی ہے، شمالی بوسیدنگ کی اس بستی میں اس فرقے کے کچھ لوگ رہتے تھے، جن کے اندر ان کا ایک پیر بھی تھا، غالبا مرشد اللہ یا مسیح اللہ اس کا نام تھا، میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا، باوجودیکہ میرے طالب علمی کا زمانہ تھا، پھر بھی جہاں تک مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ایک مسلم فرقے کا مرشد یا پیر نہیں ہوسکتا، بلکہ ہندوؤں کا جوگی ضرور ہوسکتا تھا ۔

اسی طرح علاقہ منگڈو کی چند بستیوں میں اس فرقے کے لوگ بستے تھے، جنوبی منگڈو میں ''دون خالی'' نامی بستی اس فرقے کے لوگوں کا گڑھ تھی، اور شمالی منگڈو میں کیاری پرانگ کے علاوہ بوڑھا شقدار پارہ نامی بستی میں بھی کچھ لوگ پائے جاتے تھے۔ ہمارے زمانے میں بوڑھا شقدار پارہ نامی بستی میں ایک آدمی تھا، عبید الحق نام تھا، عالم شباب میں ایک نامور کشتی بان تھا، بڑھاپے کا غلبہ ہوا تو اس نے تصوف یا طریقت کی ٹھان لی، اور خود ایک بڑا مرشد بن گیا۔ میں نے اسے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کی ظاہری حالت سے اندازہ ہوا تھا کہ یہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو جوگی ہے، تصوف وطریقت کے نام پر خود بھی گم راہ ہے اور جاہل عوام کو گمراہی کی طرف لاتا ہے، سنا ہوں کہ عبید الحق نے ۱۹۹۱ء کے دوران روہنگیا مہاجرین کے ساتھ بنگلہ دیش میں پناہ لی تھی اور وہیں مرگیا۔

ڑکپن کے زمانے میں سنا تھا کہ بوسیدنگ کا معروف قصبہ پوئی مالی کے قریب پائی جانے والی بستی ''خواندنگ'' میں ایک عالم رہتا تھا، جس کا نام مولوی نور احمد تھا، یہ سرزمین ارکان میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا مرشد تھا، جس کا تعلق مھیش بھنڈار خانقاہ سے براہ راست تھا، کہا جاتا تھا کہ خانقاہ مھیش بھنڈار کی طرف سے ارکان کی خلافت اسے بخشا گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے نہیں دیکھا، البتہ اس کے متعلق ہمارے بزرگوں اور اساتذہ سے بہت کچھ سنا، وہ اپنے آپ کو بہت بڑے عالم تصور کرتا تھا، مناظرہ اور مباہلہ کی بھی دعوت دیا کرتا تھا، مگر سنا تھا کہ علماء جب اس کے خلاف جمع ہوتے تو وہ راہ فرار اختیار کرتا رہتا تھا۔

جہاں تک میرا اندازہ ہے کہ بدنام زمانہ نیوں کے دور حکومت میں اس کا کچھ زور سا ہوگیا تھا، البتہ

علمائے ارکان اور وہاں کے راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اس فرقے کا ڈھٹ کر مقابلہ کیا تھا۔

اور حضرت مولانا سید الامین ہمارے علماء کے سرخیل اور اس قافلۂ جہاد کا سالار تھے، حضرت مولانا نے اپنے قافلہ سمیت اس باطل فرقے کا ڈھٹ کر مقابلہ کیا، یوں سرزمین ارکان اس کے لئے تنگ ہوگئی تھی ، باوجودیکہ حکومت کی پشت پناہی اس فرقہ کے پیچھے تھی، مگر علماء کے مقابلہ کے سامنے حکومت وقت کی پشت پناہی بھی اس کا کوئی کام نہیں آئی تھی۔

گئی صدی کے اٹھویں دہائی میں مولانا سید الامین صاحب کی قیادت میں علمائے ارکان نے اس فرقے کے خلاف اعلان جنگ کردیا تھا، میرا جہاں تک خیال ہے کہ مرحوم حمید الرحمن کیاری پر انگی معروف بہ ''باسا پرؤ'' نہ ہوتے، تو اس فرقہ کا قلع قمع ہوجاتا۔

اللہ تعالی تبلیغی جماعت کے بانیوں، داعیوں پر باران رحمت برسائے۔ علمائے ارکان کے اعلان جنگ کے علی الرغم تبلیغی جماعت کے داعیوں کی کوشش اس فرقہ کے قلع قمع میں زیادہ کام آئی۔ جماعت تبلیغ کے داعیوں کی کوشش تھی کہ سرزمین ارکان سے نہ صرف بریلوی فرقے کا قلع قمع ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اور چند باطل فرقوں کا خاتمہ بھی ہو۔ اس میں ایک مھیش بھنڈاری فرقہ بھی ہے۔ آج کل بعض نادان لوگ اس جماعت تبلیغ کے بانی اور داعیوں پر کیچڑ اچھالتے نہیں تھکتے، انہیں کیا اندازہ ہے کہ کس مصیبت کے حالات میں ان داعیوں نے سرزمین ارکان میں دین کی خدمت کی، اور اس سرزمین کو اسپین ثانی ہونے سے بچایا، دراصل ارکان کے علماء اور داعیوں کی خدمت پر ایک علیحدہ اور مستقل کتاب لکھی جانی چاہئے، کاش کوئی اہل قلم ہو کہ اس طرف توجہ دے، اور ان محسنین کی خدمات کو زندہ و جاوید بناتے ہوئے آنے والی نسلوں پر اپنا احسان عظیم کردے۔

ہر حال اس باطل فرقے سے مقابلہ کے حوالے سے حضرت مولانا سید الامین اور ان کے رفقائے کار کی ناقابل فراموش خدمات ہیں، مولانا نے یہ اور اس جیسے باطل فرقوں کا ہر جا تعاقب کیا، بطور خاص مناظرہ کی دعوت کے ذریعے امت مسلمۂ ارکان پر ایک بھاری احسان فرمایا، ہوسکتا تھا کہ بعض لوگوں کا یہی خیال بھی ہو کہ یہ اور اس جیسے فرقے کے اندر بھی کچھ مثبت حقائق موجود ہیں۔ لیکن مولانا کے مقابلہ سے یہی ثابت ہوا کہ یہ اور اس جیسے تمام فرقے باطل ہیں، اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

حضرت مولانا کی اس بارآور جدوجہد کے حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب دامت برکاتہم کی ایک تحریر سے کچھ اقتباس حاضر خدمت ہے، مولانا لکھتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا سید الامین صاحب کا فرقۂ باطلہ سے کئی دفعہ مناظرہ ہوا، پہلی دفعہ بوڑھا شقدار پارہ والے ڈھول فقیر بدعتی چیلہ عبید الحق اور اس کے حواریوں سے مقابلہ ہوا، آپ اپنے شاگردوں سمیت کتابوں کا ایک انبار لئے بوڑھا شقدار پارہ کی جلسہ گاہ میں حاضر ہوئے، جس میں شمالی منگڈو اور جنوبی منگڈو کے بڑے بڑے اعیان اور بڑے بڑے نامور علمائے کرام بھی مدعو تھے۔ اور علاقہ کے ہزاروں مسلمان اس میں شریک تھے۔ حضرت مولانا اس جلسہ کے صدر نشین تھے، سب سے پہلے مولانا نور الاسلام منگنماوی نے بہانگ دہل میک کے ذریعے عبید الحق اور اس کے حواریوں کو جلسہ گاہ میں مناظرہ کے لئے بلایا، اور بتایا کہ آؤ!! اس کے بعد چند اور جید علماء نے خطاب کیا، آخر میں حضرت مولانا اٹھے اور میک میں گرج دار آواز لگائی، اور چلا چلا کر اس باطل فرقے کا خودساختہ نام نہاد پیر عبید الحق اور اس کے حواریوں کو وہاں مقابلہ یا مناظرہ کے لئے بلایا، مگر اس کی طرف سے کوئی بھی نہیں نکلا، مولانا نے ان کی دھجیاں اڑادیں ، ساتھ ہی ساتھ اسلام کی حقانیت، اہل سنت والجماعت کی صداقت، بدعتیوں کی بے شمار خرافات، واہیات، بیہودہ حرکات وسکنات اور اسلام کے نام پر ہندوانہ رسم ورواج پر مشتمل ایک لمبی تقریر کی، اس دن دیکھا کہ مولانا ایک عظیم المرتبت خطیب بھی تھے، انداز خطابت بڑا نرالا تھا، آواز میں جاذبیت، کشش تھی، اور ہر ایک بات دل کو چھونے والی تھی۔

خطاب کے درمیان عوام تو کیا خواص نے بھی نعرۂ تکبیر کا زمزمہ بلند کیا۔ اہل سنت کے ان علماء ومشائخ اور عام مسلمانوں کی حرکات اور جذبات کو دیکھ کر عبید الحق اور اس کے تمام حواری روپوش ہوگئے، باہر کو کیا نکلتے، خود اپنے اپنے گھروں سے بھی راہ فرار اختیار کی، آخر کار حضرت مولانا اور ان کے رفقائے کار تمام علماء اور عامۃ

المسلمین کو مقابلہ کے بغیر اس مجلس کو ختم کرنا پڑا، بعد میں اس اجلاس کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے ڈھول فقیر، بدعتی، تائب ہو گئے تھے، مولانا نے ان میں سے بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں، انہوں نے توبہ کر کے صحیح دین کی راہ لی تھی۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ خود عبید الحق نے بعد میں راہ فرار اختیار کی، اور بنگلہ دیش چلا گیا، جہاں ایک زمانے کے بعد وہ مر گیا۔

اس کے بعد دوسری دفعہ اور ایک جلسہ تنگ بازار بوسید نگ میں بھی منعقد کیا گیا تھا، تا کہ وہاں پائے جانے والے اس فرقے کے لوگوں کا تعاقب کیا جا سکے، تنگ بازار کے قریب پائی جانے والی بستی دابنگ سرا کے تمام بدعتی مھیش بھنڈاری آپ کی آمد کی خبر سن کر فرار ہو گئے، وہیں بھی پچھلے جلسہ کی طرح بلا مقابلہ مجلس ختم کرنا پڑا۔ بعد میں اس فرقے کے بہت سارے لوگ تائب ہو گئے تھے“۔

وں کہ مھیش بھنڈاری والوں نے ”سماع“ کے نام سے ایک علیحدہ عبادت ایجاد کی ہے، اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سماع اور اس کی حقیقت پر ایک مفصل بحث یہاں درج کروں، تا کہ حضرات قارئین کرام کو اس حوالے سے کچھ فائدے ہوں۔

فرقہ ابوالعلائیہ جہانگیریہ کا تعاقب :

سرزمین ارکان کی بعض بستیوں میں فرقۂ مھیش بھنڈاری کی طرح اور ایک فرقہ کے کچھ لوگ پائے جاتے ہیں، جس کا نام اس فرقے کے مطابق ”طریقۂ عالیہ ابوالعلائیہ جہانگیریہ چشتیہ“ ہے۔

دراصل اس فرقے کا اصلی مرکز اور گڑھ جنوبی چاٹگام کا معروف علاقہ ”ساتکانیہ“ میں ہے، ساتکانیہ شہر سے جنوب میں کچھ ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر مرزا کیل نامی ایک بستی ہے، اسی بستی میں اس فرقے کا مرکز مدتوں سے قائم ہے۔

راقم سطور اپنے تعلیمی زمانے میں اس مرکز میں چند مرتبہ گیا تھا، تا کہ اس فرقے کی حرکات وسکنات اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکے، چوں کہ اس فرقے کے کچھ لوگ سرزمین ارکان میں بھی پائے جاتے ہیں، تو ضرورت تھی کہ اس فرقے کے حوالے سے معلومات کا ایک انبار دماغ میں جمع کرے ۔

ارکان میں اس فرقے کا مرکز شمالی منگڈو کی بستی کیاری پرانگ تھا، جہاں اس فرقے کے بہت سے لوگ بستے تھے، چوں کہ مذکورہ بستی میرے دادیہال کی بستی نائچونگ سے ملحق مغرب کی جانب ہے، یوں بچپن میں ان لوگوں سے میری ملاقاتیں رہی تھیں۔

اور ان لوگوں سے میری ملاقاتیں رہنے کی اور ایک وجہ بھی تھی کہ میرے دادیہال کی بستی میں شیخ جمال نامی ایک عاشق رسولؐ ولی کامل تھے، جو حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانیؒ گودام پاروی کے مرید خاص تھے، اور حضرت شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے نامور خلیفہ حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈلی کیوکتوی نے اجازت بیعت عطا کی تھی، شیخ جمال صاحب سے بچپن میں میری خاص ملاقاتیں رہی تھیں، میں نے ان سے استفادہ بھی کیا تھا، اردو کے بڑے ماہر تھے، ساتھ ساتھ سلوک وطریقت کے حوالے سے اللہ تعالی نے ان کا دل کھول دیا تھا، صلح کل کے مشرب رکھتے تھے۔ بڑے صابر، شاکر متدین اور اصول شریعت وطریقت کے پابند بزرگ تھے۔

شیخ جمال صاحب رحمہ اللہ تعالی چوں کہ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی کے مرید بعد میں نور محمد صاحب خنڈلی کیا کتوی کے مجاز بیعت تھے، تو ظاہر ہے کہ ان کا طریقہ سرزمین ارکان کا جانا مانا طریقہ تھا۔ نہ جانے ایسے پابند شریعت شیخ کی اس جہانگیریہ فرقہ کے لوگوں سے کیسی شناسائی ہوگئی تھی، حضرت شیخ اس فرقے کے لوگوں سے ملتے تھے، اور ان کی مجالس میں بیٹھا کرتے تھے۔ یوں راقم سطور کو بھی حضرت شیخ کی معیت میں ان لوگوں کے یہاں بار ہا جانا ہوا تھا، جس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آج بذات خود ان کے حالات قلم بند کرنے کا قابل بنا ۔

میری تعلیمی زمانے میں اس فرقے سے منسلک ایک حافظ عالم ارکان میں رہتے تھے۔ جس کا نام حافظ محمد یوسف تھا، شمالی منگڈو کی بستی چالی پرانگ کا باشندہ تھا۔ حضرت شیخ جمالؒ کی معیت میں حافظ صاحب سے میری چند مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں، میں نے جہاں تک حافظ صاحب کو دیکھا کہ اگرچہ طریقت وسلوک کے حوالے سے ان کا تعلق مرزا کیلی جہانگیریہ سے تھا، لیکن بڑے عابد، خلیق، مہمان نواز اور طریقت وسلوک کے اصول وکلیات سے واقف انسان تھا۔ حافظ صاحب سے چند مرتبہ کیاری پرانگ اور ان کی آبائی بستی چالی پرانگ میں میری ملاقاتیں رہیں۔ یوں مجھے اس فرقے کے حوالے

سے کچھ معلومات بچپن میں ہو چکی تھیں، بعد میں بذات خود اس کے مرکز کا دورہ بھی کیا، اور اس فرقے کے متبعین نہیں بلکہ خود گدی نشین سے بھی ملاقات کے ذریعے معلومات حاصل ہوئیں ۔

اس فرقے کے چند لوگ شمالی منگڈو کی معروف بستی نکھورہ کے علاوہ منگڈو شہر کی سمت مشرق میں آباد ''ہتالیہ پارہ'' نامی بستی میں بھی پائے جاتے تھے۔ موخر الذکر بستی میں بھی ایک مولوی صاحب ''حافظ مولوی یوسف'' رہتے تھے، میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی، ۱۹۸۴ئ سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا، البتہ حافظ صاحب کا صاحب زادہ حافظ حبیب اللہ سے میری خاص شناسائی تھی، سنا اور اندازہ بھی کیا تھا کہ حافظ محمد یوسف ہتالوی صاحب چالی پرانگ والے مذکور حافظ یوسف صاحب کی طرح اس فرقے کے ارکان میں مرشد اعظم تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے حافظ محمد یوسف ہتالوی کے گھر میں طریقت وسلوک کی بہت سی دقیق اور مانی ہوئی کتابیں دیکھیں، جس سے اندازہ ہوا تھا کہ مولوی صاحب علم وہنر کے ساتھ ساتھ سلوک وطریقت میں بھی خاصے درک رکھتے تھے۔ واللہ اعلم۔

مرزا کیل میں پائے جانے والے اس فرقے کے مرکز میں ایک خوشنما مزار ہے، جس میں اس فرقے کے تین بزرگوں کے مراقد ہیں ۔

(۱) شیخ العارفین۔

(۲) فخر العارفین۔

(۳) شمس العارفین۔

شاید ایک قبر کی جگہ خالی ہے، ہوسکتا ہے کہ اس میں اس وقت کے گدی نشین مولوی کمال صاحب جنہیں اس فرقے کے لوگ حی العارفین یا حی العارف کے نام سے یاد کرتے ہیں، جن سے راقم کی بارہا ملاقاتیں رہی ہیں کے لئے مخصوص ہو۔ مولوی کمال صاحب ان کے اصول وکلیات سے صرف نظر ایک عالم، عارف اور سخی نظر آئے، میری اس فرقے کی لٹریچر پر خاص نظر پڑی، خصوصاً ''سیرت فخر العارفین'' کو امعان نظر سے اس زمانے میں مطالعہ کیا۔ یوں تو یہ کتاب اس فرقے کا دوسرا نامور بزرگ ''فخر العارفین'' کی سیرت پر مشتمل ہے، لیکن اس میں سلوک وطریقت کے حوالے سے اس فرقے کے نقطۂ نظر کے مطابق سیر حاصل بحث کی گئی ہے، مصنف کوئی سکندر شاہ صاحب تھے، ہندوستان

غالباً بہار کا رہنے والا تھے، زبان وادب شستہ اور قلم میں خاص روانی دیکھی گئی ہے۔

ہمارے بڑے بڑوں میں جہاں تک معلوم ہوا کہ مسٹر ظہیر الدین بی اے علیگ مرحوم کا تعلق اس فرقہ سے تھا، اسی طرح ظہیر صاحب کا چھوٹا بھائی مسٹر انجینئر عبدالوحید صاحب مرحوم نے بھی اس فرقہ سے نسبت قائم کر لی تھی۔ ظہیر الدین صاحب سے میری ملاقات تو نہ ہوسکی، البتہ عبدالوحید صاحب سے چاٹگام میں میری خاصی ملاقاتیں رہیں۔

طریقت کے حوالے سے اس فرقے کے حالات اور بھی تفصیل سے لکھی جاسکتی، اگر سیرت فخر العارفین اس وقت میرے سامنے ہوتی، پھر بھی میں نے کوشش کی کہ یہ کتاب حاصل ہوجائے، ایک تو میں اس وقت سعودی عرب میں مقیم ہوں، اس قسم کی لٹریچر کا دخول ظاہر ہے کہ یہاں ممنوع ہے، دوسری طرف یہ کتاب عام بازاروں کے کتب خانے میں بنگلہ دیش میں بھی نہیں ملتی۔ پھر بھی میں اس فرقے کے متعلق کچھ سابقہ مطالعہ کی بنیاد پر اور کچھ اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہوں :

(۱) اس فرقے کے لوگ روزہ سعودی عرب کے اعلان کے مطابق رکھتے ہیں، یعنی سعودی عرب میں جس دن روزہ رکھنا شروع ہوتا ہے، یہ لوگ بھی اسی دن سے روزہ رکھتے ہیں، جو عموماً بنگلہ دیش والوں سے ایک دن پہلے ہوتا ہے ۔

(۲) اسی طرح عیدین بھی سعودی عرب والوں کے مطابق مناتے ہیں، جو بھی عموماً بنگلہ دیش والوں سے ایک دن پہلے ۔

(۳) اسی طرح نماز بھی بڑی تاخیر سے ادا کرتے ہیں، ان کے مطابق یہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ ہر ایک نماز سعودی ٹائم کے مطابق ادا ہو سکے، اس لئے کہ سعودی عرب والے اوّل وقت میں پڑھتے ہیں تو ان لوگوں کو آخر وقت میں ادا کرنا ہوتا ہے۔

(۴) اس فرقہ کے لوگ سجدۂ تعظیمی کے نام پر نہ صرف بزرگوں کی قبروں کو بلکہ اپنے مرے ہوئے بزرگوں کی گدیوں اور تکیوں تک کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کا حالیہ گدی نشین ''حی العارفین کمال صاحب'' کو ہر ایک مرید سجدۂ تعظیم بجالاتے ہوئے۔ کیوں کہ اس فرقہ کے خیال میں سجدۂ تعظیم حرام نہیں بلکہ حلال اور جائز ہے، اس حوالے سے ان کے مولوی صاحبان

عجیب وغریب دلائل پیش کرتے ہیں۔العیاذ باللہ ۔

(۵) یہ لوگ سماع کو حلال یا مباح تو کہتے ہیں،لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ یہ لوگ مجلس سماع کو مجلس ذکر کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، یوں تو وقت وقت پر مجلس سماع منعقد کرتے ہیں،لیکن جمعہ کی رات بعد العشاء ضرور منعقد کرتے ،جس میں عمومی طور پر سارنگی، ڈھولک، بایلون اور مٹکے وغیرہ بجابجا کر اشعار پڑھتے ، جن میں تصوف وسلوک کے اسرار کے نام پر شرکیہ کلمات بھی ہوتے ہیں۔ان اشعار میں بنگلہ زبان کی کثرت تو ہیں،لیکن اردو اور فارسی شعراء کے اشعار بھی ہوتے اور گائے جاتے ہیں۔مجلس سماع کے دوران رقص وسرود اور وجد وتواجد بھی ہوتے ، دوران سماع اگر کسی ایک کو وجد آجائے اور وہ کھڑا ہوجائے تو سارے لوگ اس کے اتباع میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔

(۶) یہ لوگ قیام اور میلاد مناتے ہیں۔خصوصی طور پر بارہ ربیع الاوّل ان کے لئے بریلویوں کی طرح عید کا دن ہوتا ہے،میلاد بڑے دھوم دھام سے مناتے ہیں۔

(۷) فاتحہ خوانی اور عرس اس فرقے کا شیوہ ہے، ۲۴ جمادی الثانی کی تاریخ ان لوگوں کے عرس کی تاریخ ہے، بڑی دور دراز سے اس فرقے کے مریدین بیل بکریاں، روپئے پیسے لئے مرکز میں حاضر ہوتے، برما بنگلہ دیش کے علاقہ جات کے علاوہ ہندو پاک حتی کہ عراق بغداد سے بھی لوگ آتے ہیں۔ اسی طرح ۶ رجب کو ہر سال حضرت خواجہ معین الدین چستی اجمیری رحمہ اللہ تعالی کا عرس بڑی شان سے منایا کرتے ہیں ۔

(۸) عام طور پر اس فرقے کے لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں، یہ ان کی ایک بڑی خصوصیت ہے،صلح کل کے مشرب کے حامل ہوتے ہیں،عمومی طور پر لوگوں سے محبت رکھتے اور نفرت وعداوت سے دور رہتے ہیں۔مہیش بھنڈاریوں کی طرح آزاد نہیں ہوتے۔صوم وصلاۃ کے اگر چہ ان کے اصول عام اہل السنت والجماعت کے اصولوں سے کچھ مختلف بھی ہیں پابند ضرور ہیں، قیام اللیل اور شب بیداری کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔مہیش بھنڈاریوں کے برخلاف یہ لوگ قول وعمل کے بڑے پکے ہوتے ہیں اور شریعت اسلامیہ کا مذاق نہیں اڑاتے۔

(۹) مہیش بھنڈاریوں کے برعکس ان کی خواتین عریانیت سے دور رہتی ہیں، پردۂ شرعی کی

پابند ہوا کرتی ہیں۔

(۱۰) اس فرقہ کے لوگ اپنے سر پر پانچ چاند تارے والی ٹوپی پہنتے ہیں، کرتہ قمیض جس رنگ کا بھی ہو مگر لنگی سرخ رنگ کی پسند کرتے ہیں،شاید یہ ان کے بزرگوں کا شیوہ تھا۔

بہر حال یہ اور اس قسم کی بہت ساری باتیں اور بھی ہیں،لیکن مستحضر نہیں۔چوں کہ ان کی روش میں خلاف شرع بہت چیزیں پائی جاتی ہیں، اسی لئے عامۃ المسلمین کو عموماً اور علمائے اسلام کو خصوصاً ان لوگوں کی روش سے چھیڑ ہوتی ہے ۔

حضرت مولانا سیّد الامین صاحب اور آپ کے ساتھ علمائے اسلام اور عامۃ الناس کی ایک بڑی جماعت نے فرقۂ مہیش بھنڈاریوں کی طرح اس فرقہ کی بھی سرکوبی اور قلع قمع کے لئے کمر ہمت باندھی تھی۔البتہ فرقۂ مہیش بھنڈاری کے بعض لوگوں کی طرح اس فرقہ کے لوگ چیلنج پر نہیں آئے تھے۔علماء کرام اور عامۃ المسلمین ان کے خلاف میدان میں اتر آئے تھے مگر ان لوگوں نے خاموشی اختیار کی تھی ۔البتہ بالا بالا یہ کہتے تھے کہ یہ سلوک وطریقت،معرفت وحقیقت کا معاملہ ہے، جو عام طور پر اہل ظاہر یعنی علماء اور عام مسلمانوں کی سمجھ سے باہر ہے،اس لئے یہ علماء اور عامۃ المسلمین معذور ہیں۔

بہر حال حضرت مولانا سید الامین اور ان کے متبعین کی کوشش سے اس فرقہ کے بعض لوگ بھی تائب ہوگئے تھے، اگر حکومت وقت ان کا ساتھ نہ دیتی ،تو اس فرقے کا خاتمہ ہوجاتا۔خدا معلوم آج کل ارکان میں اس فرقہ کا کیا حال ہے، اللہ تعالی کرے کہ اسے ہدایت نصیب ہوجائے۔

صالح کوتوال رنگونی کی سرکوبی

شمالی منگڈو کے معروف علاقہ بلی بازار کے علاوہ قاضی آباد اور نائن چونگ وغیرہ بستیوں میں بریلویوں سے متأثر چند خاندان تھے، ان خاندانوں میں بلی بازار کا ''خاندان بلی'' اور قاضی آباد کا ''خاندان قاضی'' پیش پیش تھے، جو قیام، میلاد، فاتحہ خوانی، عید میلاد النبی،عرس وغیرہ کرتے تھے۔ربیع الاوّل کی بارہ تاریخ کو بطور خاص بلی بازار میں عید میلاد النبیؐ کا جشن بڑے دھوم دھام سے منایا جاتا تھا، نہ جانے آج کل اس حوالے سے ان خاندانوں کی کیسی حالت ہے۔ان خاندانوں میں پیری مریدی کا بڑا رواج تھا، حضرت مولانا الحاج شاہ عبد السلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کے بھی ہزاروں مریدان ان

خاندانوں کے علاوہ اس علاقے میں پائے جاتے تھے۔حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی کی رحلت کے بعدان کے خلیفۂ ارشد حضرت مولانا نورمحمد خنڈ لی نے بھی اس علاقے کا بارہا دورہ کیا تھا، ان کے بھی خلفاء اور مریدین اس علاقے میں تھے، ان دونوں بزرگوں کے علاوہ مولانا مشتاق احمد بن حضرت مولانا ولی بخش پندو پرانگی کے بھی ایک سے زیادہ خلفاء اس علاقے میں تھے، دھودائنگ نامی بستی میں ان کے ایک خلیفہ سمیت اور مریدان تھے۔

قاضی آباد بستی کے ایک نامور ماسٹر اور ایک زمانہ کے پارلمینٹ ممبر جناب ماسٹر رشید احمد صاحب بڑے حساس انسان تھے، مگر قدرت کی کاری گری دیکھئے کہ وہ رنگون کے کسی سفر میں صالح کوتوال نامی ایک آدمی سے متأثر ہوآئے تھے۔صالح کوتوال رنگونی کا جہاں تک پتہ چلا کہ اس نے اپنے زمانے میں رنگون اور اطراف کے بعض علاقے میں اپنی پیری مرشدی کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ ماسٹر رشید احمد نے ان سے بیعت کی اور ایک روایت کے مطابق خلافت بھی حاصل کی تھی۔

ماسٹر رشید احمد صاحب قاضی آبادی کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ان کی مجلس میں بھی بیٹھا۔صالح کوتوال کے بڑے مداح تھے۔ظاہر ہے کہ کوتوال صاحب ان کے مرشد تھے۔اور مرشد کا گن گانا تو خاص طور پر اس قسم کے لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ بہرحال غالبًا ۱۹۸۳ء کا واقعہ تھا کوتوال صاحب ماسٹر صاحب اور ان کے احباب کی دعوت پر بلی بازار آئے ہوئے تھے۔اور یہاں کے بعض بھولے بھالے مسلمان جناب رشید احمد صاحب کی سازش کے شکار ہوکر صالح کوتوال کی آمد کے انتظار بڑی شدت سے کررہے تھے۔کوتوال صاحب کی آمد کی خبر پھیلی تو حضرت مولانا سید الامین اور ان کے رفقاء وتلامذہ حرکت میں آگئے، کیوں کہ صالح کوتوال کی حالت سے حضرت مولانا واقف تھے، اندیشہ تھا کہ کوتوال صاحب یہاں آسانی سے کام کرسکیں گے تو بہت سے صالح اور راسخ العقیدہ مسلمان بھٹک جائیں گے۔کوتوال صاحب تو بریلوی مسلک کے تھے ہی، مزید برآں پیری مریدی کے نام سے ایسے ایسے کام بھی کرتے تھے جن کا تعلق اسلام سے دور جوگیوں، راہبوں سے قریب تھا۔ میں نے رشید احمد صاحب قاضی آبادی کی زبانی یہ بات سنی تھی کہ کوتوال صاحب اور ان کے خلفاء ناخن میں سرسوں کا تیل ڈال کر لوگوں کو اپنے مرے ہوئے والدین اور اقارب واعزاء کی قبر کے حالات دکھاتے تھے۔

بہرحال کوتوال صاحب بلی بازار آئے تو مولانا اور ان کے احباب، تلامذہ اور عام راسخ العقیدہ مسلمانوں نے بلی بازار میں ایک جلسہ قائم کیا، اور کوتوال صاحب اور ان کے حواریوں کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ آئیں اور راسخ العقیدہ علمائے اسلام سے مناظرہ کریں، تاکہ عقیدہ اور اعمال کے حوالے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے۔جلسہ تو قائم کیا گیا تھا، مگر ہر چند دعوت اور کوشش کے باوجود کوتوال اور ان کے حواری حاضر نہ ہوئے تھے۔

اس جلسہ میں وقت کے بڑے بڑے علماء، دانشوران، طلباء حاضر ہوئے، علماء نے تقریریں کیں، آخر میں حضرت مولانا سید الأمین صاحب نے ایک زوردار تقریر کی، جس میں کوتوال صاحب کے عقیدے اور اعمال کا صحیح نوٹس لیا گیا تھا، اور لوگوں کو صالح کوتوال کی دھوکہ وہی سے بچالیا تھا، اس حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ :

> ''بلی بازار میں صالح کوتوال رنگونی کی آمد کی خبر سن کر آپ تڑپ اٹھے تھے۔کوتوال ایک بدعتی تھا، اور قیام میلاد پارٹی کا سرخیل بھی، اس کے بھرپور مقابلہ کرنے اور عامۃ المسلمین کو اس کے دھوکہ سے بچانے کے لئے حضرت مولانا سید الامین صاحب اور ان کے تلامذہ واحباب تیار ہوگئے، یوں بلی بازار میں ایک جلسہ منعقد کرایا گیا، مگر ہر چند کوشش کے باوجود صالح کوتوال اور اس کے حواری لوگ مقابلہ یا مناظرہ کے لئے نہیں آئے، کہیں چھپے رہے یا بھاگ گئے تھے''۔

جہاں تک پتہ چلا کہ ماسٹر رشید احمد صاحب قاضی آبادی نے صالح کوتوال صاحب کو اس علاقے میں فتوحات کا خواب دکھایا تھا، یوں کوتوال صاحب یہاں آئے تھے۔مگر علماء اسلام خصوصًا حضرت مولانا سید الامین کی کوشش اور جہد مسلسل نے ان کے خواب کو بے خوابی میں بدل دیا اور ان کے آگے کی تمام راہیں مسدود کرڈالیں۔کوتوال صاحب نے یہاں چند روز چوری چھپے گزارے اور الٹے پاؤں رنگون کی راہ لی تھی۔

رشید احمد قاضی آبادی کی طرح صالح کوتوال کا اور ایک مرید میں نے منگڈو شہر میں دیکھا، نام تھا نور احمد، جو فیاضی پارہ میں رہائش پذیر تھا، بڑے بڑے بال والے۔نحیف اور چھوٹے قد کا آدمی تھا، ایک

موقع پر اس سے میری ملاقات ہوگئی تھی، اس نے خود مجھے کوتوال کی کرامات پر مشتمل چند واقعات بیان کئے، جو من گھڑت اور شاید جھوٹی تھیں۔ نوراحمد صاحب بھی رشید احمد قاضی آبادی کی طرح حبّ رسول کے بڑے دم بھرتے تھے، ساتھ ساتھ کوتوال کے بھی، پیرنمی پرد مریداں می پراند۔

پاکستانی صدر جنرل ضیاء الحق کی دعوت :

عالم اسلام کی مایۂ ناز شخصیت شہید ملت جنرل ضیاء الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دورصدارت میں ایک مرتبہ جامعہ اشرفیہ تشریف لائے تھے، صاحب زادۂ گرامی ڈاکٹر دین محمد بن مولانا سید الامین صاحب کا کہنا ہے کہ ان کو پاکستان کے چند علماء نے کہا تھا کہ: جنرل ضیاء الحق صاحب ایک روز جامعہ اشرفیہ تشریف لائے، اور وہاں سے فارغ التحصیل ان طلباء کی تفصیلات دیکھیں، جنہوں نے اس جامعہ سے ماضی میں گولڈ میڈلسٹ کا تمغہ حاصل کیا تھا، تمغہ حاصل کرنے والوں میں ارکان کے ایک طالب علم مولانا سید الامین کا نام پڑھا تو بڑے متعجب ہوئے تھے، ایک موقع پر حکومت پاکستان کی سرپرستی میں ایک عالمی سیرت رسول ﷺ کانفرنس کے انعقاد کی بل پاس ہوئی تو اس میں مولانا سید الامین صاحب کو بھی دعوت دی گئی تھی، ڈاکٹر دین محمد صاحب کا بیان ہے کہ:

''صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق صاحب کے دور صدارت میں سیرت رسول ﷺ کے انعقاد کی تجویز پاس ہوئی تو ابا جان کو صدر پاکستان کی طرف سے دعوت دی گئی تھی، بنگلہ دیش میں اس وقت کے پاکستانی مشن نے مولانا سیف الاسلام صاحب (اس وقت کے روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن کے صدر) کے پاس دعوت نامہ آیا تھا، مگر مولانا نے ملک کے حالات کے پیش نظر اس دعوت کو قبول کرنے سے معذرت کی تھی، پاکستانی مشن نے قدرے اصرار بھی کی تھی کہ حضرت اس کانفرنس میں شریک ہونے کی زحمت گوارہ کریں، مگر حضرت نے اپنی مجبوری کا بار بار اظہار فرمایا تھا''۔

مولانا کا ایک نرالا انداز :

مولانا اتنے بڑے جلیل القدر عالم دین ہونے کے باوجود ہر کس و ناکس کے ساتھ گھل مل کر بیٹھ جاتے

تھے، خصوصی طور پر گاڑی میں جب سوار ہوتے، جہاں بھی جگہ مل جاتی وہیں بیٹھ جاتے تھے، مکہ مکرمہ میں آپ کے ایک شاگرد مولوی محمد زکریا بوسیدنگی سے ملاقات ہوگئی تھی، انہوں نے مولانا کے متعلق چند قصے بتائے تھے، ان میں سے ایک بات ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کہ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ :

'' ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں بوسیدنگ سے منگڈو جارہا تھا، ایک گاڑی پر سوار ہوا تو تھا، مگر گاڑی سواریوں سے کشاکش بھری پڑی تھی، اندر جھانک کر دیکھا تو ایک مولوی صاحب بھی اندر بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے چار چشمی ہوئی تو دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے اندر بلا رہے تھے، اندر جانے کی گنجائش بھی بہت کم تھی، اور تو اور سواریوں میں بودھ عورتیں بھی کم نہ تھیں، کسی طرح میں مولوی صاحب کے قریب جا بیٹھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ کون تھا، مجھے کسی طرح ان کے پاس بٹھایا، اور فرمانے لگے۔ کہ بیٹے تم کدھر جارہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں پرانپورو جارہا ہوں، پھر فرمانے لگے کہ اتنی تکلیف برداشت کرتے ہوئے وہاں کس غرض سے جارہے ہو؟ میں نے کہا کہ وہاں ایک بہت بڑے عالم دین رہتے ہیں، مولانا سید الامین نام ہے ان کا، میں ان سے پڑھنے جارہا ہوں، پھر فرمانے لگے کہ تم نے انہیں کبھی دیکھا بھی ہے، میں نے کہا نہیں، البتہ وہ بہت بڑے عالم دین ہیں، ملک بھر میں ان کی شہرت ہے، اور میں نے مزید ان کی کچھ مدح سرائی بھی کردی، آخر کار آپ نے تبسم بھرے انداز میں کہنے لگا کہ تم جس کے پاس جارہے ہو، وہ میں ہی ہوں، میرا نام سید الامین ہے، اس کے بعد مولانا نے میرے سر پر ہاتھ رکھا، اور دعائیں دیں''۔

رنگون کا ایک تاریخی سفر:

ہل فکر ونظر اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ عرصۂ دراز سے سرزمین ارکان کے قدیمی اور اصلی باشندے روہنگیا مسلمانوں سے رنگون وغیرہ کے سفر کا حق سلب کرلیا گیا ہے، خاص طور سے برمی بدنام زمانہ فوجی ڈکٹیٹر جنرل نیون کے دور حکومت سے ارکانی مسلمانوں پر یہ پابندی عاید کی گئی تھی، اور

۱۹۹۲ء سے کسی ارکانی مسلمان کے لئے رنگون کا سفر کرنا بالکل بند کیا گیا تھا، اس حوالے سے راقم سطور کا ایک تحریری بیان ملاحظہ کیجئے:

'' مواصلات اور نقل وحرکت کی پابندی کے حوالے سے رونگٹے کھڑے ہونے والے مصنوعی قوانین ارکانی مسلمانوں کے لئے بنائے جاچکے ہیں، ایسے ایسے غیر ذمے دارانہ قوانین لاگو کردیئے گئے ہیں، جن کی تصویر کشی زبان وقلم کے ذریعے شاید ممکن ہو سکے گی، ایک زندہ دل انسان کے لئے انہیں دیکھے بغیر تصور کرنا بھی مشکل ہوجائے گا''۔

سرزمین ارکان اور وہاں کے مسلمانوں کی بہبودی وفلاح کے حوالے سے دور آخر کی معروف تنظیم: ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن کا بیان ملاحظہ کیجئے :

'' حالیہ فوجی حکومت اپنے پچھلے پیش رووٴں کی طرح روہنگیا مسلمانوں سے حق شہریت وسکونت مکمل سلب کرلیا ہے، جس کی وجہ سے روہنگیا مسلمانوں کی معاشی، اقتصادی، تعلیمی، دینی اور ثقافتی سرگرمیاں بری طرح متاثر ہوگئی ہیں، اللہ کی اس وسیع دنیا میں درندوں اور پرندوں کے لئے بھی راہ کھلی ہوئی ہے، جب کہ روہنگیا مسلمانوں کو اپنے ہی وطن میں قیدی بنادیا گیا ہے، کوئی بھی مسلمان ارکان کی حدود میں ایک بستی سے دوسری بستی، ایک شہر سے دوسرے شہر کو حکومت کی نام نہاد پرمٹ (اجازت نامہ) کے بغیر سفر نہیں کرسکتا، جب کہ ایسی پرمٹ کے حصول کے لئے بے حد پوچھ گچھ اور چھان بین کے علاوہ ایک بڑی رقم کی رشوت دینی پڑتی ہے، اور اجازت ملے بھی تو یہ چوبیس گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ سات دن کے لئے ہوتی ہے، اس سلسلے میں یہ بھی ایک حیران کن اور چونکا دینے والی بات ہوتی ہے کہ برمی دارالحکومت کا سفر کسی بھی روہنگیا مسلمان کے لئے ۱۹۸۲ء سے لے کر سرے سے بند کردیا گیا ہے، جب کہ ۱۹۹۲ء سے ایسی پابندی صرف روہنگیا دیہاتی کسانوں پر لگائی گئی تھی، اب کوئی بھی روہنگیا طلبہ، تاجر، انجنئر، ڈاکٹر،

قانون دان، حتی کہ فوری تشخیص اور علاج کی ضرورت بلکہ خطرناک حالات سے دو چار مریضوں کے لئے رنگون کے سفر کی اجازت نہیں ہے''۔

سرزمین ارکان کے ایسے دلدوز اور جان گسل حالات میں بھی ہمارے چند بزرگوں کی کرامات کہہ لیجئے یا کچھ اور کہ ان بزرگوں کے لئے سرزمین ارکان سے دارالحکومت رنگون وغیرہ کے سفر کی اجازت تھی، ہمارے ان چند بزرگوں میں ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید الامین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ اور چند حضرات تھے، جن میں حضرت العلامۃ شیخ طریقت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب مینگزوی رحمۃ اللہ علیہ اور امیر جماعت تبلیغ حضرت مولانا فیض الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ قابل ذکر ہیں، ہوسکتا ہے کہ ہمارے ان گنے چنے چند بزرگوں کے علاوہ اور بھی حضرات ایسے ہوں گے کہ جن کو دارالحکومت رنگون وغیرہ کے سفر کی کھلی اجازت رہی ہو۔

بہرحال حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں چند مرتبہ برمی دارالحکومت رنگون کا سفر کیا، ان میں ایک دو تو حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کے حوالے سے تھے، باقی سفر دینی، دعوتی، ثقافی اور علمی رہے تھے، ان تمام اسفار میں ۱۹۹۵ء کا سفر بہت ہی کامیاب سفر تھا، اس سفر کے حوالے سے صاحب زادۂ گرامی عزیز مولوی عمران صاحب جو بذات خود آپ کے ساتھ تھے کا ایک بیان ملاحظہ کیجئے، موصوف فرماتے ہیں کہ:

''رنگون کا سفر کیا، ہم ارکان کے دارالحکومت اکیاب سے بحری جہاز پر سوار ہوکر چوکپرد گئے، وہاں سے تنگوب، اور تنگوپ سے درہ پار کر کے بذریعۂ موٹر رنگون اترے تھے، ہم بحری جہاز میں سوار تھے، دریا میں زور کا طوفان آیا، سارے لوگ خوف زدہ ہوگئے تھے، اس جہاز میں مگھ خواتین بھی بڑی تعداد میں تھیں، جب طوفان کا زور شروع ہوا تو ہم اللہ کو پکار رہے تھے، اور مگھی خواتین ''پراپرا'' کر کے والد محترم کے سامنے سرنگوں تھیں، گویا ان کے نزدیک ''پرا'' یعنی ''خدا'' ابا جان تھے، نعوذ باللہ من ذلک، اب ابا جان اور ایک پریشانی کے شکار تھے، ایک طرف طوفان کا زور دوسری طرف مگھی عورتوں کی بے جا منت وسماجت، اب ابا جان

فرمانے لگے تھے کہ تمہارا ''پرا'' میں نہیں ہوں، اوپر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، اللہ کو پکارو، وہی کارساز ہے، وہی بناتا، بگاڑتا ہے، وہی حیات وموت کا مالک ہے، تھوڑے عرصہ کے بعد طوفان کا زور کم ہوا تو سارے لوگ بشمول مگھی خواتین اباجان کی عزت وقدر میں لگ گئی تھیں، ویسے اللہ اللہ کر کے ہم چوکپر دپہنچ گئے تھے۔

حضرت اباجان رنگون میں بیٹھے ہوئے نہ تھے، رنگون کے معروف دینی مدارس، صوفیہ مدرسہ اور مدرسہ اسعدیہ کے علاوہ دیگر بڑی بڑی مساجد میں آپ نے بڑی ایمان افروز تقریریں کی تھیں، ان تمام تقریروں میں آپ نے سرزمین ارکان اور برما کے مسلمانوں کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے زوردار اور ایمان افروز بیان دیا تھا، ہر ایک طبقہ کے لوگ آپ کی تقریر سے متاثر ہوئے تھے، ان کے علاوہ بھی رنگون کے دیگر دور دراز کے مدارس اور مساجد کی زیارت کی، اور جہاں بھی تشریف لے گئے آپ نے اپنے علم وفن سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا، اور دین کی خدمات کی طرف توجہ دلائی تھی، چوں کہ آپ برمی زبان سے تقریباً ناواقف تھے، جہاں بھی ''میں نے ۱۹۹۵ء میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ آپ نے تقریریں کیں، اردو زبان کا سہارا لیا تھا، اور یاد رہے کہ برمی دارالحکومت کے مسلمان اردو زبان سے واقف ہیں، ان کے علاوہ بھی حضرت کے چند احباب اور چاہنے والوں نے اپنے اپنے گھروں میں دینی وعلمی مجالس بھی قائم کی تھیں، جن میں آپ حاضر ہوئے اور اپنے علم ودانائی سے لوگوں کو محظوظ ہونے کا موقع دیا تھا''۔

رنگون کا معروف مدرسہ ''صوفیہ'' میں عرصۂ دراز سے حضرت مولانا شمس الضحیٰ صاحب شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے، ارکان اور برما کے علمائے کرام میں آپ کی عزت ومنزلت خاص تھی، جہاں تک راقم سطور کی معلومات کی حد ہے، حضرت مولانا بڑے پائے کے عالم دین اور شیخ الحدیث ہیں، ایک سے زائد کتابوں کے مصنف بھی، جن میں حضرت کی ایک کتاب ''تلخیص البخاری'' بڑی گرانمایہ تصنیف ہے، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ حضرت کا تعلق کیوکتو کی معروف بستی خنڈل سے

ہے، حضرت مولانا ایک دینی، علمی اور روحانی گھرانے کے چشم وچراغ ہیں، آپ کے بڑے بھائی حضرت مولانا شاہ نور محمد خنڈلی ایک جلیل القدر عالم اور شیخ طریقت گزرے ہیں، انہوں نے حضرت العلامہ مولانا شاہ عبدالسلام گودام پاروی بوسیدنگیؒ سے بیعت کی اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے، حضرت ارکانی صاحب یعنی شاہ عبدالسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے خلفائے کرام سے راقم سطور واقف ہے، جن کا تعلق ارکان برما اور علاقۂ چاٹگام سے ہے، ان تمام بزرگوں میں مولانا نور محمد خنڈلی ارکانی کا مرتبہ بہت بلند تھا، اس سلسلے میں بہت ساری باتیں ہیں، طوالت کے خوف سے بیان میں نہیں لائی جارہی ہیں۔

بہر حال حضرت مولانا سید الامین صاحب کو مولانا شمس الضحیٰ صاحب نے صوفیہ مدرسہ میں دعوت دی، وہاں حضرت کی تقریر ہوئی تھی، اس زمانے میں مولانا شمس الضحیٰ کی مذکورہ کتاب ''تلخیص البخاری'' زیر نظر تھی، مولانا نے حضرت مولانا سید الامین صاحب سے اس کی تقریض مانگی تو مولانا نے خوشی خوشی سے اس کی ایک جاندار تقریض لکھی تھی، اس حوالے سے مولانا کے رفیق سفر صاحب زادۂ گرامی عزیز مولوی عمران صاحب کا بیان ملاحظہ کیجئے:

> ''حضرت مولانا شمس الضحیٰ صاحب نے اباجان حضرت مولانا سید الامین کو مدرسہ صوفیہ میں دعوت دی تھی، آپ وہاں گئے اور علماء کرام اور طلباء کے سامنے بڑی عالمانہ تقریر کی، سارے لوگ حضرت کی تقریر سے خوش اور محظوظ ہوئے تھے، مولانا شمش الضحیٰ صاحب نے اباجان کو اپنی رہائش گاہ لے گیا، جہاں آپ نے تلخیص البخاری کا مسودہ دکھایا، اور ایک تقریض بھی دینے کی درخواست کی تھی، اباجان نے اسی مجلس میں اس مسودہ پر نظر لگائی، اور ایک جان دار تقریض بھی لکھی''۔

علاوہ ازیں حضرت مولانا سید الامین نے رنگون میں پائے جانے والے اس وقت کے بے شمار دینی، علمی، روحانی، ثقافتی، تعلیمی اور سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں کیں، جن میں مولانا کے صاحب زادہ گرامی عزیز مولوی عمران کے بیان کے مطابق مولانا داؤد یوسف کی زیارت ناقابل فراموش ہے، مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ:

''اباجان نے بے شمار دینی، علمی، فکری، ثقافتی، روحانی اور سیاسی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں، جن میں مولانا داؤد یوسف کی زیارت ناقابل فراموش ہے، مولانا داؤد یوسف نے حضرت کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا، اپنی رہائش گاہ آنے کی دعوت دی تو آپ نے قبول فرمایا، حضرت اباجان کو بڑے تپاک سے استقبال کیا، کھانا کھلایا، ان دونوں بزرگوں نے سرزمین ارکان اور برما کے مسلمانوں کے حالات پر سر جوڑ کر تبادلۂ خیالات کئے، مولانا داؤد یوسف صاحب نے ارکان کے مسلمانوں کے حالات زار پر آنسو بہائے، اور اباجان کو داد سفر دی اور فرمایا کہ آپ نے ایسے نازک حالات میں بھی ارکانی مسلمانوں کو اکیلے نہیں چھوڑا اور دین کی خدمات میں کسی قسم کی کسر باقی ہی نہیں رکھی''۔

بیعت وارادات:

حضرت مولانا سید الامین صاحب نے اعلی دینی تعلیم کے لئے ہند و پاک کا سفر کیا، جس کی تفصیلات ان کی تعلیمی زندگی کے باب میں گزر چکی ہیں، مگر جہاں تک معلوم ہوا کہ حضرت نے دوران تعلیم کسی شیخ طریقت کے ہاتھ میں بیعت نہیں کی تھی، جب کہ ظاہر ہے کہ جس زمانے میں حضرت ہند و پاک میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اسی زمانے میں ہند و پاک مشائخ طریقت سے بھرے ہوئے تھے، پھر مولانا تعلیم سے فراغت کے بعد وطن واپس آئے اور عرصۂ دراز تک تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، عمر کی رفتار کے ساتھ ان کو محسوس ہوا تھا کہ کسی باضابطہ شیخ طریقت کے ہاتھ میں بیعت کے بغیر اصلاح باطن یعنی تزکیہ نفس کا کام خوش اسلوبی سے نہیں ہو سکتا ہے، یوں انہوں نے ۱۹۷۰ء کے دوران حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب کھچر بیلوی (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت پیر محمد ہاشم صاحب شاف بازاری) سے بیعت کی، اور عرصۂ دراز تک شیخ کے ارشادات کے مطابق تزکیہ واحسان وتصوف وسلوک کے منازل طے کئے تھے، اور مولانا محمد صدیق مولف ''مشاہیر ارکان'' کے مطابق اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوئے تھے، چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ :

''شاہ صاحب کی وصیت کے مطابق پیر صاحب (مولانا عبد اللطیف) رحمۃ اللہ

علیہ نے بھی خانقاہی نظام کا باقاعدہ آغاز کیا، اور بہتوں کو راہ راست پر لے آیا، پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے حضرات کو خلافت دی، یہاں چند حضرات (پیر صاحب کے خلفاء) کا تذکرہ مولانا عبد القدوس مجاہد ہاتھی پاوری (پیر صاحب کے نواسہ ہیں) کے مطابق کیا جا رہا ہے:

(۱) رئیس المنطقیین شیخ المعقول والمنقول حضرت مولانا سید الامین صاحب فاضل جامعہ اشرفیہ۔

(۲) مولانا عبد الغفور فانسی بوسیدنگ۔

(۳) مولانا احمد حسین صاحب فانسی بوسیدنگ۔

(۴) حضرت مولانا سعید اللہ صاحب ناکھوروی''۔

حضرت مولانا سید الامین صاحب اپنے پیر ومرشد پر بڑے فدا تھے، جب تک مرشد زندہ رہے، ان سے تعلقات استوار رکھے ہوئے تھے، اپنے حالات سے مرشد کو آگاہ کیا کرتے تھے، مرشد کے سامنے بڑے نرمی اور احترام سے پیش ہوتے تھے، مولانا کی مرشد سے وارفتگی کے حوالے سے مولوی بدر عالم بن مولانا سعید عالم چالی پرانگی کا بیان ہے کہ:

''۱۹۸۷ء کا واقعہ ہے کہ ہماری قریبی بستی رنگا بالی میں بخاری شریف کا ختم ہو رہا تھا، جس میں حضرت مولانا سید الامین صاحب اپنے بعض متعلقین، احباب اور تلامذہ کے ساتھ حاضر ہوئے تھے، اور اس میں حضرت کے پیر ومرشد حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب کھچر بیلوی بھی تشریف فرما تھے، میں نے یہاں دیکھا کہ استاد الکل حضرت مولانا سید الامین صاحب حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب کے سامنے دوزانو ہو کر سر جھکائے بیٹھے ہیں، ہم بڑے متعجب ہوئے، جب کہ اس سے پہلے ہم حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب سے واقف بھی نہیں تھے، کجا کہ ان کے مرتبہ ومقام کی بات، بعد میں ہم نے حضرت مولانا سید الامین صاحب سے استفسار کیا کہ حضرت یہ کون صاحب ہیں کہ جن کے سامنے زانوئے تلمذ آپ نے خم کیا

ہے؟ تو حضرت مولانا نے فرمایا یہ حضرت مولانا پیر عبداللطیف صاحب ہیں، جو میرے مرشد ہیں، مولانا کے اس بیان سے پہلے ہم اس بات سے بھی واقف نہیں تھے کہ حضرت مولانا نے بھی کسی شیخ طریقت کے ہاتھ بیعت کی تھی‘‘۔

حضرت مولانا کے دیرینہ ساتھی حضرت مولانا افضل حسین بن عبدالرشید منگنماوی کا بیان ہے کہ:

’’وطن میں میں حضرت مولانا مرحوم کا سایہ بن کر رہا تھا، مولانا اکثر سفر میں مجھے ساتھ لے جایا کرتے تھے، باوجودیکہ آپ میرے استاد تھے، اور عمر میں بھی بہت بڑے تھے، مگر ان کے اندر میں نے مخدومیت کی برتاؤ نہیں دیکھی، میرے بڑے بھائی کالامیاں روا سوگری اکثر فرمایا کرتے تھے کہ افضل حسین تم محدث صاحب کے ساتھ ہمیشہ سایہ بن کر رہو، ان کے ساتھ رہنا ہی علم وعمل کے ساتھ رہنا ہے، حضرت جہاں کہیں بھی جائیں راہ صرفہ تم ادا کرتے رہو، بعد میں میں تجھے ادا کردوں گا، حضرت کے اسفار اکثر وبیشتر فقہ وفتاوی یا وعظ ونصیحت کے حوالے سے ہوتے تھے، بڑے منصف مزاج تھے، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ حضرت مولانا ایک جلیل القدر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے پایہ کے عابد بھی تھے، سفر وحضر میں تہجد کی نماز پابندی سے ادا کیا کرتے تھے، میں اس بات سے قطعی طور پر واقف ہوں کہ حضرت مولانا سید الامین صاحب نے طریقۂ عالیہ نقشبندیہ پر حضرت مولانا پیر عبداللطیف صاحب کے ہاتھ میں بیعت کی تھی، اور بعد میں حضرت کو خلافت بھی عطا ہوئی تھی، مولانا مرحوم اپنے ہم سفروں کے ساتھ گویا دوستوں کی طرح رہا کرتے تھے، مشیخیت کے تمام طریقوں سے کوسوں دور رہتے تھے، ان کے اندر مخدومیت کی شان نہیں ہوتی تھی، گویا ہر وقت خادم کی شان نمایاں رہتی تھی‘‘۔

معیت علمائے اسلام ارکان، مجلس امور دینیات کی سرپرستی

اب اس سے پہلے کہ جمعیت علمائے اسلام ارکان اور کونسل برائے امور دینیات کے ساتھ حضرت مولانا سید الامین رحمۃ اللہ علیہ کے خوش گوار تعلقات کا تذکرہ کروں، ضروری سمجھتا ہوں کہ ان دونوں پارٹیوں کے حوالے سے کچھ معلومات سامنے رکھ دوں، ورنہ ان دونوں پارٹیوں کے ساتھ حضرت مولانا کے

خوش گوار تعلقات کی نوعیت کا اندازہ کرنا قدرے مشکل ہوجائے گا۔

برطانوی دور حکومت میں سرزمین میں ارکان اور برما میں بہت سارے مسلم دانشوران حکومت کے عہدوں میں فائز تھے، جن میں چند حضرات برطانوی برمی حکومت کے کلیدی عہدوں میں بھی رہ چکے تھے، جیسا کہ بیرسٹر سلطان محمود اکیابی سابق وزیر برائے امور صحت اور مسٹر عبداللطیف وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ برطانوی حکومت کے عہدے داروں پر سیاست گویا حرام تھی، اسی لئے سرزمین ارکان کے چوٹی کے مسلم قائدین جو حکومت کے وظیفہ خوار ہونے کی وجہ سے سیاسی سرگرمیوں میں قانونی طور پر کھل کر حصہ نہیں لے سکتے تھے، یہ دیکھ کر سرزمین ارکان کے چند دوراندیش علماء نے جمعیت علمائے اسلام نامی ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ اور اس جمعیت کی تاریخ تاسیس کا جہاں تک پتہ چلا کہ یہ جماعت ۱۹۳۳ء میں تاسیس کی گئی تھی۔

یہاں اس تنظیم کے موسسین کے حوالے سے ایک بات کہہ دینا ضروری ہے کہ راقم سطور نے اپنی تالیف ’’سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں‘‘ میں یہ جو لکھا تھا کہ اس تنظیم کے بانی مولانا غلام قادر ارکانی تھے اور حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب مرحوم اور ماسٹر حبیب اللہ صاحب اس تنظیم کے اوّلین میں سے تھے، اس بیان میں یہ غلطی ہوگئی تھی کہ مرحوم غلام قادر صاحب سرے سے اس تنظیم کے بانی نہیں تھے، بلکہ اس کا بانی حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب اور ان کے چند ہم خیال رفقائے کار اور احباب تھے، راقم سطور کو جس ذریعہ سے یہ معلوم ہوا تھا کہ مولانا غلام قادر صاحب اس تنظیم کے بانی تھے، بعد میں تحقق ہوا ہے کہ وہ ذریعہ ہی غلط تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ بعض جاننے والوں نے راقم سطور کو یہ معلومات بھی فراہم کیں کہ مولانا غلام قادر جو اس زمانے میں منگڈو کے پوسٹ ماسٹر تھے، ان کے عقیدے ہی میں بڑا خلل تھا، حتی کہ بعض حضرات نے یہاں تک دعوی کیا ہے کہ مولانا کا تعلق قادنیوں سے تھا۔ واللہ اعلم۔

جہاں تک راقم سطور کے معلومات ہیں، ان کی بنیاد پر کہا جارہا ہے کہ جمعیت علمائے اسلام ارکان کی تاسیس جمعیت علمائے اسلام ہند کے نہج پر ہوئی تھی۔ اس تنظیم کا تصور پان اسلام ازم کا تصور تھا۔ اس تنظیم کے برخلاف ’’کونسل برائے امور دینیات (برما)‘‘ کا تصور سراسر برمی قومیت پر مبنی تھا، تو وجہ یہی

تھی کہ موخر الذکر اس کونسل نے ہمیشہ سیاجی عبدالرزاق کے سیاسی خیالات کی حمایت کی تھی، اور سیاجی عبد الرزاق کے واسطے سے گویا (AFPFL) (جو جنرل اونگ سان کی قیادت میں چل رہی تھی) کی حامی بعض تنظیموں میں یہ جماعت بھی تھی۔ اور بعد میں بھی دیکھا گیا ہے کہ یہ کونسل اور اس کے لیڈران ہمیشہ ہمیشہ حکومت برما کی حمایت کرنے والوں میں سے تھے، حکومت کا سایہ اس پر ہمیشہ برقرار رہا تھا۔ جب کہ جمعیت علمائے اسلام جس طرح عرض کی گئی ہے کہ اس کا تصور پان اسلام ازم کا تصور تھا، اور سرزمین ارکان میں اس جماعت کی سیاست ہمیشہ ہمیشہ ارکانی مسلمانوں کی حمایت میں تھی ۔

پھر یہاں اس بات کا بھی تذکرہ ہو کہ جہاں تک راقم سطور کے معلومات کا تعلق ہے، اس بنیاد پر یہ بھی عرض کردوں کہ سرزمین ارکان میں جمعیت علمائے اسلام پہلی تنظیم تھی، جس نے امت مسلمۂ ارکانیہ کے سیاسی مفاد کے حوالے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اور اس سرزمین کی سیاسیات کے حوالے سے یہ جماعت باضابطہ طور پر پرسب سے پہلے بنی تھی، ڈاکٹر ایوب علی صابر مرحوم نے اس جماعت کی خدمات کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، ان کی تحریر میں سے ایک اقتباس حاضر خدمت ہے کہ :

> "مگھوں نے ارکانی مسلمانوں کی قومی زبان کو مٹانے کے لئے مسٹر زین الدین کو خوب استعمال کیا تھا۔ کیوں کہ وہ پہلے ہی سے اردو کے مخالف تھے، آخر کار موصوف کو آلۂ کار بنا کر اردو زبان اور مسلم اسٹیٹ کے مطالبہ کو دبا رکھا تھا، اور ارکانی مسلمانوں کو غیر ملکی قرار دینے کی خفیہ سازش کا محاذ کھول رکھا تھا۔ اسی طرح مگھوں نے جنرل اونگ سان کا کان بھی بھر دیا تھا، چنانچہ اونگ سان نے ایک بیان میں کہا تھا کہ "شمالی مغربی ارکان کے مسلمانوں کے طرز معاشرت، تہذیب وثقافت مگھوں سے مختلف ہے، لہذا ان کے مطالبے تب تک قبول نہیں کئے جائیں گے، جب تک ان کو ملک کے اصلی باشندوں کی طرح حقوق نہ حاصل ہوجائیں، اب جمعیت علمائے اسلام حرکت میں آگئی تھی اور حقوق شہریت کے حصول کی جدوجہد تیز سے تیز کردی تھی، چنانچہ جمعیت علماء نے شاندار جلسہ کرایا تھا، جس میں حصول آزادی (برطانیہ سے) اور مسلم اسٹیٹ کا مطالبہ کیا گیا تھا" ۔

اسی زمانے میں جمعیت علمائے اسلام ارکان ارکانی مسلمانوں کی بڑی فعال اور حساس تنظیم تھی۔ چوں کہ یہ تنظیم ۱۹۳۳ء میں وجود میں آئی تھی، چنانچہ جہاں تک پتہ چلا کہ ۱۹۴۲ء کے خون آشام قتل عام کے دوران اس تنظیم کے رہنماؤں اور کارکنوں نے مگھ خون خواروں اور برمی شاطروں کے مظالم سے مسلمانوں کو بچانے کی بڑی حد تک کوشش کی تھی۔ بعض حضرات کا یہاں تک کہنا ہے کہ جن مسلم رہنماؤں نے ۱۹۴۲ء میں ارکانی مسلمانوں کی رہنمائی اور قیادت کی تھی ان کی اکثریت یا تو جمعیت علمائے اسلام کے لیڈران تھی، یا حساس کارکن، جنھوں نے مگھ برمیوں کے خلاف کئے جانے والے جہاد کا پرچم تھام کر مسلمانوں کو مزید مظالم سے بچایا تھا۔

۱۹۴۲ء کے بعد مگھ خون خواروں اور برمی شاطروں نے مل کر ارکانی مسلمانوں کی سیاست کی ساری راہیں مسدود کردی تھیں، مگر جمعیت علمائے اسلام کے لیڈروں نے ہمت نہیں ہاری۔ دریں اثنا یہ سن کر کہ برما کا معروف شہر میمو میں ایک برطانوی کمیشن آپہنچا ہے، تو اس کمیشن سے ملاقات کے لئے جمعیت علمائے اسلام نے ایک وفد کی ترتیب کی، جس میں درج ذیل حضرات شامل تھے۔

(۱) حضرت مولانا ثناء اللہ بن انوار علی سرانگ باریٹ لا، رنگیادنگی، بوسیدنگی ۔
(۲) جناب سلطان احمد (BABL) بالوخالوی، منگڈوی۔
(۳) جناب محمد شم (BA) وکیل فاروی، منگڈو۔
(۴) حضرت مولانا عبدالغفار (BABT) رنگیادنگی، بوسیدنگی۔

چنانچہ اس وفد نے اس برطانوی کمیشن کے سامنے ایک میمورنڈم بھی پیش کیا تھا، جس میں کئے جانے والے مطالبوں میں سب سے نمایاں مطالبہ شمالی مغربی ارکان کو مسلم اسٹیٹ کے درجہ دینے کا مطالبہ تھا ۔ یہ ۷/مارچ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ برطانوی کمیشن کی قیادت سر رس ولیم کررہے تھے، مذکورہ میمورنڈم کے ساتھ جمعیت کے وفد نے میمو میں رس ولیم سے ملاقات کی اور میمورنڈم کے ساتھ ساتھ زبانی طور پر بھی "مسلم اسٹیٹ" کا مطالبہ کیا تھا، مگر سر رس ولیم نے بڑے افسوس کے ساتھ جواب دیا کہ ہم تو سرحدی معاملات کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں، لہذا آپ حضرات کے مطالبات پر حامی بھرنے کے اختیارات ہمارے پاس نہیں ہیں،، اس جواب کے بعد جمعیت کے وفد نے رس ولیم سے

استفسار کیا کہ کیا آپ نارتھ ارکان کو چن پہاڑی علاقے سے ملا سکتے ہیں؟ سر ولیم نے اس کے جواب میں حامی بھری اور کہا کہ آپ حضرات اسی مطالبہ پر مشتمل ایک درخواست پیش کر دیں۔مگر اب ایک مصیبت آن پڑی تھی کہ جمعیت علمائے اسلام کے وفد کے پاس ''مسلم اسٹیٹ'' کے مطالبہ کے علاوہ اور کسی قسم کے مطالبہ کرنے کا اختیار نہ تھا، چنانچہ وفد نے سر رس ولیم سے یہ کہتے ہوئے رخصت لی تھی کہ ہم مشورے کر کے عریضہ پیش کریں گے، بعد میں جمعیت کا وفد ارکان پہنچا اور مشورے کرتے کرتے سر رس ولیم اپنے مشن کو تکمیل کرتے ہوئے لندن چلے گئے، یوں نارتھ ارکان کو چن پہاڑی علاقے سے ملانے کا کام بھی نا تمام رہ گیا تھا''۔(۱)

دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر برطانوی حکومت نے برما کو پھر قبضہ کر لیا تھا، تاہم اس نے اس خطے کی دیگر سامراجی کالونیوں کی طرح برما کو بھی آزادی دینے کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کردی۔ویسے ۱۹/اپریل ۱۹۴۷ء کو ملک بھر میں قانون ساز اسمبلی کے لئے عام انتخابات کرائے گئے تھے، اور منگڈو بوسیدنگ کے لئے دو امیدواروں کا اعلان ہوا تو جمعیت جو اس زمانے میں ارکانی مسلمانوں کی واحد سرگرم جماعت تھی نے ان دونوں نشستوں کے لئے مولانا عبدالغفار (فارغ التحصیل مدرسہ محسنیہ چاٹگام، سابق ڈپٹی انسپکٹر مدارس اسلامیہ ارکان رنگیا دنگی) اور جناب سلطان احمد (BABL) بالوکھالوی کے نام پیش کر دیئے تھے، ادھر مسٹر اسماعیل داؤد شاہ مارکن معروف بہ تنبیہ صاحب جو ۱۹۴۲ء کے مجاہدین کے رہنما بھی تھے نے بحیثیت آزاد امیدوار اپنا نام پیش کیا تھا۔مگر جب الکشن کا نتیجہ برآمد ہوا تو مسٹر عبدالغفار اور سلطان احمد کی جیت پر تنبیہ صاحب بڑے برگشتہ اور نالاں ہو گئے تھے۔

جمعیت علمائے اسلام نے اپنے دونوں منتخب شدہ ممبر ان کو ہدایت دی تھی کہ برمی ایوان کے پہلے اجلاس میں نارتھ ارکان کو برمی حکومت کے تحت مسلم اسٹیٹ کے درجہ دینے کا مطالبہ کرے، لیکن یہ دونوں ممبران اس پہلے اجلاس میں شرکت سے قاصر رہے، وجہ مواصلات کی خرابی تھی، پھر بھی دونوں حضرات نے بعد میں برما کے بڑے بڑے بااثر لیڈران سے مسلم اسٹیٹ کے حوالے

---

(۱) مسٹر عبدالغفار، ارکانی مسلمانوں کا عروج وزوال، ص ۶۶۔۷۱۔

سے گفتگو کی تھی۔کوشش بہت ہو چکی تھی، مگر ہر ان کی کوشش کو ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا تھا۔لیڈروں سے ان کی ملاقات کا سلسلہ جاری رہا تھا، انہوں نے اس دوران ارکانی لیڈر اونگ زین وے اور سیاجی عبد الرزاق سے بھی ملاقات کی تھی۔اونگ زین وے نے ان کو ارکانی مگھوں سے مل جل کر رہنے کا مشورہ دیا تھا۔جب کہ سیاجی رزاق صاحب مرحوم نے بس اتنی سی بات پر اکتفاء کی تھی کہ'' میں بھی تو ایک مسلمان ہوں''ایک طرف ارکانی مسلمانوں کے دونوں خیر خواہ لیڈروں کی کوشش جاری تھی۔دوسری طرف ارکان کے مگھ لیڈروں نے روہنگیا مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور پروپیگنڈوں کا سلسلہ بڑی شان سے جاری رکھا تھا۔ان مگھوں نے برما بھر کے چوٹی کے لیڈروں کے کان یہ کہہ کر بھر دیا تھا کہ سرزمین ارکان کے طول وعرض میں بنگالی اور ہندوستانی نژاد کے لاکھوں مسلمان گھسے ہوئے ہیں، جو ارکان کو پاکستان بنانے کے خواہش مند ہیں۔اب مسٹر عبدالغفار اور سلطان احمد کے لئے زمین تنگ ہوگئی تھی۔تو ان دونوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہماری آخری کوشش مسٹر اونگ سان سے ملاقات کو یقینی بنانے پر ہونی چاہئے، چناں چہ انہوں نے ہر چند اونگ سان سے ملاقات کرنے کی کوشش کی، تاکہ ان سے شمالی ارکان کو مرکزی حکومت برما کے تحت ''مسلم اسٹیٹ'' کا درجہ دینے کی بات طے ہو سکے۔ مگر اونگ سان نے عدم فرصت کے بہانے تراشے، تاہم اپنے سکرٹری کو حکم دیا تھا کہ ان دونوں مسلم لیڈروں کی درخواست کو فرصت میں ان کے سامنے پیش کردے، یوں ارکانی مسلمانوں کے ان دونوں لیڈروں نے میمورنڈم کی شکل میں اپنے جائز مطالبہ اونگ سان کے سکرٹری کا حوالہ کیا تھا۔اور سکرٹری نے ان دونوں کو بتایا تھا کہ ۱۹/جولائی ۱۹۴۷ء کو آپ حضرات اونگ سان سے ملاقات کرنے آئیں ،اب وقت مقررہ پر ۱۹/جولائی کو دونوں حضرات اونگ سان سے ملاقات کرنے کے لئے اپنی رہائش گاہ سے نکلے، مگر سارے کے سارے راستوں میں سناٹا چھایا ہوا دیکھ کر ششدر رہ گئے، بعد میں معلوم ہوا کہ اونگ سان اور ان کے چھ ساتھی بشمول سیاجی عبدالرزاق اس دنیا میں نہیں ہیں، خون خوار حملہ آوروں نے سکرٹیریٹ میں اچانک گھس کر ان کو ہلاک کر دیا ہے۔یہاں قارئین کرام کو ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان چھ مقتول افراد میں سیاجی عبدالرزاق کے علاوہ ایک اور مسلمان لیڈر بھی تھا، جس کا تذکرہ عام برمی تاریخ میں نہیں ملتا۔مگر تحریک آزادیٔ برما کے ہیروؤں میں سیاجی عبدالرزاق کی

شمولیت اوران کا کردار جو بھولے سے بھلایا نہیں جاسکتا، مسلمانان ارکان اور برما کے لئے کافی ہے کہ برما کی آزادی میں مسلمانوں کا بھی روشن کردار رہا ہے، جس طرح مسلمانان پاک وہند کے روشن اور تابناک کرداران دونوں ملکوں کی آزادی میں رہا تھا۔ مسٹراونگ سان اوران کے ساتھیوں کی ہلاکت کے بعد مسٹراونو کو برما کا وزیراعظم بنایا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں برمی ایوان کی دوسری سشن شروع ہوئی، جس میں شان، کچھن، مون وغیرہ ریاستوں کے متعلق طول طویل گفتگو ہوئی تھی۔ اور شمالی مغربی ارکان کو مسلم اسٹیٹ کے درجہ دینے کی کوئی بات نہ ہوئی تو مسٹرعبدالغفار اور سلطان احمد صاحبان نے اس کی وجہ دریافت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ:

’’ ہم نے اپنا جائز مطالبۂ مسلم اسٹیٹ کا ایک میمورنڈم اونگ سان کے حکم سے ان کے سکرٹری کا حوالہ کیا تھا، لیکن آج اس پر کسی بھی قسم کی گفتگو نہ سن کر ہم آپ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں!‘‘ ان دونوں کے اس استفسار پر اسپیکر نے کہا تھا کہ اونگ سان نے اپنی ہلاکت کے قبل نارتھ ارکان کے مسلم علاقہ کے بارے میں کہا تھا کہ :

’’منگڈو اور بوسیدنگ جو شمالی مغربی ارکان کا ایک مسلم علاقہ ہے، جہاں پانچ لاکھ کی مسلم آبادی ہے، اگر اس علاقہ کو مسلم اسٹیٹ کا درجہ دیا جائے گا تو ملک بھر میں اس قسم کی ریاستیں بہت زیادہ ہوجائیں گی، جس سے حکومت بہت کمزور ہوجائے گی‘‘ (۱)

برمی پارلیمنٹ کے اسپیکر کا مایوس کن جواب سن کر ارکان کے دونوں لیڈران مزید پریشان ہوگئے تھے۔ برمی پارلیمنٹ میں اس وقت تین سو سے زیادہ ممبران تھے، کوئی بھی ان دونوں کی پریشانی پر دادرسی کرنے والا نہ تھا۔ پھر برما کی آزادی کے حوالے سے مسٹراونو لندن گئے، جہاں انہوں نے اس وقت کے برطانوی وزیراعظم مسٹراٹلی سے گفتگو کی۔ بالآخر ایک معاہدہ پر دستخط ہوگیا۔ جس کے بعد برطانیہ نے ۶/جنوری ۱۹۴۸ء کو برما کی مکمل آزادی دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لیکن برمی نجومیوں نے اس دن کو منحوس قرار دیا تو ۴/جنوری ۱۹۴۸ء کی صبح چار بج کر ۲۰ منٹ میں برما میں

(۱) مسٹرعبدالغفار نا کھوروی۔ ارکانی مسلمانوں کے عروج وزوال، ص:۶۷۔

برطانوی گورنر نے آزادی کا اعلان کرتے ہوئے لندن کی راہ لی اور اونو برما کا پہلا وزیراعظم اور شوے سا تائک صدر جمہوریہ بن گئے۔

برما کی آزادی کے بعد اونو دور حکومت میں ارکانی مسلمانوں کے حوالے سے بہت ساری تنظیمیں بنیں، سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی، دینی وثقافتی تنظیموں کے علاوہ چند طلبہ تنظیمیں بھی وجود میں آئی تھیں، لیکن آزادی کے قبل سرزمین ارکان اور وہاں کے مسلمانوں کے حوالے سے قومی سطح پر صرف اور صرف ایک تنظیم تھی، جس نے اپنی تاسیس کی ابتداء سے مسلمانان ارکان کی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں، آزادی کے بعد تو ماشاءاللہ بہت ساری تنظیمیں وجود میں آئیں جن کی خدمات کو بھی تاریخ ارکان کبھی نظرانداز نہیں کرسکتی مگر آزادی کے قبل سرزمین ارکان کے حوالے سے صرف اس تنظیم کی سیاست چلی تھی، جس میں ارکان کے

تقریباً بڑے بڑے نامور علماء کے علاوہ دانشوران بھی شامل تھے۔ اور جن جن حضرات علماء نے اس تنظیم میں شامل ہوکر قومی اور دینی فریضہ انجام دیا تھا، ان کی تفصیلات کے لئے کم سے کم ایک ضخیم جلد کی ضرورت ہوگی، جو اس عجالے میں ممکن نہیں۔

علمائے ارکان کو اس بات پر فخر وناز ہونا چاہئے کہ ان کے اسلاف نے سرزمین ارکان اور وہاں کے مسلمانوں کی فلاح وبہبودی، کامرانی اور نجات کے لئے جمعیت علمائے اسلام ارکان جیسی ایک تنظیم کی تاسیس کرکے اس بات کا ثبوت پیش کردیا کہ علماء نے دیگر امور دینیہ کے علی الرغم سیاست وقیادت اور جہاد جیسے اہم دینی فریضہ کی ادائیگی میں کبھی بھی کوتاہی سے کام نہیں لیا، جب کہ بعض عصری علوم کے حاملین ہمارے دانشوران و مثقفین علماء پر الزام دیتے نہیں تھکتے کہ علماء سیاست میں بہت پیچھے ہیں، سرزمین ارکان کے ان دانشوروں کو سوچنا چاہئے کہ سرزمین ارکان اور وہاں کے مسلمانوں کے حوالے سے سیاست وقیادت کے فرائض انجام دینے کے لئے سب سے پہلی قومی سطح کی تنظیم کس طبقہ نے بنائی تھی، اور تو اور کہنے میں تو وہ جماعت علماء نے بنائی تھی، اور نام بھی جمعیت علمائے اسلام تھا، مگر علماء کتنے فراخ دل تھے، کہ اس جماعت میں وقت کے تقریباً تمام دل جلے دانشوران کی شرکت وشمولیت بھی انہوں نے ضروری سمجھی، علماء میں صرف بعض تنگ نظروں کی تنگ نظری انہیں کھٹکتی ہے، ان کو یہ نظر کبھی

نہیں آتا کہ علماء کتنے فراخ دل، بالغ نظر اور دوراندیش بھی ہوسکتے ہیں۔ میری ان معروضات سے کسی دانشور بھائی کا دل دکھے تو معذرت !! مگر حقیقت جو کہوں بھی تو حقیقت اور نہ کہوں تو وہ بناوٹ کبھی نہیں ہوسکتی۔ فرمائیں! تاریخ ارکان کی سب سے اوّل تاریخی، قومی و دینی جماعت علماء نے تاسیس کی تھی یا دانشوران نے؟ جواب بس وہی نکلے گا جو حقیقت ہے، بعض علمائے اسلام ارکان نے قومی سطح پر اس میدان میں سب سے پہلا مسابقہ جیتا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ سرزمین ارکان کے علماء اور طلبہ اور دینی وایمانی حوالے سے پروان چڑھنے والی نسلوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ان کے اسلاف نے ان کے لئے کیا ورثہ چھوڑ چلا تھا۔ اور ان کی چھوڑی ہوئی اس وراثت کو کس طرح اور کس آن بان سے سنبھالنا ان کا دینی ایمانی، قومی اور ثقافتی فریضہ ہے، لہذا میری معروضات سے یہ مقصد بالکل نہیں ہے کہ میں سرزمین ارکان کے حوالے سے اور ایک فتنہ کھڑا کر رہا ہوں، علماء اور دانشوروں میں تفریق کی بنیاد ڈال رہا ہوں، میں اس کا سراسر مخالف ہوں کہ علماء اور دانشوروں کی تفریق کی جائے۔ میں صرف دانشوروں کو تاریخی حقائق بتا کر یاد دلا رہا ہوں کہ آپ نے جو علماء پر الزام عاید کیا ہے کہ علماء سیاست وقیادت میں پیچھے ہیں، یہ سراسر غلط الزام ہے۔

یہاں ایک اور حقیقت کا تذکرہ بہت اہم ہے کہ اگرچہ جمعیت علمائے اسلام ارکان اور جمعیت علمائے اسلام برما ایک جیسی دو جماعت لگتی ہیں، مگر ان دونوں میں بعض چیزوں میں ہم آہنگی ہونے کے باوجود ایک نمایان فرق بھی موجود تھا، جمعیت علمائے اسلام برما کل برمی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت متصور تھی ،جس کا دعوی تھا کہ جمعیت اسلام برما کل برمی مسلمانوں کی خیرخواہ جماعت ہے، مگر جمعیت علمائے اسلام ارکان کا سب سے بڑا ہدف اس زمانے میں شمالی مغربی ارکان کو ''مسلم اسٹیٹ'' بنانا تھا، تاکہ یہاں مسلمان آزادی کے ساتھ جی سکیں، اور بطور خاص مگھوں کے مظالم سے بچنے کا سروسامان کرسکیں، مگر جمعیت علمائے اسلام کے اس ہدف کے حصول کے لئے جمعیت علمائے اسلام برما نے کھل کر حمایت نہیں کی تھی۔ یہ اور دیگر امور کو سامنے رکھتے ہوئے بعض حضرات فکرودانش کا کہنا ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان اگرچہ نام میں یکسانیت ہے مگر فکر ونظریات کے حوالے سے ان دونوں میں نمایاں فرق تھا۔

بہرحال برما کی آزادی ۱۹۴۸ء سے لے کر اقتدار پر برمی فوجوں کے قبضہ یعنی ۱۹۶۲ء تک جمعیت علمائے اسلام ارکان نے قانونی دائرے میں رہ کر ارکانی مسلمانوں کی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں، بطور خاص ثقافتی اور تعلیمی میدان میں اس کی خدمت ناقابل فراموش ہے، اس جماعت کی اس زمانے کی خدمات کے حوالے سے راقم سطور کی تالیف سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر کا ایک اقتباس ملاخط کیجئے:

''آزادئ برما کے بعد ارکان میں بعض دوسری اسلامی منظمات ابھر آئیں، لیکن آزادی سے پہلے اسی تنظیم کی خدمات ارکان میں دیکھی گئیں، جو کبھی بھی فراموش نہیں کی جاسکتیں، اور آزادی کے بعد بھی بڑی مدت تک اس جماعت کی خدمات قومی سیاست کے افق پر نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، خصوصًا وزیز اعظم اونو کے دور حکومت میں اس تنظیم نے جو خدمات انجام دیں وہ قطعًا ناقابل فراموش ہیں،،۔

برما پر معروف ومشہور زمانہ فوجی ڈکٹیٹر **جنرل** نیون کا قبضہ ہوگیا تو ملک بھر کی تمام جماعتوں کی طرح جمعیت علمائے اسلام ارکان کو بھی معطل کر دیا گیا، اور میدان سیاست کے تمام مسلم اور غیر مسلم ارباب سیاست وقیادت کے منہ پر تالے لگا دیئے گئے، یوں جمعیت علمائے اسلام کے شیران پلنگ کو بھی خاموش ہوجانا پڑا تھا۔ تاہم جمعیت علمائے اسلام کے پرچم تلے اب تک قوم وملّت کے کام سرانجام دینے والوں نے ملک کے سیاسی حالات کے پیش نظر اس بات پر سوچا کہ آیا ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق یہاں ملک وملّت کی کوئی خدمت بھی انجام دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ جمعیت کے ارباب بست وکشاد میں سے چند بزرگوں کی رائے تھی کہ ملک کی اس بدلتی ہوئی سیاسی حالت کے پیش نظر جتنا ممکن ہوسکے ملک وملّت کی خدمات انجام دینا ہے، لیکن چند بزرگوں کی رائے یہ تھی کہ اب جمعیت علمائے اسلام کو زیر زمین جا کر انقلابی انداز میں کام کرنا ناگزیر ہے، ان بزرگوں کے اس حوالے سے راقم نے اپنی تالیف ''سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں'' میں کچھ خامہ فرسائی کی تھی، جس سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

'' اب جمعیت علمائے اسلام اگرچہ سیاست کے ظاہری افق پر خاموش ہوگئی تھی، مگر

اندر ہی اندر ایک راہ کی متلاشی تھی جس پر چل کر ملّت اسلامیہ ارکان کی اگلی خدمات سرانجام پا سکیں، باوجود یکہ اس پر کوششیں بہت ہوئیں لیکن ۱۹۷۵ء تک جمعیت اپنی تمام کوشش میں بظاہر ناکام رہی، یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف ملک بھر میں برمی شوشلسٹ پروگرام پارٹی کے کارندے بھوکے شیر کی شکل میں دھندناتے پھر رہے تھے، تو دوسری طرف ارکانی مسلمان مسلسل سیاسی وانقلابی بحران کے شکار ہوجانے کے بعد ناامید اور مایوس ہو بیٹھے تھے، جمعیت علمائے اسلام کے لیڈروں نے جب دیکھا کہ ملک میں علانیہ کوشش کی گنجائش باقی نہیں ہے، تو ۱۹۷۵ء انہوں نے زیر زمین جانے کو مناسب سمجھا تھا، جس وقت ارکان کا میدان سیاست بالکل سرد ہو چکا تھا تو اسے پھر سے گرمانے کی جمعیت علمائے اسلام کے اراکین ہی نے بڑی تیزی سے کوشش شروع کردی تھی۔ اور ارکان کا زیر زمین رہنے والا گروپ جو آخر تک جعفر حبیب کی قیادت میں چل رہا تھا وہ بھی چاٹگام میں دم واپسیں لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تو ۱۹۷۵ء میں جمعیت علمائے اسلام ارکان کے ارباب بست وکشاد میں سے چند افراد جن میں مولانا عبدالقدوس مظاہریؒ، مولانا حبیب اللہ سمبویؒ، جناب مولانا محمد زکریا صاحب محدث مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ پارویؒ اور جناب ماسٹر عبدالغفار صاحب بالاحضرات اس سلسلے میں چاٹگام تشریف لائے۔ اور چاٹگام میں اس سلسلے میں چند اجلاس ہوئے، بالآخر بات یہاں تک طے ہوئی کہ اگلی بننے والی جماعت کے ایک قائد منتخب کرنیکے لئے علمائے ارکان میں سے چند صاحب رائے بزرگ حضرات کو اس کا ذمے دار بنایا جائے گا، جس کی تفصیلات ارپی ایف کے باب میں گزر چکی ہیں، بالآخر ان بزرگوں، جن کے اسمائے گرامی یہاں لانا مناسب نہیں سمجھا جارہا ہے۔ کی اتفاق رائے سے حضرت پیر صاحب (حضرت مولانا مظفر احمد مینگزوی، خلیفۂ اجل حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہ) نے جعفر حبیب مرحوم کو اجازت قیادت دیتے ہوئے ایک تحریر

ی اجازت نامہ لکھ بھیجا تھا۔ یوں علمائے ارکان اور دانشوران عظام کے تعاون سے ارپی ایف (روہنگیا فدائین محاذ) کی دوبارہ تجدید ہوگئی تھی"۔

آپ نے اس اقتباس میں ملاحظہ کیا کہ اس زمانے میں چند ارکانی علماء نے حضرت پیر صاحب کو اس بات کا ذمے دار بنایا تھا کہ آپ علمائے ارکان کی طرف سے اگلی ہونے والی انقلابی جماعت کا ایک قائد منتخب کریں، جس کی بنیاد پر حضرت پیر صاحب نے حضرت جعفر حبیب کو میدان انقلاب کا قائد منتخب فرمایا تھا، اور جن حضرات علمائے کرام نے حضرت پیر صاحب کو اتنے عظیم کام کا ذمے دار بنایا تھا، اور جن کے اسمائے گرامی اس وقت کے حالات کی نزاکت کے پیش نظر سامنے نہیں لائے جاسکے تھے، ان چوٹی کے بزرگ ترین علمائے ارکان میں ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید الامین صاحبؒ سر فہرست تھے۔ ان دونوں مذکورہ بزرگوں کے علاوہ اور دو شخصیتیں بھی تھیں، ان میں سے ایک حضرت مولانا سلطان احمد صاحبؒ بانی مدرسہ دارالعلوم میاں جان پور اور دوسرا حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب گرھا خالویؒ۔ تو ظاہر ہے کہ اس وقت یہ سارے حضرات حین حیات تھے، اسی لئے ان کے اسمائے گرامی کا تذکرہ اس زمانے میں ممکن نہیں ہوسکا تھا، آج کل تو سارے کے سارے وہ بزرگان دین متین اس جہان فانی سے رخصت لے چلے اسی لئے ان کے نام گرامی کا تذکرہ ممکن ہوسکا۔ یاد رہے کہ سرزمین ارکان کے یہ وہ بزرگان دین تھے، جنہیں اپنے زمانے میں مرجعیت کا درجہ حاصل تھا۔ اور تو اور انہیں ہمارے بعض حلقوں نے "مشائخ اربعۃ" کا نام بھی دیا تھا۔

اب ان تمام باتوں سے کیا پتہ چلتا ہے؟ یہی ہے نا کہ علمائے ارکان ایک طرف جمعیت علمائے اسلام ارکان کے پرچم تلے ممکنہ خدمات اندرون ارکان میں بھی انجام دے رہے تھے، تو دوسری طرف انہوں نے زیر زمین ایک انقلابی جماعت کی بھی سرپرستی کی تھی، مگر یہاں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ علمائے اسلام ارکان کی یہی سرپرستی روہنگیا فدائین محاذ پر تادیر نہیں رہ سکی تھی، اور ۱۹۷۸ء کے بعد ہماری زیر زمین سیاست نے اور ایک انگڑائی لی تھی، جس کا قدرے اجمال راقم سطور کی مذکورہ تالیف کے اس اقتباس میں ملاحظہ کیجئے:

"۱۹۷۵ء سے لے کر ۱۹۷۸ء تک ارپی مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی قومی سطح پر

جہاد کی خدمات انجام دے رہی تھی۔ ادھر ۱۹۷۸ء کو بڑی تعداد میں روہنگیا مہاجرین بنگلہ دیش پہنچے تو ادھر ار پی ایف میں بھی سیاسی رسہ کشی شروع ہوگئی تھی، جمعیت علمائے اسلام ارکان کے ارباب بست وکشاد نے ار پی ایف کے لیڈروں کے درمیان ہونے والی رشہ کشی کو ختم کرانے کی کوشش کی، مگر ان کی تمام کوشش آخرکار ناکام ہوگئی تھی، بالآخر جناب نور الاسلام، ڈاکٹر محمد یونس، پردفیسر محمد زکریا سمیت بہت سے لیڈران ار پی ایف سے نکل بھاگے۔ اور آگے چل کر مولانا محمد کبیر اور ان کے ہم خیال چند حضرات بھی ار پی ایف سے بچھڑ گئے تھے، اب جمعیت علماء نے ہر مرحلہ میں خود کو نامراد اور ناکام پایا تو اپنی تئیں مسلّح ہونے کو مناسب سمجھا تھا، یوں مولانا عبد القدوس مظاہری کے اشراف اور مولانا عقیل احمد قاسمی کی صدارت میں ۱۹۷۹ء میں جمعیت علمائے اسلام ارکان کی مسلّح جد جہد کا آغاز ہوا تھا"۔

اب یہاں جمعیت علمائے اسلام ارکان کا ایک گروپ مسلّح ہوجانے اور زیر زمین چلے جانے کے بعد بظاہر یہ معلوم ہورہا تھا کہ اب جمعیت علمائے اسلام ارکان دو گروپوں میں تقسیم ہوگئی ہے، مگر حقیقت میں بات ایسی نہیں تھی، ارباب جمعیت کی حکمت وبصیرت تھی کہ انہوں نے ایک طرف اندرون ارکان میں بھی کسی نہ کسی حد تک جمعیت کی ساکھ کو بحال رکھا، اور ساتھ ہی ساتھ اپنی جماعت کی ایک خاص تعداد کو بھی زیر زمین پہنچا کر انقلابی سرگرمی کا آغاز کر دیا تھا۔ اللہ تعالی حضرت مولانا عبد القدوس صاحب مظاہری رحمہ اللہ اور حضرت مولانا عقیل احمد قاسمی رحمہ اللہ کے درجات بلند فرمائے، دونوں کے دونوں بزرگ بڑے جید علمائے ارکان میں شمار تھے، ایک قاسمی دوسرے مظاہری، بڑے دور بین، حساس، فعال اور صاحب حماست وبصیرت لیڈر تھے، یہ اور ان کے رفقائے کار نے ہر ممکنہ کوشش کی تھی کہ جمعیت علماء اسلام کے زیر سائے سرزمین ارکان اور وہاں کے مظلوم مسلمانوں کو ظالموں کی چنگل سے نجات دلائیں۔ مگر کیا کہوں کہ ان کا ایک قصور علماء ہونا تھا، ظالموں نے اپنے مشترکہ دشمن سے لڑنے کے بجائے اپنے خیر خواہ علماء کا تعاقب کیا، ظالم دشمن سے کیا خاک لڑتے، انہوں نے اپنی

ساری توانائیوں کو علماء کے تعاقب میں صرف کر دیا تھا۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

جمعیت علمائے اسلام کے قائدین بڑے دور اندیش اور بڑے فراخ دل تھے، بظاہر یہ تو دیکھا جارہا ہے کہ یہ علمائے اسلام کی ایک جماعت ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی تاسیس سے لے کر ہر دور میں اس میں بڑی تعداد میں دانشوران بھی شامل تھے، مثال کے طور پر سلطان احمد صاحب بالوکھالوی کو دیکھئے ۱۹۴۷ء میں منگڈو اور بوسیدنگ کے دو پارلیمنٹ ممبروں میں سے ایک آپ ہی تھے، اور دوسرے ایک عالم دین حضرت مولانا عبد الغفار صاحب رنگیادنگی۔ ادھر جمعیت علمائے اسلام مسلّح ہوجانے کے بعد اس میں شامل دیگر دانشوروں کا کیا شمار، صرف مجلس عاملہ کے دس اراکین میں سے تین حضرات کا شمار سرزمین ارکان کے بلند نگاہ اعلی دانشوروں میں سے تھا:

(۱) مشرف اعلی : حضرت مولانا عبد القدوس صاحب مظاہریؒ۔ وفات کراچی۔

(۲) صدر : حضرت مولانا عقیل احمد قاسمی رحمہ اللہ۔ وفات کاکس بازار۔

(۳) سکرٹری **جنرل** : حضرت مولانا قاری بدر الاسلام صاحبؒ بن حضرت مولانا زین العابدین صاحبؒ۔

(۴) نائب سکرٹری : جناب سیّد لطیف پوئما لوی۔ (دانشور)۔

(۵) خازن : حضرت مولانا کرامت علی صاحب۔ مقیم حال کاکس بازار۔

(۶) رکن : حضرت مولانا محمد حنیف راغب صاحب فرندگی۔

(۷) رکن : جناب شہید لطیف بلی بازاری (دانشور)۔

(۸) رکن : جناب شاہِ عالم صاحب مرحوم (دانشور)۔

(۹) رکن : حضرت مولانا مفتی عبد الشکور صاحب۔

بات صرف اتنی سی کہہ کر ختم نہیں ہوجاتی، جمعیت علمائے اسلام کے عہد ہائے جلیلہ تو صدر اور ارکین عاملہ سنبھالتے تھے، جب کہ چیف آف اسٹاف جیسے حساس عہدہ پر ایک ارکانی دانشور کو فائز کیا گیا، جن کا نام مایورے رشید (بامونگ) تھا۔ چند سال پہلے رشید صاحب کا انتقال کاکس بازار میں ہوگیا، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ ایک افسانوی زندگی کے حامل دانشور تھے، اللہ تعالی ان کو درگزر

فرمائے۔آمین

بہر حال جمعیت علمائے اسلام ارکان جواب مسلّح ہوچکی تھی نے بنگلہ برما سرحد پر ریزو کے مقام میں ایک معسکر بنایا تھا، جہاں رشید صاحب کی قیادت میں مجاہدین اسلام منتظر فرداتے ۔ چونکہ جمعیت علمائے اسلام ارکان مسلمانان ارکان کو بیدار کر کے جہاد میں اتارلانے کے ساتھ ساتھ ارکانی مگھوں سے مل کر سرزمین ارکان کو برمی غاصبوں سے مکمل آزاد کرنے کی خواہش مند تھی ، اسی لیے نیون حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے والی غیر مسلم تنظیموں سے متحد ہوجانے کو مناسب سمجھا تھا، اب تنظیم نے دیکھا کہ ان مسلح جدوجہد کرنے والی جاعتوں میں برما کمیونسٹ پارٹی (BCP) ہر اعتبار سے بقیہ تمام تنظیموں سے آگے ہے، تو جمعیت نے بی سی پی سے ایک معاہدہ کرلیا، اور بی سی پی نے بھی جمعیت علمائے اسلام جیسی ایک تنظیم کو پا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ یوں بی سی پی نے جمعیت کو بیس رائفل، تین ہلکے مشین گن، تین روسی ساخت کے اسٹین گن اور دو پستول سے تعاون کیا تھا۔

اسی طرح جمعیت علمائے اسلام نے دیگر مگھ تنظیموں سے چند معاہدے کر لئے تھے ۔ جن میں رامالا پا نامی تنظیم قابل ذکر ہے ۔ باوجودیکہ یہ سارے معاہدے سرد خانے کے شکار ہو گئے، مگر بی سی پی کے تعاون سے جمعیت علماء ایک مسلح گروپ یا جماعت میں تبدیل ہوچکی تھی ، جمعیت علمائے اسلام حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہریؒ کی ہجرت پاکستان کے بعد مولانا عقیل احمد قاسمیؒ کی زیر قیادت منزل کی طرف رواں دواں تھی ۔ مگر بڑی حد تک مالی کمزوری کی شکار تھی ، اور آگے چل کر اس کم زوری نے ایک بحران کی حالت اختیار کر لی تھی ۔ مولانا عقیل احمد قاسمی سمیت تنظیم کے بڑے بڑوں نے ہر چند کوشش کی تھی کہ کسی بھی طریقے سے تنظیم کو اس مالی بحران سے بچایا جا سکے ۔ مگر ساری کوششیں ایک طرح کی رائگاں گئیں ، ایسے حالات میں چیف آف اسٹاف جناب رشید بامونگ صاحب نے مولانا عقیل صاحب سے تنظیم کو جلد از جلد مالی بحران سے نکال باہر کرنے کا بھرپور مطالبہ کر دیا تھا، مولانا اوران کے رفقائے کار نے ہر چند کوشش کی، مگر ضرورت کی حد تک رشید صاحب کے مطالبہ کو پورا نہ کیا جاسکا، اتنی مصیبت اور آزمائش کے دوران بھی مولانا عقیل اور ان کے رفقائے کار نے ہمت نہیں ہاری اور تنظیم رینگتی رگڑتی ۱۹۸۵ء کے اواخر تک پہنچی ۔ اور تنظیم کے ایسے حالات پر راقم سطور کا ایک

ریمارکس ملاحظہ کیجئے کہ :

’’ادھر ہمارے تجربہ اور مطالعہ نے ایک بات سورج کی طرح عیاں کر دی ہے کہ ہماری تاریخ جہاد میں دیکھا گیا کہ جبھی منظمات مالی بحران کی شکار ہوجاتیں تو یہاں افراتفری، پہلوتہی اور بغاوت کو سر اٹھانے کا موقع ہوجاتا۔ باوجودیکہ ارکان کی جہادی تاریخ میں سوائے دو ایک نام نہاد منظمات کے ہر تنظیم کی بنیاد اخلاص و للّٰہیت پر پڑی تھی، مگر ان اخلاص وللّٰہیت کی بنیاد پر بنائی گئی تنظیم میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ حرص وجاہ طلبی جیسی مہلک اور جان لیوا بیماری رونما ہوگئی تھی ۔ بالآخر نہ صرف افراد بلکہ تنظیم بھی خود خلوص وللّٰہیت کی دنیا سے سر موانحراف کر کے مادیت کی دنیا میں قدم رکھ دی ، بالآخر بات یہاں تک پہنچ جاتی تھی کہ مال وجاہ ہے تو سب کچھ ہے، نہیں ہے تو دین دھرم عقیدہ و مذہب سب کو نیلام کر دینے میں کوئی بھی کسر باقی نہیں ہوتی ، جس کے نتیجے میں کبھی بغاوت نے سر اٹھایا تو کبھی نافرمانی نے حملہ کر دیا، کبھی باہم ٹکراؤ اور قتل وخون کا عالم ہوا تو کبھی ناز یبا حرکات وسکنات کی روایات قائم ہوئیں ، آخر کار نہ صرف تنظیم ختم ہوئی بلکہ دین و مذہب اور قوم وملت کے تمام مسائل دھرے کے دھرے رہ گئے ، ویسے جمعیت علماء کو بھی مالی بحران کے گھن نے اندر ہی اندر کھا کر کھوکھلا بنا دیا تھا‘‘ ۔

ہر چند کوششوں کے باوجود تنظیم کو مالی بحران سے نکالا نہ جاسکا، یوں ۱۹۸۶ء کے اواخر میں رشید بامونگ صاحب نے اپنے تمام رفقاء اور ہم نوا سمیت قائدین سے بغاوت کی ، اور تنظیم کو کالعدم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی تھی ۔ اور اگلے سال ، ۱۹۸۷ء کی ابتدا میں محترم نور الاسلام صاحب کے ارسی او گروپ اور مرحوم شبیر حسین صاحب کے ار پی ایف گروپ کے متحدہ محاذ (ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ ARIF) سے رشید صاحب نے بھی انضمام کر لیا تھا۔ یوں جمعیت علمائے اسلام کی مسلح جدوجہد تھم گئی تھی ۔ رشید صاحب اس اسلامک فرنٹ میں چند سال رہے، بعد میں وہ RLO سے منسلک ہو گئے تھے ۔ اور یہاں بھی جب بغاوت اور نافرمانی شروع ہوگئی تو انہوں نے

اپنی جان بچا کر راہ فرار اختیار کی۔اس کے بعد وہ بنگلہ دیشی خفیہ ایجنسی سے منسلک ہو گئے۔اور مرتے دم تک اس کے کارکن رہے تھے۔

جمعیت علمائے اسلام ارکان اور کونسل برائے امور دینیات کے حوالے سے اتنے طول طویل معروضات سے ہمارا ایک مقصد بھی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت مولانا سید الامین صاحب اندرون ارکان میں اپنی مستعار زندگی کے آخری دم تک ان دونوں تنظیموں کے سر پرست رہ چکے تھے۔اور ساتھ ہی ساتھ جمعیت علمائے اسلام ارکان کی مسلح جماعت کے بھی مشیر اعظم، صرف یہ نہیں بلکہ اگر چہ جمعیت علمائے اسلام کی مسلح جدو جہد ۱۹۸۷ء کے دوران تھم سی گئی تھی، مگر اس تنظیم نے بعد میں دوسری تیسری شکل بھی اختیار کر لی تھی۔ان دوسری تیسری شکلوں سے میرا مطلب حرکۃ الجہاد الاسلامی، اتحاد المجاہدین اور جنود الاسلام وغیرہ اسلامی جماعات ہے، حرکۃ الجہاد الاسلامی کے قائد اعلیٰ حضرت مولانا میر احمد مبارک صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، یہ بھی حضرت مولانا کے دوستوں اور ہم رازوں میں سے تھے، میرے علم کے مطابق حضرت مولانا میر احمد مبارک نے بھی حضرت مولانا سید الامین صاحب کے نیک مشوروں کا بڑا لحاظ کیا تھا۔اسی طرح حضرت مولانا محمد حنیف صاحب راغبؔ فرنگی کی قیادت میں وجود میں آنے والی تنظیم ’’اتحاد المجاہدین‘‘ کا معاملہ بھی ہے، اتحاد والمجاہدین نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ اگر چہ حضرت مولانا بظاہر اس تنظیم کے امیر تھے، مگر ان کی امارت مفوضہ تھی، ان کے مطابق امارت کی باگ ڈور سر زمین ارکان کے چار مشہور و معروف بزرگوں کے ہاتھوں میں تھی، یعنی حضرت مولانا مظفر احمد صاحبؒ (خلیفہ و مجاز بیعت حضرت سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) حضرت مولانا سلطان احمد صاحب بانی دار العلوم میاں جان پور، حضرت مولانا عبد السبحان صاحب گرھا خالوی اور حضرت مولانا سید الامین صاحب منگنماویؒ۔ان چاروں کو ’’مشائخ اربعۃ‘‘ کا نام دیا گیا تھا، جس کا کچھ اجمال پچھلی سطور میں بھی گزر چکا ہے۔تو ظاہر ہے کہ حضرت مولانا سید الامین صاحب جس طرح اندرون ارکان میں جس حال میں بھی کیوں نہ ہوں اسلامی تنظیموں کے سر پرست رہے تھے۔اسی طرح سر زمین ارکان اور وہاں کے مظلوم مسلمانوں کی نجات کے لئے اٹھنے والی ریز زمین اسلامی جماعتوں کے بھی سر پرست رہ چکے تھے۔ان مذکورہ جماعتوں کے علاوہ حضرت مولانا سیف الاسلام

صاحب کی قیادت میں ابھرنے والی تنظیم ’’روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) کا معاملہ مستزاد ہے، حضرت مولانا سے اس تنظیم کے کس طرح خوش گوار تعلقات تھے، اس کا تذکرہ اپنی جگہ پر انشاءاللہ ضرور آئے گا۔

دراصل بات یہ ہے کہ حضرت مولانا جب اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان کی معروف درس گاہ مدرسہ شاہی امروہہ پہنچے، اس زمانے میں علمائے دیوبند کی قیادت میں چلنے والی دو تنظیمیں ’’جمعیت علمائے ہند‘‘ اور ’’جمعیت علمائے اسلام‘‘ برصغیر ہند و پاک کے سیاسی افق پر خاصے کردار ادا کر رہی تھیں، اوّل الذکر تنظیم کی قیادت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے ہاتھ میں تھی تو ثانی الذکر کے روح رواں حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ تھے، مولانا سید الامین نے ان دونوں تنظیموں کی سر گرمیاں اور ان دونوں تنظیموں کی قیادت کے نمایاں کردار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جمعیت علمائے ہند کانگریسی سیاست کی حامی تھی، جب کہ جمعیت علمائے اسلام لیگ کی حمایت میں سر گرداں۔ بعد میں حضرت مولانا سید الامین صاحب تعلیم کے سلسلے میں پاکستان پہنچے تو وہاں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا ظفر احمد عثمانی وغیرہ کی سیاسی سر گرمیوں کو بہت ہی قریب سے دیکھا تھا، چونکہ دونوں تنظیموں کی قیادت علمائے دیوبند سنبھال رہے تھے، تو مولانا نے ان دونوں جماعتوں اور ان کے قائدین کے سیاسی کردار سے یہ تاثر لیا کہ دونوں کے دونوں جماعت اور ان کی قیادت کے مواقف اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ دونوں جماعتوں کی سیاست اس وقت کے حالات کے لحاظ سے صحت پر مبنی تھی، مولانا کی نظر میں نہ جمعیت علمائے ہند کا سیاسی موقف غلط تھا، اور نہ جمعیت علمائے اسلام کی سیاست محل نظر تھی، انہوں نے دونوں کے سیاسی مواقف کو بیک وقت میزانِ اعتدال میں پایا تھا۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ سر زمین ارکان پہنچے تو برما اور ارکان کے اندر بھی ان مذکورہ دونوں تنظیموں کی خوشہ چین دو جماعتیں انہوں نے پائیں۔ایک جمعیت علمائے اسلام اور دوسری کونسل برائے امور دینیات یا امور مذہبی۔اوّل الذکر کا سیاسی تانا بانا جمعیت علمائے اسلام (ہند) سے تھا تو ثانی الذکر کا سیاسی انداز جمعیت علمائے ہند جیسا تھا۔ برصغیر ہند و پاک کی طرح یہاں بھی دونوں جماعتوں کی قیادت مجموعی طور پر علمائے دیوبند کے ہاتھ میں تھے۔ جمعیت علمائے اسلام ارکان اور برما کے سیاسی

موقف وکردار پر راقم سطور کا کوئی کلام نہیں، جس کی قدرے تفصیلات پچھلی سطور میں بھی گزر چکی ہیں، تاہم کونسل برائے امور دینیات پر جہاں تک اطلاعات ہیں، ان کے تناظر میں عرض ہے کہ اگر چہ اس کی قیادت بھی مجموعی طور پر دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے فضلائے کرام کے ہاتھ میں تھی، مگر اس کونسل نے بعض ملّی اور قومی امور میں انحراف سے کام لیا تھا۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ یہ کونسل شروع ہی سے حکومت برما کی وزارت برائے امور مذہبی کے زیر اثر یا زیر سرپرستی رہ چکی تھی، اسی لئے ہوسکتا ہے کہ اس انحراف میں اس کی خاص مجبوریاں بھی اور معذوریاں بھی رہ چکی ہوں۔

پھر جہاں تک پتہ چلا کہ ان دونوں جماعتوں کے تصورات میں اپنی اپنی تاسیس کے زمانے سے اونو کے جمہوری دور حکومت کے واخر تک بڑی وسعت اور ایک معنی میں آفاقیت تھی۔ اس آفاقیت وسعت کی بنیاد پر خاص طور سے جمعیت علمائے اسلام نے بڑی بڑی دینی اور قومی خدمات انجام دی تھیں۔ مگر ملک پر فوجی ڈکٹیٹر نیون کے تسلط یعنی ۱۹۶۲ء کے بعد دونوں کی دونوں جماعتوں کی سرگرمیاں بالکل محدود ہوگئی تھیں۔ بس مسلمانوں کے چند عائلی یا معاشرتی امور تک ان کی سرگرمیاں تھیں۔ ویسے برما بھر کی بات میں نہیں کہہ سکتا، یہاں ارکان میں دیکھا گیا تھا کہ مسلمانوں کے عائلی یا معاشرتی امور کے حوالے سے کوئی مسئلہ درپیش ہوا تو دونوں جماعتوں کے اصحاب حل وعقد نکل پڑتے۔ اور دونوں طرف سے فتاوی بازی کے ادوڑ شروع ہوجاتے۔ چونکہ حضرت مولانا سید الامین رحمۃ اللہ علیہ سرزمین ارکان میں ان دونوں جماعتوں کے بیک وقت سرپرست رہ چکے تھے۔ ویسے ان کو بھی اس طرح کے فتوی بازی کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ مگر حضرت مولانا نے ہر موقع پر ثابت کیا تھا کہ آپ ایک حاضر دماغ عالم دین، مصلح وقت اور معاملہ فہم انسان تھے۔ ان کی سرپرستی کے دور آخر میں اس قسم کے چند امور ان کے سامنے آئے تھے، جن میں سے ایک عیدگاہ کی سنگار کا مسئلہ تھا۔ موافقین اور مخالفین نے فتوے بازی کا ایک زوردار دوڑ چلایا، یہ مولانا کی معاملہ فہمی تھی کہ انہوں نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو فتنے اور باہمی رسہ کشی سے بچایا۔ جس کے متعلق کچھ معروضات اپنی جگہ پر ملاحظہ فرمائے ہوں گے !

اب گئے گزرے تمام معروضات کے آخر میں حضرت مولانا رحمہ اللہ کے ان دونوں جماعتوں کے

ساتھ کس قدر خوش گوار تعلقات تھے، اور ان دونوں جماعتوں کی اعلی قیادتیں آپ کو کس نظر سے دیکھتی تھیں، ان ساری باتوں کے متعلق فاضل گرامی مولانا شبیر احمد صاحب کا بیان ملاحظہ کیجئے :

"جمعیت علمائے اسلام ارکان اور کونسل برائے امور مذہبی دونوں میں آپ کے خاصے مثبت کردار رہے تھے، جمعیت علمائے اسلام میں جس زمانے میں حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب مرحوم صدر تھے اور حضرت مولانا ابوالحسین صاحب عرب شاہ پاروی **جنرل** سکرٹری، دونوں حضرت مولانا کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کسی بھی اہم امور میں حضرت کے مشورے کے خواستگار ہوتے تھے، اور کسی بھی اہم مسئلے میں آپ کی طرف ضرور رجوع کیا کرتے تھے۔ اور آپ بھی بڑے عادلانہ اور لطیف انداز میں شرعی مسئلہ حل فرمادیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ عوام الناس کی نظر میں آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم دین تھے اور جو حقیقت بھی ہے، تو عوام کی نظر میں کسی شرعی فیصلہ کے کاغذ میں حضرت کا دستخط ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت مولانا کے مخالف کسی عالم کا فتوی منافی شریعت اسلامی ہے۔
اسی طرح کونسل برائے امور مذہبی اور اس کے ارباب حل وعقد سے بھی آپ کے خوش گوار تعلقات تھے، آپ جمعیت علمائے اسلام کی طرح اس کے بھی سرپرست تھے، محترم ڈاکٹر نور الحق صاحب جو عرصہ دراز سے اس کونسل کے صدر ہیں، ان کی برتاؤ حضرت مولانا سے ایک سگا بڑا بھائی جیسی تھی۔ کسی بھی مسئلہ کا فیصلہ حضرت کے فیصلہ کے بغیر صادر نہیں کرتے تھے۔ حضرت مولانا نے اس جماعت کے اثر ورسوخ کو استعمال کرکے بڑے بڑے فتنوں کا سد باب بھی کیا تھا، بعض لوگوں اور بعض حلقوں سے مناظرے اور مقابلے بھی ہوتے رہے، مگر ہر کہیں اللہ تعالی کے فضل وکرم سے جیت آپ کی ہوئی تھی اور آپ نے مخالفین کی دھجیاں اڑادی تھیں"۔

زیرزمین کام کرنے والوں کے ساتھ مولانا کا خوش گوار رابطہ :

اہل فکر ودانش کے سامنے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ سرزمین ارکان کے مسلمانوں کی باضابطہ تحریک

آزادی ۱۹۴۷ء سے شروع ہوئی تھی، جس کا بانی ومحرک حضرت جعفر حسین قوال تھے، ۱۹۵۱ء میں حضرت قوال کی شہادت کے بعد یہ تحریک دومختلف گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی، ان میں سے ایک کا قائد حضرت محمد عباس صاحب سینڈنگی تھے تو دوسرے کی قیادت مرحوم محمد ابوالقاسم راجا نے سنبھالی تھی۔ ان دونوں حضرات کے بعد یہ تحریک کئی دھڑوں میں تقسیم ہوگئی تھی، بالآخر محمد جعفر ثانی کے دور قیادت میں اس تحریک میں قدرے جان سی آ گئی تھی، جس میں حضرت جعفر حبیب رحمہ اللہ بھی بنفس نفیس شریک وسہیم تھے، اورعرصۂ دراز تک اس تحریک نے خاصے قومی وتحریکی کام سرانجام دیئے تھے۔

۱۹۷۰ء کے بعد اس تحریک کی قیادت جعفر حبیب مرحوم نے سنبھالی تو سرزمین ارکان کے علماء اور دانشوران کی ایک بھاری اکثریت نے ان کا ساتھ دیا تھا، اور بہتوں پڑھے لکھے لوگ روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔ جن میں حضرت مولانا محمد کبیرؒ، حضرت مولانا شفیق احمدؒ، محترم نورالاسلام صاحب، ڈاکٹر محمد یونس، مسٹر حبیب الرحمن، مسٹر محمد علی، ایم پی اظہار وغیرہ جیسی شخصیات قابل ذکر ہیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد اس مذکورہ تحریک کے ساتھ ساتھ ارکان کے بعض دوراندیش، مبصر جید علمائے کرام نے بھی ''جمیعۃ علمائے اسلام'' نامی ایک جماعت کے سائے تلے جمع ہوکر مسلح جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا، جس کے سرخیل ورہنما حضرت مولانا عبداللہ وس مظاہریؒ اور حضرت مولانا عقیل احمد قاسمیؒ تھے، اگرچہ بعد میں علمائے کرام کی اس جماعت نے بعض وجوہات کی بناء پر دم توڑ دی تھی مگر کئی سال گزرتے نہ گزرتے دیگر علماء کرام بھی میدان جہاد وقتال میں آ نکلے تھے، جن میں حضرت مولانا میر احمد مبارکؒ، حضرت مولانا محمد حنیف راغبؔ، مولانا عبدالقدوس مجاہد وغیرہ ناقابل فراموش شخصیات ہیں، تحریک آزادی کی تفصیلات اگر دیکھنی ہوں تو راقم سطور کی تالیف ''سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں'' دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد حضرت مولانا سید الامین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سرزمین ارکان میں علمائے اسلام میں ستاروں کی محفل میں آفتاب ومہتاب بنے ہوئے تھے۔ اگرچہ بظاہر مولانا درس تدریس، تعلیم وتعلم کی کرسی پر براجمان تھے، مگر اندر ہی اندر تحریک آزادی کے حوالے سے کام کرنے والوں کے ساتھ ان کا

رابطہ ہمیشہ استوار رہا تھا، حضرت مرحوم جعفر حبیب اور ان کی جماعت کو ہمیشہ ضروری مشورے سے نوازا تھا۔ محترم نورالاسلام والی جماعت ''ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) سے حضرت مولانا کا رابطہ بہت ہی کم رہا، لیکن دوسری طرف روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) سے حضرت مولانا کا گہرا رابطہ رہا تھا، خصوصی طور پر مولانا سیف الاسلام، مولانا شیخ دین محمد مرحوم اور مولانا شیخ سلیم اللہ عبدالرحمن کے ادوار قیادت میں ایک حیثیت سے مولانا سید الامین آر ایس او کے پیشوا بنے ہوئے تھے، چوں کہ ظاہر ہے کہ موخر الذکر تینوں حضرات مولانا کے تلامذہ میں سے تھے، اس لئے بھی مولانا سے ان حضرات کا رابطہ ہمیشہ سے رہ پایا تھا، جو بہت ہی خوش گوار تھا۔

مولانا سلیم اللہ عبدالرحمن کے بعد روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن کا صدر ڈاکٹر دین محمد صاحب بنے تو ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود مولانا کے صاحب زادہ ہیں، تو ظاہر ہے کہ مولانا کا نیک مشورہ اس جماعت کے لئے حرف آخر کی طرح ہو چکا تھا۔

جہاں تک معلوم ہوا حضرت مولانا میر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور قیادت میں اندرون وطن میں حضرت مولانا سید الامین صاحب ''حرکۃ الجہاد الاسلامی'' کے روح رواں تھے۔ مولانا میر احمد صاحب ہر ایک بنیادی کام میں مولانا کے مشورے کو بڑی ضروری سمجھتے رہے تھے، مولانا میر احمد مبارک صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا سید الامین صاحبؒ کے ہم عصروں میں ایک ممتاز عالم دین اور خادم ورہنمائے قوم گزرے۔

مولانا عبدالقدوس مجاہد وغیرہ کو مولانا نے اپنے مشورے سے نوازا تھا، اور مولانا محمد حنیف راغبؔ صاحب کے دور قیادت میں تو مولانا راغب صاحب نے ''مشائخ اربعہ'' کا ڈھنڈورا پیٹ دیا تھا۔

مشائخ اربعہ سے ان کا مطلب حضرت مولانا سید الامین سمیت اور تین ارکان کے اس وقت کے جانے مانے علماء تھے:

(۱) حضرت مولانا پیر مظفر احمد صاحب مینگزویؒ۔

(۲) حضرت مولانا مفتی سلطان احمد صاحب ریدویؒ۔

(۳) حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب گرھاخالوی۔

تو ظاہر ہے کہ مولانا سید الامین صاحبؒ کا رابطہ زیر زمین کام کرنے والوں کے ساتھ کتنا گہرا رہ چکا تھا۔ اس حوالے سے اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں جتنا لکھا جا چکا ہے، اہل علم وفکر کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

جماعت تبلیغ اور اس کے ساتھ مولانا کا تعامل :

جماعت تبلیغ کی دنیا میں اتنی شہرت ہے کہ شاید دنیا میں خاص طور پر دور آخر میں کسی جماعت نے اتنی شہرت پائی ہو، اور جہاں تک راقم سطور کا اندازہ ہے، جماعت تبلیغ دنیا کی تاریخ میں افرادی اعتبار سے دنیا کے سب سے بڑی جماعت ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اس جماعت کا مؤسس اور محرک اول حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالی تھے، حضرت مولانا ایک عالم باعمل ہونے کے علاوہ اللہ تعالی نے معرفت و روحانیت اس کے ساتھ امت اور انسانیت کی اصلاح اور خیر خواہی کا مادہ ان کے اندر کوٹ کوٹ بھر دیا تھا۔

ان کے بعد ان کے صاحب زادۂ گرامی قدر حضرت مولانا یوسف کاندھلویؒ اس جماعت کے رہنما بنے، حضرت ایک جلیل القدر عالم دین ہونے کے ساتھ باصلاحیت منتظم بھی تھے۔ ان میں امت کی اصلاح کی بڑی تڑپ تھی، انہی کی زندگی میں یہ جماعت نہ صرف برصغیر بلکہ دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئی تھی۔

ان کی رحلت کے بعد حضرت جی حضرت مولانا انعام الحسنؒ نے اس جماعت کا مرکزی پتوار سنبھالا تھا، پھر ان کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا صاحب زادۂ گرامی حضرت مولانا زبیر صاحب اس جماعت کے مرکزی امیر اور رہنما بنے۔

اللہ تعالی نے اس جماعت کو دنیا بھر میں مقبولیت عطا کی، صرف چند بے لگام جماعتوں کے علاوہ کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی، ساتھ ساتھ شروع ہی سے بطور خاص برصغیر پاک و ہند کے بڑے بڑے علماء دین و ملت نے اس جماعت کا ساتھ دیا، ان میں سے حضرت مولانا زکریا صاحب کاندھلویؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا منظور احمد صاحب نعمانیؒ، حضرت مولانا عمر احمد صاحب پالنپوریؒ، حضرت مولانا احمد لات صاحب ندوی نا قابل فراموش اور قابل ذکر شخصیات ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سرزمین ارکان میں اس جماعت کی دعوت اس جماعت کے ابتدائی زمانے میں پہنچی تھی، پھر بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ارکان میں سب سے پہلے اس جماعت کا داعی حضرت حاجی محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ تھے، اور بعض دوسرے حضرات کا بیان ہے کہ اس جماعت کی دعوت لئے سب سے پہلے حضرت مولانا بیرسٹر محمد ثناء اللہ صاحب رنگیا ڈنگی بوسیدنگ پہنچے تھے۔

اللہ تعالی نے اس جماعت کو دنیا بھر کے دوسرے علاقوں، خطوں اور ملکوں کی طرح سرزمین ارکان میں بھی بڑی مقبولیت عطا کی ہے، دور آخر میں اور آج کے بھی اس سرزمین کے سارے حقّانی علمائے کرام اور عوام الناس اس جماعت کے شیدا ہیں۔

ارکان میں گئی صدی کی آخری دہائیوں میں ہر کجا اس جماعت کی ریل پیل تھی۔ میری معلومات کی حد تک اس سرزمین میں سالانہ اجتماع علی چنگ بوسیدنگ میں اس جگہ منعقد ہوتا تھا، جہاں صدیوں سے بلی کھیلا نامی ایک میلہ لگتا رہتا تھا، اس اجتماع میں ارکان اور برما کے گوشے گوشے سے عوام الناس آتے ، ہم نے اپنے بچپن میں اس قسم کا اتنا بڑا دینی اجتماع یہاں کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھا تھا، یہ اجتماع ۴ / اپریل سے لیکر ۷ / اپریل یعنی تین روزہ ہوتا تھا، جس میں ارکان اور برما کے بڑے بڑے دعاۃ آتے اور اپنے نورانی خطاب سے لوگوں کے دلوں کو مسحور کرتے تھے۔ ان دعاۃ میں حضرت مولانا محمد صالح صاحب رنگوئیؒ، مولانا فیض الاسلام تنگ بازاریؒ، مولانا عبدالقدوس نلبیلویؒ، مفتی زین العابدین صاحبؒ، مولانا خیر البشر صاحب منگڈوی، مولانا محمد طاہر صاحب بارنگیا ڈیلوی، اور مولانا ابو طاہر صاحب بوسیدنگی اور مولانا عبدالغفار صاحب منڈوی قابل ذکر علماء اور دعاۃ تھے۔

اس مذکورہ اجتماع کے علاوہ اور دو اجتماع میں نے اپنے لڑکپن کے زمانے میں دیکھے تھے، ان میں ایک اجتماع جنوبی منگڈو کی قادر بیل نامی بستی میں منعقد ہوا جبکہ دوسرا اجتماع شمالی منگڈو کی نامور بستی خیر پارہ میں منعقد ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ موخر الذکر اجتماع میں پہلی مرتبہ میں نے حضرت مولانا سید الامین صاحب سے ملاقات کی تھی، ان کے علاوہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ کو دیکھا بھی تھا اور ان کی تقریر بھی سنی تھی۔

مولانا سید الامین صاحب رحمۃ اللہ تعالی جماعت تبلیغ کو بحیثیت ایک دینی، ایمانی، دعوتی اور اصلاحی

جماعت کے بڑی مفید جماعت تصور کرتے تھے، یوں تو آپ جلیل القدر عالم دین، مدرسہ کے استاد اور شیخ تھے، اس لئے بذات خود اس جماعت کی سرگرمیوں میں بہت کم شرکت کر سکتے تھے، البتہ موقع بموقع اس جماعت کے دینی اجتماع میں بذات خود اپنے تلامذہ ومتعلقین سمیت شریک ہوا کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے تلامذہ اور متعلقین ومنتسبین کو اس جماعت میں شریک ہونے کی تلقین بھی کیا کرتے تھے۔

آج کل تو اس جماعت پر برمی ظالم فوجی بر برحکومت کی طرف سے پابندی لگ چکی ہے، اور تو اور ۲۰۱۲ء میں آٹھ دس داعیوں کو تنگوب کے مقام پر شہید بھی کر دیا گیا تھا۔

غرض یہ کہ مولانا مرحوم زندگی بھر جماعت تبلیغ کے خیر خواہ رہے، اور اس جماعت کی ترقی اور کامیابی کے لئے کوشاں بھی رہے تھے، اللہ تعالی حضرت کی ان کاوشوں کو قبول کرے۔ آمین

جماعت اسلامی کے ساتھ مولانا کا طرز عمل:

گئی صدی کی آٹھویں دہائی کی ابتدا میں جماعت اسلامی کی دعوت ارکان میں بھی پہنچی تھی، اس سے پہلے اگرچہ ہندو پاک اور بنگلہ دیش کے دینی مدارس سے فراغت حاصل کر کے انگنت ارکانی طلبہ ارکان میں پہنچے تھے، مگر کسی نے بھی جماعت اسلامی کی دعوت کے سلسلے میں کام نہیں کیا تھا، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے مدارس سے فارغ ہونے والے طلباء ارکانی پر میرا اتنا خیال ہے کہ یہاں سے فارغ ہونے والے طلباء جماعت اسلامی کی دعوت سے کوئی بھی متاثر نہیں ہوئے تھے، رہا پاکستان سے فارغ ہونے والے طلباء میں چند افراد اس دعوت سے ضرور متاثر ہوئے اور اس دعوت کو سرزمین ارکان میں پہنچانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ جن میں مولانا سیف الاسلام صاحب شرف الدین بیلوی سابق امیر روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) قابل ذکر ہیں۔

مولانا سیف الاسلام صاحب حضرت مولانا سید الامین صاحب کے تلامذہ میں سے ہیں، انہوں نے اعلی تعلیم کے حصول کے لئے پاکستان کا سفر کیا، بعد میں جماعت اسلامی پاکستان کے مرکز لاہور میں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی، عرصۂ دراز کے بعد آپ پاکستان سے سعودی عرب گئے، اور ۱۹۸۲ء کے بعد روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن سے منسلک ہوگئے تھے۔

۱۹۸۴ء کے بعد ارایس او دو دھڑوں میں بٹ گئی تھی، ان میں سے ایک دھڑے کا صدر محترم نور الاسلام

تھے، اور دوسرے دھڑے کے امیر مولانا سیف الاسلام صاحب۔ اول الذکر دھڑا تو بعد میں ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کی شکل اختیار کر گیا تو موخر الذکر دھڑا نے جماعت اسلامی کے ساتھ باضابطہ رشتہ استوار کر لیا تھا، جس کا سرخیل جس طرح عرض کی گئی ہے کہ مولانا سیف الاسلام تھے۔

مولانا کی قیادت اور جماعت اسلامی کے تعاون سے (RSO) نے دینی، دعوتی، اصلاحی، جہادی اور تربیتی جیسے میدانوں میں خوب خوب ترقی کی تھی، جس کی ایک طویل تاریخ بھی ہے، اس جماعت کی سر گرمی اور کارگردگی پر مشتمل اگر کچھ تفصیلات دیکھنی ہوں تو راقم سطور کی تالیف ''سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں'' دیکھی جا سکتی ہیں۔

بہر حال مولانا محترم کی قیادت میں چلنے والی مذکورہ پارٹی کے واسطے سے جماعت اسلامی کی باضابطہ دعوت سرزمین ارکان میں پہنچی، ارکان کے علمائے کرام کی ایک جماعت نے اس دعوت کو لبیک کہا تھا، جن میں حافظ حبیب اللہ سنبوی مرحوم اور مولانا ابوالفیاض دامن کھالوی، مولانا شیخ دین محمد مرحوم سابق صدر روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پھر یہ ایک قابل ذکر بات ہے کہ مؤخر الذکر اس تنظیم کے یکے بعد دیگرے تین تین صدور مولانا سید الامین صاحب کے تلامذہ اور خوشہ چین تھے، مولانا سیف الاسلام صاحب کے بعد مولانا شیخ دین محمد کے علاوہ مولانا شیخ سلیم اللہ عبد الرحمن مرنگلوی یکے بعد دیگر اس تنظیم کے صدر رہ چکے ہیں۔

بہر حال روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن کا جماعت اسلامی سے منسلک ہونے کے بعد جماعت اسلامی کے دینی، فکری، دعوتی اور تربیتی پروگراموں کا انتھک سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بنگلہ دیش میں زیر تعلیم روہنگیا طلباء کے علاوہ اندرون وطن سے طلباء اور مدرسین وعلماء کی ایک بڑی جماعت نے اس کے ان پروگراموں میں شرکت کی تھی۔

ارکان میں جماعت اسلامی کی دعوت پہنچی تو یہاں بھی مخصوص طور پر علمائے دیوبند کے خوشہ چینوں اور جماعت اسلامی کے افکار ونظریات سے متاثر داعیوں کے درمیان مخاصمت اور اختلافات رونما ہو چکے تھے۔ جس کی ایک تفصیلی داستان ہے، مولانا عبد السبحان صاحب گرہا خالوی اگرچہ جماعت اسلامی اور اس کے مؤسس مولانا سید ابوالاعلی مودودی رحمۃ اللہ تعالی اور ان کی لٹریچر اور دعوت سے سخت متنفر تھے، لیکن چونکہ کم

سے کم جنوبی منگڈو میں جتنے دعاۃ جماعت اسلامی کے پہنچے تھے،تقریباً سب کے سب ان کے تلامذہ اور متعلقین تھے،توانہوں نے حالات کا تقاضا اور وقت کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ان دونوں گروپوں کے درمیان پائے جانے والے خلیج کو اور مزید بڑھنے نہیں دیا تھا۔ذیل میں حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب رحمۃ اللہ کے ایک خط کا ایک مختصر اقتباس یہاں پیش کیا جارہا ہے،جس کے سارے مندرجات سے اگر چہ راقم سطور کو کلی طور پر اتفاق نہیں، پھر بھی ایک ضروری اقتباس ہے،شاید اسے اسی کتاب کی اور ایک جگہ میں بھی نقل کیا گیا ہے،جس پر تنقید وتبصرہ،اہل علم ودانش،اور اصحاب فکروخیال کے لئے ہی چھوڑا جارہا ہے۔

"بعض زائغین واہل اہواء نے اصل سے کٹ کر جو الگ الگ راہیں نکالی ہیں، جن کی مثالیں قدیم میں بھی ہیں جیسے معتزلہ،خوارج روافض وغیرہ،ان کی مکمل تاریخ کتابوں میں مذکور ہے۔اور جدید میں بھی ہیں، جنہوں نے اپنے ذلیل اور دنیا پرستانے اغراض کے ماتحت اپنے زور بیان اور چرپ زبانی سے الگ الگ فرقے بنالئے ہیں،مثلاً مودودیت، پرویزیت،قادیانیت،مہدویت،نیچریت،بہائیتا ور خاکساریت وغیرہ،ان سے ہم اور ہمارے اکابر بالکل بری اور بیزار ہیں۔

شریعت اسلامیہ کے اصول کی روشنی میں ان میں سے بعض کو درجۂ کفر میں اور بعض کو درجۂ فسق میں قرار دیا گیا ہے۔ان کی تصانیف ہم مطالعہ کرتے ہیں، برائے استفادہ نہیں بلکہ برائے تقابل اور انتقاد کے۔چوں کہ آج کل مودودیت کا غلبہ ہے اور بدقسمتی سے کچھ اپنوں کے واسطے سے ہمارے ملک میں آگھسی ہے اور اہل علم کے درمیان اس کا دھوم مچ رہا ہے اس لئے مزید مطالعہ کرتے ہیں،تا کہ سادہ لوح مسلمانوں کو ان کے دام فریب سے بچایا جاسکے۔حاصل مطالعہ کا یہ نکلتا ہے کہ تاریخی اور جغرافیائی معلومات ہیں،اور کچھ ان کے نظریۂ باطلہ،انہی معلومات کے استفادہ کے لئے بحمداللہ ہمارے اکابرین کچھ کم نہیں ہیں، یہ دیس علانیہ کسی کی تردید کانہیں ہے،دوستانہ اور خیرخواہانہ طور پر سمجھانے سے آجائے توفبھا ورنہ "**لکم دینکم ولی دین**"ہے،مزید چھیڑ چھاڑ سے تشتت وتفرق اور دشمنوں کا ناجائز

فائدہ اٹھانے کا اندیشہ ہے، جو ہمارے ذاتی اور وطنی مسئلہ کے بالکل خلاف ہوگا، اللہ تعالی ہم سب کو صحیح عقیدہ کی توفیق عطافرمائے آمین۔" (۱)

مولانا حافظ محمد صدیق مذکورہ خط کے نقل کرنے کے معابعد رقم طراز ہیں کہ :

"قارئین کرام ! سرزمین ارکان شاید دنیا کا وہ واحد خطہ ہے جہاں حنفیت اور دیوبندیت اور تقلید کے سوا کوئی اور فرقہ یا مسلک یا مذہب نہیں ہے،لیکن ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ مودودی کے کچھ لوگ وہاں گئے اور مودودی مذہب کو پھیلانے کی کوشش کی، جو ناکامی سے دوچار ہوئی ، اسی طرح ارکان، برما ، بنگلہ دیش ، ہندوستان و پاکستان کے جو لوگ سعودی عرب میں مقیم ہیں اور ان کی نسلیں وہیں پرورش پارہی ہیں، یہ جاہل اور بے علم لوگ نورائدہ سلفیت اور نام نہاد اہل حدیث سے متأثر ہوکر حنفیت، دیوبندیت،تقلید اور ائمۂ معروفہ کو بے حد برا بھلا کہنے کے ساتھ دیوبندی اکابر کے افکار ونظریات کو بھی طعن وتشنیع کا نشانہ بناتے ہیں" (۲)

مولانا سیف الاسلام،شیخ دین محمد مرحوم دونوں مذکورہ تنظیم کے صدور رہ چکے ہیں،میرے علم کی حد تک مولانا سیف الاسلام صاحب جماعت اسلامی کے حقیقی معنی میں داعی تھے اور ہیں،اور جہاں تک شیخ دین محمد مرحوم کا سوال ہے کہ اگر چہ آپ علمائے دیوبند کے خوشہ چین تھے اور ضرور تھے،لیکن ساتھ ہی ساتھ جماعت اسلامی کی دعوت اور اس کے بانی حضرت مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کو بھی اہل حق میں سے سمجھتے تھے۔پھر مولانا سلیم اللہ عبدالرحمن صاحب نے ابتدائی زمانوں میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ کی سخت مخالفت کی تھی۔بعد میں البتہ ان کی اس قسم کی سرگرمی میں کمی آگئی تھی۔آج کل اس حوالے سے نہ جانے آں جناب کا کیا خیال ہے۔

مولانا سید الامین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں جس زمانے میں تعلیم حاصل کررہے تھے،

---

(۱) حافظ محمد صدیق،محدث ارکان، ص :۱۶۴۔

(۲) حافظ محمد صدیق،محدث ارکان، ص:۱۶۴۔

اسی زمانے میں جماعت اسلامی پاکستان خود بانی جماعت کی قیادت اور رہنمائی میں عروج کی منازل طے کررہی تھی۔معلوم ہوا کہ حضرت مولانا نے مولانا سید ابوالاعلی مودودی سے چند بار ملاقاتیں بھی کی تھیں، ان کے درس میں بیٹھے تھے۔اگرچہ مولانا سید الامین جامعہ اشرفیہ کے ذہین طالب علم اوران کے سارے اساتذے دیوبندی المسلک کے حاملین تھے،جن کی وجہ سے مولانا کے اندر بھی مسلکی یک رخاپن کا جاگزین ہونا یقینی تھا،مگر جہاں تک دیکھا گیا کہ مولانا کی ذات اس عمومی کلیہ سے قدرے باہر تھی،عملی میدان میں جس طرح علمائے دیوبند اور ان کی تمام سرگرمیوں، کارکردگیوں اور کارناموں کو امت مسلمہ کے لئے رحمت سمجھتے تھے،ٹھیک اسی طرح جماعت اسلامی کو بھی جادۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی نہیں سمجھتے تھے،اوران کی دعوت اور سرگرمی کو امت مسلمہ کے لئے عموماً اور امت مرحومۂ ارکان کے لئے خصوصاً مفید اور کارآمد سمجھتے رہے تھے،شاید اسی لئے بھی ہو کہ مولانا کے تلامذہ کی ایک بھاری اکثریت نے اس دعوت کو قبول کیا تھا۔

مولانا کے چند ہم عصر علمائے عظام :

مولانا سید الامین رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہم عصر علمائے کرام تو بہت ہیں،جن میں سے چند بزرگوں کے اجمالی یا تفصیلی حالات لکھے جاچکے ہیں۔باقی چند علمائے کرام جو مولانا کے قریبی زمانے کے ہیں،ان کے صرف اسمائے گرامی درج کئے جارہے ہیں۔

حضرت مولانا قاری بدرالاسلام صاحب کھلاربیلی۔

حضرت مولانا حافظ جمال احمد صاحب سنبنوی ۔

حضرت مولانا سعید عظیم صاحب کائندہ فاروی۔

حضرت مولانا عقیل احمد صاحب قاسمی۔

حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب جیمنگ خالوی ۔

حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب خوار بیلوی۔

حضرت مولانا عبداللطیف صاحب شاعرہ پاروی۔

حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب نلبیلوی۔

حضرت مولانا سعید عالم صاحب ریدوی۔

حضرت مولانا اسعداللہ صاحب گرجنڈ یاوی۔

حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب شقدار پاروی۔

حضرت مولانا عبدالمعبود صاحب نافیتارڈیلوی۔

حضرت مولانا فیض الاسلام صاحب تنگ بازاری۔

حضرت مولانا محمودالحسن صاحب شرف الدین بیلوی۔

حضرت مولانا عبدالاوّل صاحب پوئمالوی۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رامیوبیلوی۔

چند متعلقین واحباب :

حضرت مولانا سیّدالامین کے احباب اور متعلقین تو ظاہر ہے کہ بہت تھے،ان میں سے چند حضرات کے نام اور قدرے اجمال یہاں درج کردیتے ہیں۔

(۱) محمد حسین صاحب عاشقہ پاروی کو مولانا اپنا بھائی جانتے تھے۔

(۲) ذاکرحسین صاحب عاشقہ پاروی سے بڑا قریبی تعلق رہاتھا۔

(۳) کسٹم عبدالرحمن صاحب فیاضی پاروی،منگڈوی۔کہتے ہیں کہ یہ صاحب فسق وفجور میں مبتلا تھے، حضرت مولانا سیدالامین صاحب کے ایک دینی خطاب کے دوران اس نے تمام فجور سے توبہ کرلی،اور اسی دن سے مولانا پر فدا ہوگئے،مولانا کو زندگی بھر اپنے محسن جانتے اور بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک دن اس نے مولانا سے مسئلہ فلسطین کے متعلق پوچھا کہ حضرت آیا یہ مسئلہ کبھی حل ہونے والا ہے؟ مولانا نے اس کا جواب یوں دیا کہ مستقبل کے بارے میں تو صرف اور صرف اللہ جانتا ہے، بظاہر حالات سے جہاں تک اندازہ ہورہا ہے کہ یہ مسئلہ شاید روز قیامت تک حل ہونے والا ہے۔کسٹم صاحب مولانا کے اس جواب پر مطمئن ہوگئے،اور ہمیشہ لوگوں سے یہ بیان کرتے رہے۔

(۴) ماسٹر کالافوتوخوار بیلوی،مولانا مرحوم سے ان کا بہت قریبی تعلقات رہے،کسی قومی مسئلہ یا حادثہ سامنے آتا تو ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ماسٹر صاحب بڑے ذہین، ذی فہم اور دوراندیش انسان

ہیں۔اپنے وقت میں بڑے ذی اثر بھی ہیں،اللہ تعالی ان کی حیات میں برکت دے۔آمین۔

کمال اتباع سنت وعشق رسول :

یہ تو ایک واضح بات ہے کہ ایک عالم دین اسی کو سمجھا جائے گا جو حضرت آقا علیہ السلام کی سنتوں کا متبع ہو، حضرت مولانا کا اس حوالے سے سب سے بڑا وصف کمال اتباع سنت علی صاحبہا علیہ السلام تھا،آپ اپنی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں چاہے اس کا تعلق عبادات سے ہو یا معاشرت سے کہ قدم قدم پر سنت رسولؐ کی سختی سے پابندی فرماتے تھے،اور کسی بھی حالات میں اس حوالے سے فرق آنے نہیں دیتے تھے،آپ کی زندگی میں جہاں تک ملاحظہ کیا گیا ہے کہ آپ سنن ونوافل کا بھی بڑا اہتمام فرماتے تھے، آپ نماز کے ہر جزو میں سنت واستحباب کی رعایت کرتے رہے تھے ۔

حضرت مولانا کا اتباع سنت صرف عبادات وبندگی تک محدود نہیں تھا بلکہ عادات واطوار اور معاشرتی ومعاملاتی امور میں بھی آپ کا طریقہ آقا علیہ السلام کی پیروی اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنے کا تھا ،غرض اتباع سنت میں آپ کا درجہ بہت ہی بلند اور ممتاز تھا،چھوٹی سے چھوٹی باتوں میں آپ سنت نبوی کا اہتمام فرماتے تھے۔جس طرح خود سنت پر عمل کرتے ٹھیک اسی طرح دوسروں کو خاص طور پر تلامذہ کو تاکید فرمایا کرتے تھے۔سفر میں حضر میں،خلوت میں جلوت میں ہمیشہ آپ سنت نبوی کی پیروی کرتے تھے،آپ کے ہر ایک عمل سے آقا علیہ السلام سے محبت وشیفتگی کا ظہور ہوتا تھا،اس حوالے سے اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ حضرت کی پوری زندگی سنت نبوی کی پیروی میں گزری تھی۔

مولانا مرحوم کو عشق رسول اور محبت نبوی کا وافر حصہ ملا تھا۔جس کا اظہار آپ کی زندگی میں قدم قدم پر ہوتا تھا،شاید اسی لئے کہ اللہ تعالی نے بار بار آپ کو دیار محبوب کی زیارت نصیب فرمائی تھی ،ایسے فتنے وفساد کے دور میں بھی آپ دیار محبوب میں جانے کی تمنا کرتے رہے تھے،آپ ایک بڑے پایہ کے عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے پایہ کے عاشق رسول بھی تھے،آقا علیہ السلام کی نسبت سے درودیوار اور اس کے چمن کے گل وخار سے تعلق اور آب وہوا سے بھی الفت تھی۔

رخصت نہیں عزیمت پر عمل :

حضرت مولانا کی زندگی میں بے شمار ایسے واقعات ہوئے ،جن سے آپ کی رخصت کے بجائے

عزیمت پر عمل کا اظہار ہوا تھا، جہاں تک مولانا کو دیکھا گیا کہ آپ رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کرنے پر تلے ہوئے تھے،کون نہیں جانتا کہ آپ کی زندگی جس سرزمین میں گزری اس کی کیا حالت تھی اور ہے،عبادات نہیں بلکہ معاملات ومعاشرتی امور میں بھی آپ نے بارہا وہ کام کئے جن کو انجام دینے کے حوالے سے جوان اور دل گردہ رکھنے والا انسان بھی اپنی ہمت چھوڑ بیٹھتا ہے، یہ آپ کی روشن اور تابناک زندگی کا وہ باب تھا،جس کی مثال صرف اور صرف اسلاف کی زندگیوں میں ملتی ہے،یعنی حضرت کی زندگی میں بے شمار واقعات پیش آئے کہ آپ نے رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کیا، اور سخت سے سخت حالات میں بھی رخصت پر عمل کرنے کے بجائے عزیمت پر عمل کیا تھا۔

استقامت وصبر :

حضرت مولانا مرحوم کی زندگی صبر واستقامت کی ایک عبارت ہے،سرزمین ارکان کے حالات سے کون دانشمند ناواقف ہے،مولانا کی طویل زندگی سرزمین ارکان کے حالات کے حوالے سے مصیبت اور ابتلاء میں گزری ، ان کی زندگی میں مختلف زمانوں میں ایسے ایسے دلدوز وجان شکن حادثے گزرے،جن پر صبر کرنا ایک صاحب استقامت اور اللہ تعالی سے تعلق رکھنے والا بندہ ہی کا کام ہے، آپ نے اپنی زندگی کے مسلسل اور دلخراش حادثوں پر صبر واستقامت کا ثبوت دیا،اور یہ تو ظاہر ہے کہ قضائے الہی پر جو بندہ راضی رہے وہی تسلیم ورضا کے بلند مقام پر فائز ہوسکتا ہے ،تو مولانا کی استقامت وصبر ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے قضائے الہی کے سامنے سر تسلیم ورضا خم کردیا تھا، آپ ہر ایک موقع پر تسلیم ورضا کے پیکر ہی بنے ہوئے تھے۔صبر کے متعلق صحابئ رسولؐ حضرت ابوطلحہ کی بیوی والی روایت حضرت مولانا لوگوں کو سنایا کرتے تھے،وہ روایت یہ ہے کہ :

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کا نام ابوطلحہ تھا،حضرت ابوطلحہ کی بیوی بڑی نیک تھیں۔آپ کا ایک ننھا منا بچہ تھا، بہت پیارا تھا،اتفاق سے ایک دن بچہ بیمار پڑا اور چند دن کی علالت کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

پیارے بچہ کے انتقال کا ماں کو بڑا صدمہ ہوا،مگر تھیں بڑی شاکرہ وصابرہ بیوی،آپ نے بچہ کی لاش

ایک کپڑے میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی، اور گھر کے کام کاج کرنے میں مصروف ہوگئیں۔

اتنے میں باہر سے میاں تشریف لائے، آپ نے ابھی کھانا نہیں کھایا تھا، گھر میں قدم رکھتے ہی بیوی سے بچے کی خیر وعافیت دریافت کی، بیوی نے گول مول سا جواب دے دیا، جب آپ کھانے سے فارغ ہوئے تو بیوی بولیں، کیوں میاں! ایک شخص اگر کچھ دنوں کے لئے کسی کو کوئی چیز مستعار دے اور مدّت گزرنے کے بعد وہ اپنی چیز واپس مانگے تو کیا مستعار لینے والے کو انکار کرنے کا حق حاصل ہے؟ میاں نے کہا کہ ''ہرگز نہیں'' جب اصل مالک اپنی چیز طلب کرتا ہے تو بھلا انکار کی کہاں گنجائش؟ اب بیوی کو اور جرأت ہوئی، بولیں، وہ ہنستا کھیلتا بچہ جو اللہ تعالی نے امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا تھا واپس لے لیا، آپ صبر کیجئے اور بچہ کے لئے کفن دفن کا انتظام کیجئے۔

تجہیز وتکفین سے فارغ ہوکر میاں بیوی دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ؐ کو سارا قصہ کہہ سنایا، میاں بیوی کے اس صبر سے آپ ؐ بے حد متأثر ہوے اور اللہ تعالی سے دعا فرمائی، کچھ دنوں کے بعد حضرت ابوطلحہ ؓ کے گھر ایک اور بچہ پیدا ہوا، اس کا نام عبداللہ رکھا گیا، یہی عبد اللہ بڑے ہوکر جید عالم اور باعمل بزرگ ہوے، جنہوں نے ماں باپ دونوں کا نام روشن کیا، اللہ تعالی ان کی ماں کو صبر وشکر کا اتنا بڑا اجر دیا تھا۔

جلالت علمی :

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حضرت مولانا مرحوم سرزمین ارکان میں اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم دین اور شیخ تھے۔ یوں تو آپ کے ہم عصر علماء میں اور بھی بڑے بڑے علماء تھے، مگر اللہ تعالی نے آپ کی شخصیت میں جو جلالت دی تھی، وہ دیگر علماء میں دیکھی نہیں گئی تھی، کتنے بڑے بڑے ذی استعداد علماء دیکھے گئے کہ آپ کے سامنے آتے ہی موم کی طرح پگھل جاتے تھے، اور یہاں دراصل بات یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی جلالت علمی کے متعلق کچھ خامہ فرسائی کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کا مترادف ہے، یوں بھی ہم جیسے ناکارہ بے بضاعت اور فرومایہ طالب علم کے لئے کسی بھی طرح یہ زیب نہیں دیتا کہ مولانا کی اس جلالت علمی کے متعلق محاکمہ کروں، یا کوئی بھی بات لکھوں، بس اتنا لکھ دینا ہی کافی ہے کہ سرزمین ارکان کے بڑے بڑے علماء جن کو علم حدیث وتفسیر، فقہ اسلامی اور دیگر علوم وفنون میں خاص

ملکہ حاصل ہے، آپ کو بڑے بلند الفاظ میں یاد کرتے دیکھے گئے ہیں، اور ہر ایک نے آپ کی علمی جلالت، ذہانت وذکاوت، تواضع اور اظہار حق کا بڑے بڑے الفاظ میں اعتراف کیا ہے، جن سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کو علوم اسلامیہ کے ہر ایک فن میں درک حاصل تھا۔ مولانا کو اللہ تعالی نے علم وفن کو علمی اور فنی انداز میں پیش کرنے کا بھی خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، وقت کے اہل علم وفن جن کے ملکۂ تفسیر وحدیث فقہ اور دیگر علوم اسلامیہ پر لوگوں کا اتفاق ہے، وقت وقت میں وہ بھی حضرت کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مولانا کے علمی وفنی مقام کو سمجھنے کے لئے آپ کے ان فیصلہ کن محاکمے اور بحث ومباحث کی روداد بھی تفصیل کے ساتھ تحریر کرنا ضروری ہے جن میں آپ حاکم اور باحث تھے، جن سے ناظرین اندازہ کر سکیں گے کہ آپ کی ذہانت وذکاوت، ذہنی رسائی اور حاضر جوابی کا کیا عالم تھا۔ اور آپ بڑے مناظر بھی تھے، جس کے متعلق اتنا لکھ دینا سردست کافی ہے کہ آپ کو مناظرہ کی دعوت دی جاتی تو آپ کے میدان میں آتے ہی فریق مخالف دم دبا کر بھاگ جاتے تھے۔

مولانا علم وعمل کے جامع انسان تھے :

حضرت مولانا مرحوم اپنے وقت کے ایک عظیم اسلامی اسکالر تھے، ہر ایک جاننے والے عالم دین آپ کو اپنے وقت کے استاذ العلماء مانتے رہے تھے اور عوام الناس میں یہ بات سورج کی طرح روشن تھی کہ حضرت مولانا سرزمین ارکان میں وقت کے سب سے بڑے عالم دین تھے، وہ اس لئے بھی ہے کہ مولانا کا رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا گفتگو کرنا اور خاموش رہنا غرض سب کچھ اتباع سنت میں ہوتا تھا، سنت پر عمل اور شریعت کا اتباع آپ کی گویا طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، جو بھی آپ کو دیکھتا اس کا تعلق علماء سے ہو یا دانشوران سے یا عوام الناس سے بے ساختہ یہ کہہ کر جاتا کہ آپ سراپا اخلاق ہیں عشق نبویؐ میں ڈوبے ہوئے علم وعمل کے جامع انسان ہیں، قدرت نے آپ کو عادات طبعیہ اور معمولات جسدیہ کا کچھ ایسا بہترین مشغلہ نصیب فرمایا تھا کہ حاضرین وزائرین علماء، دانشوران اور عوام کو آپ کے ہر لمحہ اور ہر آن کی حرکت وسکون میں ایک علمی وعملی سبق ملتا تھا۔

قرآن حکیم کی تلاوت :

مولانا کی زندگی قرآن کریم اور احادیث نبویہ اور علوم اسلامیہ کے درس وتدریس میں گزر گئی، آپ کی

تلاوت قرآن کا یہ حال تھا کہ آپ نے قرآن حکیم کی تلاوت کو اپنی زندگی کا ایک خاص مشغلہ بنا رکھا تھا، آپ کی معمولات میں تلاوت قرآن کے لئے ایک خاص وقت مقرر تھا، زندگی بھر یہ مشغلہ کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا، تلاوت برابر فرماتے رہے، آپ نے اللہ تعالی کی اس کتاب کو اپنی زندگی کی ایک بڑی نعمت سمجھی، اور اس کی ایسی قدردانی کی کہ گرمی، سردی، سفر وحضر پریشانی وطمانیت غرض ہر حال میں اس کی تلاوت کو حرز جان بنا رکھا تھا، آپ کی زندگی کا کوئی ایسا دن نہیں گزرا کہ قرآن کریم کی تلاوت سے خالی رہا ہو، حضرت مولانا کی تلاوت کلام اللہ سے شغف کے متعلق مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ :

''حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تلاوت کلام کا بڑا شغف رکھتے تھے، کلام اللہ اور اس کی تلاوت سے حضرت مولانا بڑے محظوظ ہوتے تھے، کبھی کبھی کسی قاری القرآن جو تجوید کے ساتھ قرآن پڑھنے میں ماہر ہوتے، اپنے گھر بلا کر اس سے قرآن کریم سنتے تھے، اور اس کی تلاوت سے مست اور محو ہوجاتے تھے، اسی طرح کسی قاری کو گھر بلا کر اسے خود قرآن کریم سنایا کرتے تھے''۔

اسی طرح مولانا شبیر احمد صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

'' حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ خود تلاوت قرآن میں محو ومستغرق ہوجاتے تھے۔ اور حسن آواز اور عربی لحن پر قرآن مجید کی تلاوت کرنے والوں پر عاشق زار ہوجاتے تھے''۔

تلاوت قرآن میں تجوید کی اوّلیت :

حضرت مولانا مرحوم عربی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لئے ضروری اور بہت ضروری سمجھتے تھے کہ قرآن کریم کو صحت الفاظ کے ساتھ پڑھا جائے، اور فرمایا کرتے تھے کہ تجوید کے ساتھ قرآن کریم کی قرأت وتلاوت عربی تعلیم کی ابتدائی منزل ہے، اور مدرسہ میں اس کے لئے مکمل نظام قائم کرنے کے لئے بہت زور دیتے تھے، اور آپ نے جہاں بھی تعلیم دی اس بات پر اپنی توجہ مبذول کر رکھی تھی، اور ہر چند کوشش کی تھی کہ آیات قرآن کی قرأت وتلاوت میں طلبہ غلطیاں نہ کریں۔

جرأت وبے باکی :

مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا مرحوم اظہار حق کے حوالے سے یکتائے روزگار تھے، ظالم حکام کے سامنے انہوں نے درجنوں مرتبہ حق گوئی اور بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا، یعنی اظہار حق اور جرأت وبے باکی آپ کا ایک خاص شیوہ تھا، جب بھی اظہار حق کا کوئی موقع آیا تو آپ نے ایک لحہ بھی سکوت اختیار نہیں کیا، ظالم حکام، اہل فکر اور اہل علم وفن غرض جہاں بھی موقع ہوا تھا کہ کسی کے سامنے بھی اظہار حق سے پہلوتہی نہیں کی تھی، اس سلسلے میں بے شمار واقعات آپ کی زندگی میں موجود ہیں، اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اظہار حق کے معاملے میں آپ اپنے اسلاف اور بزرگوں کے صحیح وارث تھے، احقاق حق اور ابطال باطل کیحوالے سے حضرت مولانا کی زندگی ''کلمۃ حق عند سلطان جائز'' کی ایک مثال بنی ہوئی تھی''۔

قناعت واستغناء :

حضرت مولانا مرحوم کی ذات عالی صفات میں قناعت واستغناء کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس سلسلے میں بے شمار واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں۔ آپ کی قناعت واستغناء کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے امراء آپ کو ہدیہ تحایف دینے سے اس لئے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کے ہدایا اور تحایف رد تو نہیں کئے جائیں گے، البتہ آپ صرف اور صرف کسی دینی فوائد کی خاطر بعض مناسب لوگوں کے ہدایا اور تحایف قبول کرتے تھے ۔

حضرت مولانا نے حرص وبدظنی کا مقابلہ توکل علی اللہ اور قناعت سے کیا اور ہمیشہ ہمیشہ کتاب اللہ کی اس آیت پر عمل کیا ہے۔ ((**ومامن دابة فی الأرض الا علی اللہ رزقها**)) (ھود)

اور کوئی جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو۔

حضرت مولانا اور تو اور رزق وروزی کے معاملے میں کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے، اور آپ کو اللہ تعالی کے خزانوں پر پورا اعتماد تھا، اور درج ذیل آیت کریمہ پر یقین کے ساتھ زندگی گزاری تھی ((**ومن یتق اللہ یجعل له مخرجا ویرزقه من حیث لا یحتسب**)) اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے

نجات کی شکل نکال دیتا ہے اوراس کوایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا،،۔

تواضع وانکساری :

حضرت مولانا مرحوم کی ذات عالی صفات میں اللہ تعالی نے تواضع اور انکساری کی صفت بھی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی ، اللہ تعالی نے آپ کو جوعلمی مقام اور دینی وعلمی فضیلت عطا کی تھی ، وہ توسورج کی طرح عیاں ہے، سرزمین ارکان میں آپ کے زمانے میں آپ سے زیادہ معزز اور بلند مقام رکھنے والے بہت کم اہل علم وفضل تھے ،مگر اتنے بلند مقام رکھنے کے باجود آپ کی ذات میں تواضع ، خاکساری اور انکساری کی صفت بھی حددرجہ تھی ،حضرت مولانا کی بے نفسی ،تواضع اور انکساری کے درجنوں واقعات سننے میں آئے ہیں۔

سخاوت اورفیاضی :

کہاجاتا ہے کہ ایک عالم ربّانی کبھی بخیل نہیں ہوسکتا ، وہ عالم ایک عالم ربّانی نہیں جوسخینہ ہو ، یوں حضرت مولانا کے بلند وبالا اوصاف وکمالات میں ایک بڑا وصف جود وسخا کا بھی تھا، سخاوت اور فیاضی آپ کی طبیعت ثانیہ تھی ، درجنوں راویوں کا کہنا ہے کہ آپ کے پاس جو کچھ بھی آتا تھا وہ دوسروں کے کام میں آتا تھا، آپ نے اپنی زندگی میں کسی بھی سائل یا کسی بھی چیز کے خواہشمند کی خواہش کوجس کا پورا کرنا آپ کے اختیار میں تھا رد نہیں کیا۔اسی طرح مہمانوں کا اکرام بھی جود وسخا کا ایک بڑا حصہ ہے، آپ کی خدمت میں بکثرت مہمان آیا کرتے تھے ،اورآپ کے یہاں قیام کرتے تھے ،آپ نے کبھی بھی کسی مہمان کی خاطر داری میں کمی نہیں کی تھی اور مولانا مہمان نوازی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تعامل صحابہ کی روایات لوگوں کو اور بطور خاص تلامذہ کو سناسنا کر محظوظ ہوتے تھے ، ان روایات میں خصوصی طور پر درج ذیل روایت کا تذکرہ بہت ہی کیا کرتے تھے کہ :

ایک دفعہ بھوک سے نڈھال ایک صحابیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ،آپ نے انہیں کھانا کھلانا چاہا، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پانی کے سوا گھر میں کچھ نہیں ہے ۔یہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا ۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں اکثر فاقہ کی نوبت آجاتی ۔اب کیا کریں ۔اس وقت کئی صحابی حضورؐ کے پاس بیٹھے تھے ۔آپ نے فرمایا آج کی رات اس مہمان کی میزبانی کون اپنے ذمہ لیتا ہے؟

حضرت ابوطلحہؓ نے جواب دیا ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں'' چنانچہ مہمان کو لے کر آپ اپنے گھر تشریف لائے ، گھر میں دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہاں بھی اللہ کا نام ہے ،صرف بچوں کے لئے تھوڑا سا کھانا رکھا ہے ،آپ نے بیوی سے کہا کہ تم بچوں کو کسی طرح بہلا کر سلا دو ، اور جب مہمان کو گھر لے آؤں تو بتی ٹھیک کرنے کے بہانے چراغ گُل کر دینا ، ہم لوگ بھی مہمان کے ساتھ بیٹھ جائیں گے ۔کھانا مہمان کے سامنے رکھ دیں گے ، ہم لوگ بھوکے اٹھ جائیں گے ، مہمان کو اندھیرے میں دکھائی دے گا نہیں ، وہ سمجھے گا کہ گھر والوں نے بھی کھالیا ، اس طرح اسے اطمینان ہوجائے گا ، اور اتنے کھانے میں اس کا پیٹ بھی بھر جائے گا ۔

چنانچہ بیوی نے ایسا ہی کیا ، بہانے سے چراغ گُل کر دیا ۔سب ساتھ بیٹھ گئے ، مہمان نے سمجھا کہ سب کھا رہے ہیں ، اس نے اطمینان سے پیٹ بھر کر کھالیا ۔میزبان بھوکے رہ گئے ، مگر خوش تھے کہ چلو مہمان کا پیٹ تو بھر گیا ، اور ہماری بھوکے رہنے کی اسے خبر بھی نہیں ہوئی ورنہ شاید مہمان کو تکلیف ہوتی ۔

صبح کو جب ابوطلحہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا طلحہ! تمہارے رات کے نیک برتاؤ سے اللہ تعالی بہت خوش ہوا ۔ اور یہ آیت نازل فرمائی ہے : ((**ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصة**)) یعنی وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں ، گو وہ فاقہ سے ہوں ۔

حضرت مولانا کی مہمان نوازی کے متعلق آپ کے چند تلامذہ رطب اللسان ہیں ، ان شاگردوں میں سے میرے عزیز دوستوں میں ایک مولوی صاحب ہیں ، قاری ارشاد اللہ ان کا نام ہے ، جنہوں نے حضرت کی مہمان نوازی کے حوالے سے بہت ساری باتیں بیان کی ہیں ، ایک موقع پر انہوں نے بیان کیا کہ :

'' حضرت مولانا سید الامین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے مسلسل تین سال پڑھا ، اور اکتساب فیض کیا ، حضرت مولانا بڑے نیک دل اور فیاض عالم دین تھے ۔

جماعت دوم میں نے آپ کے یہاں مدرسہ محمدیہ پرامپورو میں پڑھی ، اور دو سال یعنی جماعت اولی اور دورۂ حدیث مدرسہ توحیدیہ منگنما میں پڑھ کر درس کی تکمیل کی ۔

منگنما میں شروع شروع میں مجھے ایک گھر ملا تھا ، جس میں میں کھانا کھاتا تھا (جسے

جا گیر کہا جاتا ہے) اتفاق سے یہ گھر مدرسہ سے بہت دور تھا، اور دیگر بعض پریشانی کی وجہ سے اس گھر میں کھا کر یہاں پڑھنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ میری اس پریشانی کی حالت حضرت کو معلوم ہو گئی تو آپ نے ایک دن مجھے بلا کر کہا کہ آج سے تم کھانا مدرسہ ہی میں کھاؤ گے، اور روز میرے گھر سے تمہارے لئے کھانا پہنچے گا۔ ویسے حضرت کی فیاضی سے کھانے کے متعلق مجھے اطمینان نصیب ہو گیا۔ علاوہ ازیں حضرت کبھی کبھار ایسے بھی کرتے تھے کہ گھر میں کوئی اچھا کھانا پک جاتا تو حضرت خود مجھے ساتھ لے کر اپنے گھر جاتے، اور مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔ آہ! آج حضرت کی یہی ذرہ نوازی اور کرم فرمائی کی یاد ستا رہی ہے اللہ تعالی آپ کے درجات بلند کرے"۔

آخری چند وصیتیں اور نصیحتیں

آپ نے اپنی وفات حسرت آیات سے چند دن پہلے اپنے وارثین واقارب اور باقیات الصالحات کو بلا کر چند وصیتیں کی تھیں، ان وصایا کے متعلق فاضل گرامی قدر مولانا بشیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ:

"حضرت مولانا وفات سے تقریباً آٹھ روز پہلے تک لوگوں سے بات چیت کر سکتے تھے، ان آٹھ دنوں سے پہلے حضرت نے اپنی اولاد اور خویش اقارب کو پاس بلایا تھا، اور چند بیش قیمت وصیتیں کی تھیں، جو حضرت کی زندگی کی آخری بات تھی"

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت کی ان آخری وصیتوں کو زیر قرطاس لایا جائے حضرت نے فرمایا:

(۱) مردوں کی تجہیز اور شادی بیاہ کی جہیز دونوں کا مادہ ایک ہے اور معانی کے اعتبار سے دونوں میں خاص مناسبت بھی ہے، لوگ دلہن کو سجا کر پالکی یا آج کل گاڑی میں بیٹھا دیتے ہیں، اور سسرال والے جہیز وغیرہ لے کر دلہن کو اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ اسی طرح مردہ کو کپڑے پہنا کر بنجارہ میں سوار کیا جاتا ہے، ادھر دلہن جب سسرال کے گھر پہنچتی ہے تو خواتین اس کو گھیرے میں لے لیتی ہیں، اسی طرح مردہ کو جب قبر میں پہنچایا جاتا ہے تو فرشتے اسے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ دلہن سے جس طرح سسرال میں بہت ساری باتیں پوچھی جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح قبر میں مردے سے ڈھیر ساری

باتیں پوچھی جاتی ہیں۔ اور بہت سارے سوالات کئے جاتے ہیں، اسی لئے دلہن اور مردے کی جہیز میں بڑی مناسبت ہے۔ جس طرح بیٹی کو وداع دیتے وقت میکے والے روتے پیٹتے ہیں، ٹھیک اسی طرح مردہ کو قبر کی طرف چھوڑتے وقت اولاد واحفاد، خویش واقارب، متعلقین واحباب روتے پیٹتے ہیں، جو ایک عام سی بات ہے۔ مگر تمہیں میری وصیت ہے کہ مجھے قبر کی طرف چھوڑتے وقت اور میرے انتقال، تجہیز وتکفین وغیرہ کے دوران بالکل چلایا نہ جائے، تمہارے چلّانے سے میری روح کو بڑی تکلیف پہنچے گی، اور یاد رہے کہ اس طرح کی نوحہ گری، چلّانا پیٹنا روح شریعت کی سراسر منافی ہے اور میرے انتقال پر خود تم کو اس بات کا خیال رہنا چاہئے کہ یہ دنیا انسان کے لئے آخری منزل نہیں ہے، بلکہ سفر کے دوران ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے، آج میں جا رہا ہوں، تو کل تمہیں بھی ضرور جانا ہے، بندہ کو ہر حال میں آخرت کی فکر رہنی چاہئے۔

(۲) تمہیں ہر حال میں اپنی ماں بہنوں، بیویوں بیٹیوں کا خیال رہنا چاہئے، خواتین اس وقت اچھی لگتی ہیں، جب وہ پردے میں رہیں، پردے سے باہر ہو کر عریاں ہونے والی خواتین کو اللہ سخت ناپسند کرتا ہے، اور دنیا میں اللہ والے، شائستے اور مہذب انسان بھی انہیں نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ خواتین کی عزت اس وقت ہوتی ہے، انہیں اس وقت قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے جب وہ باپردہ ہوں، جس طرح کیلا اس وقت کھایا جاتا ہے جب اسے چھلکے سے خود اپنے ہاتھوں سے نکالا جائے، جو کیلا پہلے ہی چھلکے سے باہر ہو جاتا ہے، اسے ردی کا حوالہ کر دیا جاتا ہے، اگر کھایا جائے تو منھ بنائے کھایا جاتا ہے، اس لئے میں تمہیں اس بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی عورتوں کو ہمیشہ پردہ میں رکھو! عریانی سے کوسوں دور رکھو، اور یاد رکھو کہ عورت اللہ تعالی کی ایک امانت ہے، اس کے متعلق سوال کیا جائے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کل روز قیامت تم اللہ تعالی اور اس کے رسول کے سامنے شرمندہ ہو جاؤ۔ اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالی تمہیں اپنی اپنی عورتوں کے متعلق صحیح سمجھ عطا کرے اور انہیں دین کے مطابق چلانے کی توفیق سے نوازے۔

(۳) تمہارے واسطے سے خصوصی طور پر حضرات علمائے کرام اور مدارس دینیہ کے جمیع طلبہ کو نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ حضرات پر اللہ اور اس کے برگزیدہ رسول حضرت سیدنا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف سے بڑی بھاری ذمہ داریاں ہیں، آپ حضرات کے لئے ان ذمے داریوں کو بناہنا بہت ضروری ہے۔تعلیم وتعلم ، درس وتدریس کے تہ بتہ عوام الناس تک اللہ اور اس کے رسول ؐ کی باتیں پہنچاتے رہنا، دعوت تبلیغ اور رشد وہدایات کے کاموں میں کبھی غفلت کا مظاہرہ نہ کرنا۔خدااور سول کی باتیں ان کے سامنے کھل کھل کر بیان کرنا۔اور یادرکھنا کہ اس دنیا میں دراصل دوحکومتیں چلتی ہیں، ایک دنیاداروں کی حکومت اور ایک دین داروں کی حکومت، ملک کے صدر سے لے کر گاؤں کے سرپنچ تک جس طرح ان دنیاداروں کی ایک حکومت ہے، ٹھیک اسی طرح جماعت علماء کی بھی ایک حکومت ہے، اول الذکر کا جہاں تک تعلق ہے کہ وہ لوگ دنیاوی حکومت کے ذمے دار ہوتے ہیں، اور آپ حضرات علمائے کرام آسمانی حکومت کے ذمے دار ہیں، کل بروز قیامت تم سے پوچھا جائے گا کہ درس وتدریس، رشدد ہدایت، دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کے ذریعے احکام خداوندی کولوگوں تک پہنچانے میں کہاں تک اپنی ذمے داری پوری کی گئی ہے۔ اور آپ حضرات ہر حال میں اسوۂ رسول کو اپناتے رہنا، اور یادرکھنا کہ ’’لقد کان فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ‘‘ رسول خدا کی پوری زندگی، ان کی سیرت طیبہ، ان کا اسوۂ حسنۃ پوری انسانیت کے لئے چراغ راہ ہے۔ ہرحال میں سنت رسول کی پیروی کرنا اور لوگوں کو بھی اس طرف دعوت دیتے رہنا ۔

(۴) مولانا حافظ نور محمد (صاحب زادہ گرامی) اور گھر کے دوسرے افراد سے میری وصیت ہے کہ تم میرے کمزور بیٹا عزیزم عرفان سلمہ کی دیکھ بال میں کبھی کوتاہی نہ کرنا، حتی المقدور اس کی خدمت کرتے رہنا، تم جانتے ہو کہ وہ باولہ ہے، پاگل ہے، اس کی تمام حرکات وسکنات کو ہمیشہ ہمیشہ برداشت کرتے رہنا۔کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی حرکات وسکنات سے تم تنگ آکر اسے چھوڑ دو، اس کی دیکھ بال میں غفلت سے کام نہ لینا۔

ظاہر ہے کہ حضرت مولانا بہت بڑے عالم دین تھے، زندگی بھر آپ بطور خاص امت مسلمۂ ارکانیہ کے حالات پر پریشان تھے، وقت وقت کی برمی حکومتوں اور شرپسند حکام نے اس امت کی زندگی کو تنگ کررکھا۔تو مولانا کو اس کی نجات کی ہمیشہ فکر رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ ارکانی مسلمانوں کے معاشرتی حالات پر بھی آپ گہری نظر رکھتے تھے، رشد وہدایت، دعوت وتبلیغ کے ذریعے ان کے حالات کے سدھار کے لئے آپ نے بڑی کوششیں کی تھیں، گویا اس حوالے سے آپ نے برملا جہاد کیا تھا، اب دنیا

سے رخصت لیتے وقت بھی آپ کو اس امت مظلومہ ومحرومہ کی فکر ستا رہی تھی، علاوہ ازیں جہاں تک پتہ چلا کہ حضرت کا صاحب زادہ عرفان جو باولہ اور پاگل ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک پاگل بیٹے کی وجہ سے آپ کی زندگی کتنی پریشان کن تھی، مگر حضرت نے اس کی تمام حرکات کو جس طرح زندگی بھر برداشت کیا تھا، اسی طرح دنیا سے جاتے وقت بھی اپنی اولاد اور گھر والوں کو اس کی طرف توجہ دلائی تھی۔

وفات حسرت آیات :

سرزمین ارکان میں گئی صدی کے تقریبًا آٹھویں عشروں سے جنڈیس کا مرض وبا کی شکل اختیار کرگیا ہے، اس وبا نے اورتو اور کتنے بڑے بڑوں کی زندگیاں کھالیں، اس کی نہ حد ہے اور نہ حساب، ارکانی مسلمانوں کے حالات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ کسی بھی ارکانی مریض کا جب معاینہ یا تشخیص کی جاتی ہے تو ڈاکٹر سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ آیا اس مریض کے بدن میں جنڈیس جیسی مہلک بیماری کے کتنے اثرات ہیں، سرزمین ارکان میں پائے جانے والے اس مہلک مرض کے حوالے سے ماہرین نے طرح طرح کے تبصرے کئے ہیں، اور انہوں نے اس ضمن میں یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ ارکان میں تو مسلمانوں کے علاوہ اور بھی قومیں آباد ہیں، مگر یہ مرض مسلمانوں میں زیادہ کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مسلمانوں کے رہائشی علاقوں میں منصوبہ بندی کے ساتھ مسلم دشمنوں نے اس مرض کے جراثیم پھیلائے ہوں؟ علاوہ اس کے یہاں بواسیر کے مریض بھی خاصے پائے جاتے ہیں، اس کا تعلق خونی بواسیر سے ہو یا غیر خونی بواسیر سے۔

بہرحال حضرت مولانا اپنے انتقال سے تقریبا تین سال پہلے ان مذکورہ دونوں امراض کے شکار ہو چکے تھے۔ان دونوں امراض نے آپ کی زندگی کو پریشان کررکھا تھا، ان سے نجات کے لئے طرح طرح کا معالجہ کیا گیا، مگر آخر تک خلاصی نہیں ملی تھی، غرض حضرت کی وفات کے یہ دونوں امراض سبب بنے، تو حضرت کی بیماری اور معالجہ وتشخیص کے بارے میں مولانا شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ:

’’انتقال سے پہلے آپ تقریبًا تین سال بواسیر اور جنڈیس کے امراض کے شکار رہے تھے، اوران امراض کی وجہ سے آپ کو بہت ہی تکلیف اٹھانی پڑی تھی، خاص طور پر بواسیر کے دفعیہ کے لئے بڑی بڑی کوششیں کی گئی تھیں، اس حوالے سے

برادر مکرم صاحب زادہ گرامی جناب مسٹر دین محمد صاحب اور صاحب زادۂ گرامی مولانا قاری عمران صاحب بڑے شکر وسپاس کے مستحق ہیں، حضرت مولانا کے ضعف اور ساتھ ہی ساتھ راستے کی دشواریاں اور رکاوٹوں کے باوجود ان دونوں صاحب زادوں نے حضرت کو بنگلہ دیش کا معروف شہر چاٹگام لے جا کر علاج ومعالجہ کرایا تھا۔ اور ان دونوں امراض کے دفعیہ کے لئے بہت سارے پیسے خرچ کئے تھے ۔ پھر خدمات پیسے کے حوالے سے ان دونوں صاحب زادوں کے تذکرے کے دوران اور دو شخصیات کی بھی یاد آ گئی، ان میں سے ایک محترمہ شگفتہ بیگم (رفیقۂ حیات محترم مسٹر دین محمد صاحب، جن کی رہائش اس وقت بھی اور آج کل بھی چاٹگام میں ہے) اور حضرت مولاناؒ کے نواسۂ گرامی مولوی عبدالحلیم ارشد ہیں، ان دونوں نے بھی دوران معالجہ حضرت کی خدمت کرنے میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی، علاوہ ازیں صاحب زادۂ گرامی قدر مولانا حافظ نور محمد صاحب کا کیا کہنا، انہوں نے تو حضرت کی خدمت گزاری کے لئے اپنی زندگی، تن، من، دھن سب کو وقف کر دیا تھا، اللہ تعالی ان سب کی حیات دراز کرے۔

غرض چاٹگام میں حضرت کا بھرپور معالجہ کرایا گیا، مگر افسوس کہ آخر تک ان امراض نے حضرت کو نہیں چھوڑا، اتنے معالجہ کے باوجود حضرت کما حقہ شفایاب نہ ہو سکے۔ اور یہ دونوں امراض حضرت کی وفات کے سبب بنے ، بالآخر حضرت نے اپنے ہزاروں تلامذہ اور لاکھوں عقیدت مندوں کو سوگوار اور یتیم کر کے اس جہان فانی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کر دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ سے اپنے مرض کی اس طویل مدت میں عبادت الہی میں کبھی بھی کوتاہی نہیں ہوئی تھی، ہمیشہ کی طرح مرض میں بھی عبادت، تلاوت اور ذکر وشغل میں مشغول رہے، جب تک آپ کی زبان بند نہیں ہوئی تھی، بظاہر آپ کو دیکھا جاتا تھا کہ آپ ذکر الہی میں مشغول تھے، یاد رہے کہ وفات سے سات دن پہلے آپ کی زبان بند

ہو چکی تھی، ایسے حالات میں اشاروں کنایوں اور خاص طور پر آنکھوں سے کچھ کہتے رہتے تھے، زبان مبارک سے کچھ بھی ادا نہیں ہو پاتا تھا۔ انتقال کے سات دن پہلے جب آپ کی زبان بند ہو گئی تھی تو سارے گھر والے، خاندان اور جمیع اہل تعلق پریشان اور مغموم ہو گئے تھے۔ تمام لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ حضرت اب ہم سے جدا ہونے والے ہیں، جن کے خیر وبرکت کے سایۂ لطف وعاطفت میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، ان سے ہم جلد محروم ہونے والے ہیں، پھر بھی سارے کے سارے بارگاہ رب کبریاء میں دعا گو تھے کہ حضرت کا مبارک سایہ تادیر قائم رہے، مگر وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالی کو منظور ہوتا ہے، اور بالآخر حضرت کی روح مبارک کو عمر بھر کی بے قراری سے قرار آ ہی گیا''۔

تجہیز وتکفین :

سرزمین ارکان کے مایۂ ناز فرزند ارجمند حضرت العلامہ، شیخ المعقولات والمنقولات اور مرد باکمال سید الامین صاحب کی خبر انتقال چاروں طرف بجلی کی طرح پھیل گئی تھی، اہل علم ودانش کو اس پر گہرا غم ہوا کہ آج سرزمین ارکان کے ایک متبحر عالم دین، مفسر ومحدث، فقیہ ومصلح جاتے رہے، بزم علم وفن سونی ہو گئی، یوں دیکھتے ہی دیکھتے حضرت کے گھر پر ایک جم غفیر جمع ہو گیا، اور چند علمائے عظام نے تجہیز وتکفین کی خدمت نباہی، حضرت کی وفات حسرت آیات اور تجہیز وتکفین کے متعلق مولانا شبیر احمد کی تحریر ملاحظہ فرمائیے:

> ''حضرت العلام کی وفات کی خبر پھیلی تو خطۂ ارکان کے تمام باشندے عورت، مرد، جوان بوڑھے اور تو اور حساس بچے بھی پاگل جیسے ہو گئے تھے۔ منگڈو، بوسیدنگ اور اسیدنگ کے شمال وجنوب سے حضرت کی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے لوگوں کا ایک سیلاب امنڈ آیا تھا۔ سرزمین منگنما میں لوگوں کا ایک سمندر نظر آنے لگا تھا، شدید گرمی کا موسم تھا، لوگوں کے ہجوم سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہوا رک سی گئی ہے، ازدھام کے مارے تمام لوگ پسینے سے شرابور ہو گئے تھے، ہر طرف سے رونے

دھونے کی آواز آرہی تھی، ہرایک آپ کے آخری دیدار کے لئے پروانہ ودیوانہ جیسا ہوگیا تھا، مسلسل کئی گھنٹوں تک لوگوں کو آپ کے آخری دیدار کرایا گیا تھا، مگر ریلاتھمتا نہ تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا رہاتھا، لوگوں کا ازدہام بڑھتاہی جارہاتھا، بالآخر مجبور ہوکر دیدار کا سلسلہ بند کرنا پڑا تھا۔ پھر راقم سطور (حضرت کے شاگرد رشید اور پہلا داماد مولانا شبیر احمد صاحب) نے مولانا محمد جو ہر اودنگی اور مولوی حافظ ادریس عرب شاہ پاروی کو بلند آواز سے بلایا، میری آواز پر دونوں آئے، ان سے گزارش کی گئی تھی کہ حضرت کے غسل اور تجہیز وتکفین کا کام انجام دیں، ان دونوں نے یہ کام بڑے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا، البتہ ان دونوں کے ساتھ حضرت مولانا کے اور چند شاگر رشید بھی تھے۔

حضرت کی نعش مبارک کو تجہیز وتکفین کے بعد منگنما کھری پارہ اور ماجر پارہ کے درمیان پائے جانے والے وسیع میدان میں لے جایا گیا، اور حضرت کی نعش مبارک وہاں تک لے جانے میں بھی بڑی تکلیف ہوگئی تھی۔ ایک طرف لوگوں کا ہجوم وازدہام، تو دوسری طرف موٹرسائکلوں اور گاڑیوں کا ریلا، مگر پھر بھی بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ نعش مبارک وہاں پہنچائی گئی تھی''۔ ر

جنازہ میں شرکت کے لئے حکومت کی عام اجازت :

جون ۲۰۱۲ء کے بعد تو سب جانتے ہیں کہ زمین ارکان کس بلا کی شکار ہوچکی تھی، مساجد مدارس بند تھے، سارے علاقے پر مارشل لا کا راج تھا، مسلمانوں کے لئے چلنے پھرنے میں مزید پابندیاں لاگو ہوچکی تھیں، ایک بستی سے دوسری بستی کو جانا تقریبًا بند تھا، مگر حضرت کی وفات حسرت آیات کے فورًا بعد علاقے کے اعلی حکام نے اعلان کیا تھا کہ مسلمانوں میں سے جو بھی چاہے حضرت مولانا سید الامین کی نماز جنازہ میں شرکت کرسکتا ہے، ان کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے والوں کے لئے کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں یاد رہے کہ جس طرح حضرت مولانا کی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے حکومت کی طرف سے عام اجازت ہوگئی تھی، اسی طرح حضرت مولانا سے پہلے انتقال کرجانے

والے جنوبی منگڈو کے نامور شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد السبحان گرھا خالوی کے انتقال پر بھی حکومت وقت کی طرف سے نماز جنازہ میں شرکت کے لئے عام اجازت ہوگئی تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ برمی حکومت اور حکام بڑے ظالم ہیں، مگر حضرت کی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے انہوں نے جو عام اجازت دی تھی اس کے لئے ہم ان کے شکرگزار ہیں، کاش کہ ارکان اور وہاں کے مسلمانوں کے لئے یہاں کی حکومت اور حکمران خیر خواہ ہوتے تو ہم بھی امن کے ساتھ زندگی گزار سکتے اور وہ بھی امن وسکون سے جی سکتے تھے۔ ارکان کے مسلمان شدت پسند نہیں ہیں۔ ان کو خواہ مخواہ شدت پسند بنانے کا کام خود حکومت اور شرپسند عناصروں نے انجام دیا ہے، غرض ارکان کے آج جو حالات ہیں، یہ ان حکام اور شرپسند حکومت کے پیدہ کردہ ہیں، اللہ تعالی ان کو ہدایت دے، اگر ہدایت نصیب میں نہیں ہے تو اللہ ان کے متعلق جو چاہے سو کرے۔

بہرحال حکومت وقت کی طرف سے عام اجازت ہوجانے کے بعد نہ صرف ارکان بھر سے بلکہ دریا ئے ناف کے اس پارہ سے بھی بہت سارے تلامذہ وعقیدت مندوں نے حضرت کی نماز جنازہ میں شرکت کی تھی، نماز جنازہ میں کتنے لوگ شریک تھے، اس حوالے سے مختلف اندازے اور تخمینے سامنے آئے، بعض عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ شرکت کرنے والے تین لاکھ افراد سے کم نہیں تھے، اور بعض عینی شاہدین اس سے زیادہ اور کم بھی بتارہے تھے۔ مگر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ :

''نماز جنازہ میں کتنے لوگ شریک ہوئے اس کی صحیح تعداد اللہ تعالی ہی کو معلوم ہے، مگر بعض عینی شاہدین اور حضرات علمائے کرام کا اندازہ ہے کہ نماز جنازہ میں تقریبًا پانچ لاکھ افراد نے شرکت کی تھی''۔

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد صاحب کوئیاربیلی (۱)

حضرت مولانا شبیر احمد بن مرحوم خلیل الرحمن صاحب کی ولادت موضع کوئیاربیل شمالی منگڈو میں تقریبا ۱۹۵۰ میں ہوئی، بعض اطلاع کے مطابق آپ کا سلسلۂ نسب سیدنا صدیق اکبر سے جا ملتا ہے، آپ کے والد نہایت دین دار، علم وعلماء دوست انسان کی حیثیت سے علاقہ بھر میں معروف تھے۔

مولانا کی مکتب نشینی علاقہ کے مدرسہ میں ہوئی، بعد میں آپ کو اپنے والد صاحب کے ساتھ کھیتی باڑی کے کام میں مشغول ہونا پڑا، مگر تقدیر کا فیصلہ کچھ اور تھا کہ تقریبا بیس سال کی عمر میں آپ علم دین کے حصول کی نیت سے دارالعلوم میانجانفور میں جا داخل ہوئے، ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک وہیں پڑھتے رہے، میزان الصرف وغیرہ پڑھنے کے بعد آپ نے ہندوستان جانے کا فیصلہ کرلیا، اور سیدھے جا کر جامعہ مظاہر العلوم بنارس میں داخل ہوئے، وہاں ایک سال پڑھنے کے بعد مدرسہ قاسمیہ میرٹھ پہنچے، یہاں تین سال تک پڑھنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں جماعت پنجم میں داخلہ لیا، موقوف علیہ کی تکمیل کے بعد دارالعلوم میں اختلاف وانتشار کی وجہ سے آپ دورۂ حدیث کی تعلیم موقوف کرکے حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ کی خدمت میں جا پہنچے، یہاں آپ کا تقریبا ایک سال قیام رہا، پھر دارالعلوم واپس آئے اور داخلہ لیا، یہ آپ کے دورۂ حدیث کا سال تھا، یوں آپ نے یہاں دورۂ حدیث کی تعلیم مکمل کرلی، اور فراغت کے بعد پھر سے شعبۂ افتاء میں داخلہ ملا تو اسی شعبہ میں بھی آپ نے بڑی کامیابی حاصل کی، آپ نے فتوی نویسی کے فن پر اچھے خاصے عبور حاصل کرلیا، پھر افتاء سے بھی فراغت کے بعد اساتذۂ کرام کی نظر آپ پر پڑی تو شوال/ ۱۴۰۵ھ تا شعبان/ ۱۴۰۷ھ آپ دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس رہے تھے۔

آپ نے شعبان/ ۱۴۰۷ھ کو ارباب شاہی مرادآباد کی طلبی اور اپنے خیر خواہ اساتذہ کے حکم پر مدرسۂ مذکورہ میں مدرسی قبول کی، وہاں فتوی نویسی، شعبۂ افتاء کے زیر درس کتابوں کے اسباق کے ساتھ ساتھ دورۂ حدیث شریف اور موقوف علیہ کی اعلی کتابیں آپ کے حصے میں تھیں، افتاء کی کتابوں میں الاشباہ والنظائر، درمختار، سراجی اور عقود رسم المفتی اور دورۂ حدیث کی کتابوں میں طحاوی شریف، موطا امام مالک

(۱) فتیدنگ، لندنگ جس کا پوسٹ اور تحصیل بلی بازار ہے، شاید فتیدنگ کو کوئیاربیل بھی کہا جاتا ہے۔

نسائی شریف کے علاوہ ہدایۃ جلد رابع آپ کے زیر درس رہیں، بعد ازاں ۱۴۱۱ھ سے افتاء کے اسباق کے علاوہ ترمذی شریف اور مسلم شریف کا درس بھی آپ سے متعلق رہا تھا۔

آپ نے ۱۴۰۶ھ میں (دارالعلوم دیوبند کے بعض اساتذہ کی کوشش سے) ضلع مظفر نگر والی ایک لڑکی سے شادی کی، جس کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، لیکن بعد میں اختلاف طبائع کی وجہ سے ایک سال کے بعد دونوں کے درمیان جدائی کی نوبت آگئی تھی، پھر شاہی مرادآباد میں مدرس ہونے کے بعد آپ نے اور ایک شادی کی، جس کے بطن سے تین لڑکے پیدا ہوئے۔

ماشاء اللہ مولانا تصنیف وتالیف کے ذوق بھی رکھتے ہیں، اب تک آپ کی بہت ساری تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں، جن کا اجمال حاضر خدمت ہیں:

(۱) ایضاح الطحاوی: حدیث رسولؐ کی معروف کتاب ''الطحاوی'' کی شرح ہے، اب تک دو جلدوں میں چھپ کر منظر عام پر آئی ہے، حضرت موصوف کی آرزو ہے کہ یہ کتاب مکمل ہو کر پانچ جلدوں میں چھپ کر منظر عام پر آئے، اللہ تعالی آپ کی تمنا پوری کرے۔

(۲) ایضاح النوادر: ۳۱۳ مسائل جدیدہ ونادرہ کے حل پر آپ نے قلم اٹھایا ہے، اس کتاب میں آپ نے روزمرہ کے ضروری اور اہم مسائل کے حل کو بڑی تحقیق کے ساتھ جمع کردیا ہے۔

(۳) ایضاح المناسک: مولانا کی یہ تصنیف حج بیت اللہ اور زیارت مدینۃ الرسولؐ کے متعلق ۱۳۱۳ اہم اور ضروری مسائل کے حل پر مشتمل ہے، حجاج کرام کے لئے بہت مفید کتاب ہے۔

(۴) حج وعمرہ کی دعائیں: حج وعمرہ کی مستند اور مقبول دعاؤں پر مشتمل یہ کتاب بھی حاجیوں کے لئے بہت ہی مفید ہے، یہ کتاب ۷۱ دعاؤں کا ایک مجموعہ ہے۔

(۵) ایضاح النوادر: ہندوستان کی حالت انشورنس، امپورٹ، اکسپورٹ، مسلم فنڈ زکوۃ اور قضاء کے حوالے سے لکھی گئی یہ نہایت اہم تصنیف ہے، یہ کتاب دو جلدوں پر ہے، دارالعلوم الاسلامیہ بستی یوپی سے جولائی/ ۱۹۹۹ء تا جون ۲۰۰۰ء میں ایک ''معاصر فقہ اسلامی نمبر'' اشاعت خاص کے نام سے شائع ہوا ہے، جس میں ''حضرات علمائے دیوبند کی فقہی خدمات'' کے عنوان کے تحت مضمون نگار المعہد الاسلامی حیدرآباد کے ناظم محترم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''جدید مسائل پر لکھنے والوں میں ایک قابل ذکر نام میرے گرامی قدر دوست مولانا مفتی شبیر احمد صاحب (مرادآباد) کا ہے، موصوف کسی بھی موضوع پر پوری وسعت اور عمق کے ساتھ مطالعہ اور غور وفکر کے بعد قلم اٹھاتے ہیں، چنانچہ نئے مسائل کی بابت آپ کی تحریروں کا ایک مجموعہ ''ایضاح النوادر'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے، جو زیادہ تر اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا اور ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیت علماء ہند کے سوالات کے جواب ہیں''۔(۱)

(۶) ایضاح المسالک: یہ علم وفن کا گوہر پارہ ہے، علمی کتاب تو ہے ہی، ساتھ ساتھ زبان بڑی سلیس اور عام فہم ہے، جو مصنف کی قدرت انشاء کا منہ بولتا ثبوت ہے، اس کتاب میں آپ نے تقلید وتلفیق، ضرورت وحاجت، عرف وعموم اور عدول لمعنی المذہب وغیرہ موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

(۷) آسان دینی مسائل: ہندی زبان میں لکھی گئی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ہندی زبان میں بھی لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں، اس کتاب میں آپ نے روزمرہ پیش آنے والے ضروری مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔

(۸) تعلیق: فتاوی شامی پر تقریرات رافضی کی تعلیق اور حاشیہ ہے۔

(۹) مسائل قربانی: اس کتاب میں قربانی اور عقیقے کے حوالے سے اہم مسائل ہیں۔

(۱۰) حج وعمرہ کا آسان طریقہ: یہ بھی ایک مفید کتاب ہے۔

(۱۱) ماں باپ کے حقوق: کتاب تو مختصر ہے، مگر جامع ہے، حقوق الوالدین پر یہ کتاب لکھی گئی ہے، نہ جانے اپنے وطن سے دور آپ نے اپنے والدین کی کتنی خدمت کر سکی؟ آیا آپ جب فارغ از تعلیم ہو چکے تھے، تب والدین زندہ تھے یا دنیا سے رحلت کر گئے، اس کا پتہ نہیں؟

(۱۲) اسراف وفضول خرچی: ممکن ہے کہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہو، میری نظر سے نہیں گزری، آج کل اور تو اور مسلم معاشرے میں اسراف اور فضول خرچی کا جس طرح دور دورہ ہے، اس موضوع پر اہل علم وفن کا قلم اٹھانا بہت ضروری ہے، شاید اس ضرورت کی بنیاد پر آپ نے قلم اٹھایا ہوگا۔

(۱۳) ایضاح المسائل: تین سو تیرہ مسائل دینیہ پر مشتمل یہ کتاب ہے۔

ان مذکورہ مؤلفات مطبوعہ کے علاوہ بھی اور چند تصانیف زیر نظر ہیں، شاید اب تک ان میں سے کچھ منظر عام پر آ گئی ہوں، ان غیر مطبوعہ تصانیف میں سے چند قابل ذکر کتابیں درج ذیل ہیں:

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۱۶۹، بحوالۂ معاصر فقہ اسلامی نمبر، اشاعتِ خاص، ص:۳۳۲۔

(۱) غیر اسلامی ممالک میں بلاسود بنکاری۔

(۲) انشورنش کی شرعی حیثیت۔

(۳) غیر اسلامی ممالک میں اسلامی نظام قضاء کا تصور۔

(۴) اسلام میں زکوۃ کے مصارف اور فی سبیل اللہ کا مصداق۔

درس وتدریس اور تالیف وتصنیف کے تہ بتہ آپ نے اپنی اصلاح باطن کے لئے حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی سے تعلقات استوار کر لئے تھے، آپ نے حضرت باندوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت واجازت بیعت سے بھی سرفراز ہوئے، حضرت باندوی کے انتقال کے بعد نہ جانے آپ نے کس مرشد باکمال کی طرف رجوع کیا، آپ نے شاید پہلی مرتبہ ۱۹۹۲ء میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینۃ الرسولؐ کی سعادت حاصل کی تھی۔

تاہم اس کے بعد بھی مولانا نے اور چند مرتبہ حجاز مقدس کا سفر کیا، کہتے ہیں کہ آپ ہر سال حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کے لئے حجاز مقدس پہنچتے رہتے ہیں۔

مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے آپ کے اساتذہ کے نام اپنی کتاب میں درج کر دیئے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی ان سے مستعار لے کر یہاں درج کر دوں:

(۱) عارف باکمال حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، وصدیق محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

(۲) حضرت مولانا معراج الحق صاحب، صدر المدرسین دار العلوم دیوبند۔

(۳) حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی، مفتی اعظم ہند وسابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند۔

(۴) حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب، شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند۔

(۵) حضرت مولانا عبد الحق اعظمی صاحب، شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند۔

(۶) حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب، سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند۔

(۷) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب، استاد الحدیث دار العلوم دیوبند۔

(۸) حضرت مولانا الحاج ارشد مدنی صاحب، ناظم تعلیمات دار العلوم دیوبند۔

(۹) حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی صاحب، استاد الحدیث دار العلم دیوبند۔

(۱۰) حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب، مرتب فتاوی دار العلوم دیوبند۔

(۱۱) حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری، سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند۔

(۱۲) حضرت مولانا حسین احمد بہاری، سابق استاذالحدیث دارالعلوم دیوبند۔

(۱۴) حضرت الحاج مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری، داماد حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی ونائب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

حضرت مولانا قاری شبیر احمد صاحب گدوسراوی

حضرت مولانا قاری شبیر احمد صاحب کی ولادت ۱۹۴۷ء میں جنوبی منگڈو کی بستی گدوسرا میں ہوئی، آپ کے والد ماجد مولانا محمد امین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک عالم دین ہونے کا ساتھ بڑے صائب الرائے بزرگ تھے، ساتھ ہی ساتھ دور اندیش اور انصاف دوست بھی۔

مکتب نشینی کے بعد قاری صاحب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں ہوئی، عمر بڑھنے کے بعد آپ نے اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے پاکستان کا سفر کیا، وہاں پہنچ کر حیدرآباد کی معروف درسگاہ ٹنڈ اللہ یار میں داخلہ لیا، وہاں سے آپ متوسطہ اور اعلی تعلیم حاصل کر کے سند فراغت حاصل کی، اسی درسگاہ میں آپ نے حضرت العلامۃ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب، حضرت مولانا مفتی وجیہ صاحب اور حضرت مولانا قاری محمد قاسم صاحب سے خوب خوب استفادہ کیا تھا، فراغت کے معا بعد مولانا شبیر احمد صاحب سیدھے وطن آ گئے تھے۔

وطن واپسی پر آپ نے اپنے خاندان کے ایک صاحب جناب صالح احمد صاحب کی صاحب زادی سے شادی کی، اس کے بعد سے آپ نے اپنے علاقہ میں قرآنی تعلیم کی خدمات کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا، کہتے ہیں کہ مولانا بچوں کو قرآنی تعلیم دینے کے حوالے سے بڑے ماہر اور تجربہ کار انسان تھے، آپ بچوں کو بڑے پیار اور شفقت سے تعلیم دیا کرتے، تعلیم دینے کے دوران آپ ضرب تادیبی سے کبھی بھی کام نہیں لیا کرتے تھے۔

مولانا نے حج بیت اللہ اور زیارت مدینۃ الرسول کی نیت سے حجاز پہنچ کر حج وزیارت کی سعادت حاصل کی، آپ ایک ممتاز عالم دین، حسن سیرت اور حسن عمل کے پیکر انسان تھے، قاری تو تھے ہی، کہتے ہیں کہ آپ کی تلاوت میں بڑی کشش ہوتی تھی، غرض قاری شبیر احمد صاحب اپنے وقت کے ممتاز قاری القرآن الکریم سمجھے جاتے تھے۔

قاری صاحب کی اولاد میں محمد ابراہیم، محمد اسماعیل اور صفورہ خاتون سب حیات سے ہیں، اللہ تعالی ان کی حیات دراز کرے، آمین۔

الغرض اللہ کے اس نیک بندے نے مدت دراز تک قرآنی خدمات انجام دیتے ہوئے ۲۰۰۹ء میں ارکان بنگلا دیش کے سرحدی شہر ٹیکناف میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا شریف حسین صاحب نندا خالوی

حضرت مولانا شریف حسین بن شقدار علی بن مولانا عبدالباری کی ولادت ۱۹۴۵ء میں بستی نندا خالی شمالی منگڈو میں ہوئی، مولانا شریف حسین صاحب کے بیان کے مطابق آپ کے والد مرحوم شقدار علی صاحب بڑے پرہیزگار اور عالم دوست بزرگ تھے، آپ کے دادا مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ بڑے جید عالم دین تھے، جنہوں نے زندگی بھر علاقے میں رشد وہدایت کا چراغ جلائے رکھا تھا، وہ اپنے وعظ ونصیحت کے ذریعے لوگوں کو دین کی تعلیم سے نوازتے تھے۔

مولانا شریف حسین صاحب کی مکتب نشینی اپنی بستی کے مکتب میں ہوئی، مکتب میں مولوی زبیر احمد بن ماسٹر فیض الرحمن سے قرآن کریم کا ناظرہ اور ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد عاشقہ فارہ کے مدرسہ میں داخل ہوئے، یہاں حضرت مولانا احمد اللہ بن حضرت مولانا سراج الحق صاحب رامیوربیلی کی نگرانی میں جماعت دہم اور نہم تک کی تعلیم پائی، اس کے بعد دارالعلوم احمدیہ سعد اللہ سر گئے، وہاں حضرت مولانا میر احمد مبارک صاحب کے زیر سائے دو سال تعلیم پائی، بعد ازاں کواربیل آئے، وہاں مولانا محمد علی صاحب معروف بہ ٹھنڈا مولوی وغیر سے پڑھتے رہے، یہاں جماعت دوم تک کی تعلیم پا کر مدرسہ محمدیہ پرامپورو میں داخل ہوئے، یہاں سے جماعت اولی اور دورۂ حدیث کی تعلیم مکمل کر کے سند فراغت حاصل کی، موخر الذکر اس مدرسہ میں آپ کے اساتذہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا سید الامین صاحب منگنماوی، حضرت مولانا ابوالحسین صاحب عرب شاہ فاروی، حضرت مولانا عبد الحکیم صاحب کواربیلی نا قابل فراموش ہستیاں ہیں۔

فراغت کے بعد مولانا نے چند مہینے دارالعلوم شجاع فارہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۹۷۸ء میں آپ نے سعودی عرب کی راہ لی، ۱۹۸۰ء میں جمعیت علمائے اسلام ارکان کے کارکن بن کر حضرت مولانا عقیل احمد قاسمی اور حضرت عبد القدوس مظاہری کے تعاون کرتے رہے، ۱۹۸۲ء میں روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) میں شامل ہوگئے، چنانچہ آپ نے اس تنظیم کے زیر سائے بڑی بڑی قومی اور ملی خدمات انجام دیں، بعد ازاں ۱۹۸۶ء میں جناب شبیر حسین صاحب اور جناب اڈووکٹ نور الاسلام صاحب کی قیادت میں ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کا قیام ہوا تو مولانا اس میں شامل ہوگئے، پھر ۱۹۹۹ء میں ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کا اعلان

ہوا تو آپ اس کے متحرک کارکن بنے، ۲۰۰۷ء میں آپ اس جماعت کے جدہ یونٹ کے صدر رہے، آپ تنظیمی کاموں کو بڑے لگن سے انجام دیا کرتے تھے، مولانا نے عرصۂ دراز تک جدہ میں مقیم رہ کر ۲۰۲۰ء میں انتقال فرمایا، ویسے خاک جدہ میں مدفون ہیں۔

مولانا ایک جلیل القدر عالم دین ہونے کے علاوہ قومی ہمدردی کے حوالے سے یکتائے روزگار تھے، تنظیمی کاموں کے حوالے سے آپ ہمیشہ چوکنا رہا کرتے تھے، ایثار وقربانی کے حوالے سے مولانا سلف وصالحین کے یادگار بزرگ تھے، مولانا نے ناچیز کے ساتھ ۲۰۰۴ء سے لے کر آپ کی وفات ۲۰۲۰ء تک مسلسل کام کرتے رہے، آپ کو میں نے ایک دین دار، باجماعت نماز کے پابند، تہجد گزار اور نہایت مخلص انسان پایا، اللہ تعالی مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا شمس العالم صاحب گارڈ بیلی

حضرت مولانا شمس العالم ارکانی الملقب بہ ابو آیۃ اللہ شمس بن مولانا ابوالحسین کی ولادت ۱۹۵۳ء میں زین الدین فارہ کارڈ بیل شمالی منگڈو میں ہوئی، کارڈ بیل بلی بازار کے شمال میں چھ میل کے فاصلے پر واقع صدیوں پرانی ایک مسلم بستی ہے، اس بستی میں عرصۂ دراز سے ایک مدرسہ مع یتیم خانہ بنام ”مدرسہ رحمانیہ ویتیم خانہ“ موجود ہے، جہاں یتیموں اور مسکینوں کی خدمت ہوتی ہے۔

مولانا شمس العالم صاحب کا خاندان ایک فکری اور قومی خادموں کا خاندان ہے، آپ کے والد حضرت مولانا ابوالحسین صاحب ایک جلیل القدر عالم دین، داعی، معلم اور قوم کے خادم بزرگ گزرے، جنہوں نے اپنی حیات مستعار میں اس علاقے میں بڑی بڑی قومی وملی خدمات انجام دے کر اس دنیا سے رخصت لی، اللہ تعالی جنت الخلد میں جگہ عطا کرے۔

مولانا شمس العالم صاحب نے اعدادیہ سال سوم سے خامسہ تک کی کتابیں مدرسہ احمدیہ دارالعلوم سعد اللہ سر میں پڑھیں، اس کے بعد متوسطہ کی دینی تعلیم کے لئے چاٹگام جا کر مدرسہ معین السلام ہاٹھزاری میں داخلہ لیا، وہاں آپ نے خامسہ وسادسہ کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد آپ ہندوستان پہنچے اور دارالعلوم دیوبند میں موقوف علیہ اور دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، سن فراغت لگ بھگ ۱۹۷۳ء ہے، مولانا کافی ذہین وفطین طالب علم تھے، ارکان برما کے ہوں یا بنگال وہند کے غرض آپ نے جہاں بھی تعلیم حاصل کی کہ وہاں کے اساتذۂ کرام کے منظور نظر رہے، مطالعہ، مراجعہ اور تکرار کتب کے علاوہ درس کی حاضری آپ سے شاید کبھی چھوٹی ہوگی، پڑھائی کے زمانے میں آپ ایسے مشہور تھے کہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ممکن ہے لیکن مولوی شمس العالم صاحب کی غیر حاضری ممکن نہیں۔

مولانا شمس العالم صاحب ایک دین دار، پرہیزگار اور خداترس عالم دین ومعلم ہونے کے ساتھ ساتھ قومی ہمدردی اور دینی غیرت ونخوت رکھنے والے ایک مرد مجاہد بھی ہیں، مولانا عبدالقدوس صاحب مجاہد اور مولانا عبد الحمید صاحب مجاہد کے علی الرغم آپ حضرت مولانا میر احمد مبارک صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر فدا تھے، چنانچہ مولانا شمس العالم صاحب نے ۱۹۹۵ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان برما سے وابستہ ہوکر جہاد وانفار کا دینی فریضہ بھی انجام دیا تھا، نہ جانے مولانا ابھی کہاں ہیں، بہر حال آپ جہاں کہیں بھی ہوں، اللہ تعالی صحیح وسلامت سے رکھتے ہوئے دونوں جہاں میں سرفراز کرے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا صالح احمد صاحب نکھوروی

حضرت مولانا صالح احمد کی ولادت ۱۹۵۱ء میں شمالی منگڈو کی معروف ومشہور قصبہ نکھورہ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اس قصبہ کے مکتب میں ہوئی، جسمانی اعتبار سے کچھ بڑے ہوئے تو نکھورہ کے مدرسہ میں داخل ہوئے، اس مدرسہ سے آپ نے جماعت چہارم تک تعلیم پا کر ۱۹۶۶ء میں بوسیدنگ گئے، وہاں فندوفرانگ والے شاہ صاحب کے مدرسہ میں جماعت سیوم کی تعلیم پا کر اعلی تعلیم کے حصول کے لئے مشرقی پاکستان کے معروف شہر چاٹگام پہنچے، لیکن وہاں بعض وجوہات کی بنیاد پر تعلیم حاصل نہ کر سکے، ویسے چاٹگام کی گلی کوچے میں ایک سال سے زیادہ مدت تک پھرنے کے بعد قسمت نے ساتھ دیا تو بحری جہاز کے ذریعے مغربی پاکستان کے شہر کراچی پہنچ گئے تھے۔

مولانا صالح احمد صاحب نے حیدرآباد کی معروف درسگاہ ٹنڈ اللہ یار میں داخل ہوکر جماعت دوم سے لے کر دورۂ حدیث کی تعلیم پائی، آپ نہایت ذہین وفطین طالب علم تھے، چنانچہ جب تک آپ اس دینی وعلمی ادارہ میں پڑھتے رہے، اساتذۂ کرام کے منظور نظر رہے، علاوہ ازیں آپ شروع ہی سے ایک ملنسار اور متعاون انسان ہیں، چنانچہ آپ کے دیرینہ رفیق حضرت مولانا محمد بلال شرف الدین بیلی صاحب (مرحوم) کا کہنا ہے کہ:

> ”مولانا صالح احمد صاحب کو میں نے بچپن ہی سے دیکھتا آیا، آپ بڑے ملنسار، ہنس مکھ اور متعاون انسان ہیں، پڑھائی کے زمانے میں آپ ہر ایک ارکانی طالب علم کے گویا خادم رہے ہیں، ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہونا گویا آپ کی فطرت ثانیہ ہے، آپ کی یہی حالت زندگی بھر باقی رہی ہے“۔

مولانا صالح احمد صاحب فراغت تعلیم کے بعد کراچی میں رہائش پذیر ہوگئے، جہاں مدتوں تک معاش کی تلاش میں مشغول رہے، اس کے بعد آپ حجاز مقدس پہنچے، حج بیت اللہ وزیارت مدینہ منورہ کے بعد جدہ میں مقیم ہو گئے، وہاں آپ نے نجی تجارت شروع کی، بعد ازاں آپ نے اپنے دوستوں اور احباب سے مل کر کیلو اربعہ عشر جدہ میں ایک مدرسہ بنام ”مدرسہ فاروقیہ“ کی بنیاد رکھ کر اس کی ترقی اور فلاح کے کام میں مشغول ہو گئے، ایک طویل مدت تک اس مدرسہ کی خدمات انجام دیتے رہے تھے، لیکن افسوس ہے کہ ۲۰۰۱ء میں بعض نافرمانوں کی سازش اور نافرمانی کی وجہ سے آپ کو اس مدرسہ

سے سبکدوش ہونا پڑا تھا۔

مدرسہ فاروقیہ سے سبکدوشی کے بعد آپ نے اپنی رہائش گاہ کی نچلی منزل میں اور ایک مدرسہ ''مدرسۃ البنات'' کی بنیاد رکھی، جہاں بنات مسلمات کی تعلیم کے ساتھ کمپیوٹر کی تربیت دی جاتی ہے، تادم تحریر آپ کا یہ مدرسہ الحمدللہ بخوبی چل رہا ہے۔

مولانا صالح احمد صاحب نہایت ذہین، لسان، تیز وتند اور طرار عالم دین ہیں، بڑے حاضر دماغ اور حاضر جواب بھی، سیاسیات پر آپ کی خاصی نظر ہے، عالم اسلامی کے حالات پر عموما اور ارکان کے حالات پر خصوصا تڑپتے رہتے ہیں، بڑے صاف گو اور دل کے سچے انسان ہیں، مولانا کی دوسری خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ کم سے کم میری امید سے کہیں زیادہ سخی و شریف مہمان نواز نکلے ہیں، آپ کی رہائش گاہ گویا ایک احباب خانہ، عالم خانہ اور مسافر خانہ ہے، رہائش گاہ کی بالائی منزل میں دس بارہ سیٹیں ہمیشہ مسافروں کے لئے بچھی رہتی ہیں، سب کے لئے دو وقت کے کھانے اور ناشتے گھر ہی سے پک کر آتے ہیں، مولانا شاید کسی بھی مسافر سے کبھی یہ پوچھے ہوں گے کہ آپ کا یہاں کتنے دن کا قیام ہے، مہمان جتنے پرانے ہوجاتے اتنے ہی آپ سے مانوس اور قریب ہوجاتے ہیں، علاوہ ازیں درجن سے زیادہ احباب ہمیشگی کے ساتھ آپ کے یہاں پڑے رہتے ہیں، سخاوت کا یہ عالم ہے کہ ہر ایک احباب کے کھانے پینے سب کچھ آپ کے یہاں ہوتے ہیں، علاوہ ازیں آپ بڑے متواضع اور منکسر المزاج عالم دین ہیں، ہر ایک کو سکھ تو پہنچاتے رہتے ہیں، لیکن کسی کے دل میں دکھ پہنچانا آپ کی سرشت ہی میں نہیں ہے، جس سے بھی ملتے ہیں پرتپاک انداز میں ملتے ہیں۔

مولانا صالح احمد صاحب روہنگیا سیاسیات سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں، ماضی میں آپ نے مولانا محمد حنیف راغب فرندگی کے ساتھ مل کر کام کیا، لیکن بعد میں آپ ان سے مایوس ہوگئے تھے، ۲۰۰۵ء سے مولانا ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کے ممبر رہے، چنانچہ ۲۰۰۹ء کے دوران آپ اس تنظیم کے جدہ برانچ کے صدر بھی رہ چکے تھے، زندگی میں حضرت مولانا سے مجھے اتنے پیار اور اتنی شفقت ملی ہے کہ جس کے بیان سے میری زبان وقلم قاصر ہے، عرصۂ دراز تک آپ اس موخر الذکر تنظیم کے جدہ دفتر میں شام ڈھلے حاضر ہوجاتے رہے تھے، بڑے فراخ دل انسان ہیں، دفتر میں جتنے بھی ممبران اور زائرین آیا کرتے سب کو آپ اپنے جیب خاص سے کھلاتے پلاتے اور تواضع میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔

پچھلے زمانے کی بات تو میں زیادہ نہیں بتا سکتا، لیکن میری موجودگی کے زمانے مولانا صالح احمد صاحب کے قریبی علماء دوستوں میں حضرت مولانا مفیض الرحمن صاحب نلبنوی، حضرت مولانا محمد بلال صاحب شرف الدین بیلوی، حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی، حضرت مولانا شریف حسین صاحب نندا خالوی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب سالی فرانگی، مولانا کلیم اللہ صاحب سندی فرانگی، حضرت مولانا ڈاکٹر بشیر احمد صاحب خواندکار فاروی اور حضرت مولانا ابوالفیاض صاحب قابل ذکر ہیں۔

کم سے کم ۲۰۰۹ء سے لے کر ۲۰۱۸ء تک مولانا صالح احمد صاحب نے مجھے بہت پیار دیا تھا، اور تو اور جبھی گھر میں کوئی اچھے کھانے پکتے یا خود پکاتے تو ٹیلیفون کے ذریعے ناچیز کو یاد فرماتے، جب تک میری حاضری نہیں ہوتی آپ بشمول جملہ احباب کرام انتظار کرتے، جبھی میں حاضر ہوتا تو آپ کی آنکھیں چمک اٹھتیں، اور خوشی کا یہ عالم ہوجاتا کہ گویا برسوں کی جدائی کے بعد اچانک ایک جگری دوست سے ملاقات ہوگئی ہو۔

۲۰۱۸ء میں میں سعودی عرب سے بنگلا دیش پہنچا تو آپ کبھی کبھار ٹیلیفون کے ذریعے مجھے یاد فرماتے ہیں، آپ کی آواز سے لگتا ہے کہ آپ میری جدائی سے بڑے بے چین اور پریشان ہیں، اللہ تعالی حیات میں برکت کے ساتھ آپ کو اس محبت کا بدلہ دنیا وآخرت میں ضرور دے، آمین۔

حضرت مولانا عبدالجبار صاحب گدوسراوی

حضرت مولانا عبدالجبار بن محمد بن مولانا حافظ یعقوب صاحب کی پیدائش بستی گدوسرا جنوبی منگڈو میں ہوئی، آپ کا خاندن علماء و مشائخ اور علم و عمل کا خاندان ہے، عرصۂ دراز سے آپ کے خاندان کے بزرگوں نے قوم وملت کی خدمات انجام دیتے ہوئے یہاں علم وعرفان کی روشنی پھیلائی ہے، اللہ تعالی ان سب کی خدمات کو قبول کرے، آمین۔

مولانا عبدالجبار صاحب نے مکتب نشینی کے علی الرغم ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی گدوسرا میں پاکر متوسطہ اوراعلی دینی تعلیم مدرسہ عالیہ شقدار فارہ میں پائی، دراں حالیکہ شقدار فارہ کی اس نورانی درسگاہ میں وقت کے بڑے بڑے اساتذۂ کرام درس وتدریس کی محفل میں شمع فروزاں بنے ہوئے تھے، جن میں حضرت مولانا سید الامین صاحب منگنماوی، حضرت مولانا ابوالحسین صاحب عرب شاہ فاروی، حضرت مولانا بشیر اللہ صاحب محدث، حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب اور محدث العصر حضرت مولانا مرحوم سعید عظیم/ سید عظیم صاحب قابل ذکر ہیں، چنانچہ مولانا عبدالجبار وقت کے ان تمام اساتذۂ کرام سے مستفید ہوئے تھے۔

کہتے ہیں کہ مولانا عبدالجبار صاحب بڑے ذہین وفطین طالب علم اور بعد میں عالم دین تھے، درس حدیث کے حلقے میں متن خوانی میں اپنے تمام ساتھیوں کے درمیان ممتاز تھے، ویسے اساتذہ کرام آپ کو بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مولانا عبدالجبار صاحب دینی تعلیم سے فارغ ہوئے تو نیا فارہ (گدوسرا) کے ایک خوش حال گھرانے میں آپ کا رشتہ طے پایا، چنانچہ آپ نے جناب ظفر احمد کی صاحب زادی سے شادی کر کے اپنی زندگی کو روشن اور منور کیا، کہتے ہیں کہ آپ کی اہلیہ محترمہ نہایت خوش اخلاق ہونے کے ساتھ دینی وعملی اعتبار سے بھی نہایت بلند مرتبہ کی حامل تھی۔

مولانا عبدالجبار صاحب نہایت پاکیزہ خیالات کے عالم دین تھے، کسی کے دل میں دکھ پہنچانا جانتے ہی نہیں تھے، غرض آپ قوم کے ایک خادم انسان تھے، چنانچہ عرصۂ دراز تک دین اور علم دین کے علاوہ قوم کی خدمات انجام دیتے ہوئے آپ اس دنیا سے کوچ کر گئے، آپ نیا فارہ گدوسرا کی قبرستان میں مدفون ہیں، اللہ تعالی آپ کے درجات بلند کرے، آمین۔

حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب باغگونوی منگڈوی

حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب تقریبا ۱۹۲۳ء میں جنوبی منگڈو کی معروف بستی باغگونہ میں پیدا ہوئے، آپ کے خاندان کو علاقے میں ایک معزز خاندان مانا جاتا ہے، جس میں دین دار، نیک لوگوں کی نہ کمی تھی اور آج بھی نہ کمی ہے۔

مولانا عبدالجلیل صاحب نشو ونما کے ساتھ مکتب نشینی اور ابتدائی تعلیم علاقہ میں پاکر اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان پہنچے اور دارالعلوم دیوبند میں جا داخل ہوئے، کہتے ہیں کہ مولانا نے دوران تعلیم بڑی محنت اور لگن سے تعلیم حاصل کی تو آپ اساتذۂ کرام کے منظور نظر بن گئے تھے، بہر حال ایک روایت کے مطابق آپ نے ۱۹۴۷ء میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی۔

ہماری سوانحی تاریخ میں دیکھا گیا ہے کہ ہمارے بعض علمائے دین ہندوستان سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد یا تو وہاں رہ گئے یا ہندوستان سے پاکستان یا عالم اسلام کے دیگر ملکوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے، لیکن مولانا عبدالجلیل صاحب فراغت تعلیم کے معابعد ارکان یعنی وطن تشریف لائے تھے۔

مولانا عبدالجلیل صاحب وطن آتے ہی درس وتدریس میں مشغول ہو گئے، آپ نے تقریبا ۱۹۶۵ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں مختلف علوم وفنون کی مختلف کتابیں پڑھائیں، کہتے ہیں کہ درس و تدریس کے حوالے سے مولانا کا انداز ہی نرالا تھا، ہر ایک کتاب کو طلباء کے ذہن نشین کرانے میں آپ بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، جو کچھ بھی پڑھاتے بڑے اخلاص اور تندہی سے پڑھایا کرتے تھے، اس لئے آپ پر آپ کے تلامذہ نہایت خوش تھے، آپ سے تعلیم حاصل کر کے آپ کے تلامذہ جہاں کہیں بھی جاتے آپ کی مدح سرا رہتے تھے، مولانا کے شاگردوں میں میں نے بہتوں کو دیکھا کہ وہ مولانا کی مدح سرائی میں رطب اللسان تھے۔

مولانا عبدالجلیل صاحب ایک جلیل القدر عامل عالم دین اور مایۂ ناز مدرس ومعلم تھے، آپ نے اپنی پوری عملی زندگی کو درس وتدریس اور تعلیم و تعلم میں گذار کر تقریبا ۱۹۸۴ء میں وفات پائی، انا للہ وانا الیہ راجعون، آپ خاک وطن میں مدفون ہیں۔

مولانا عبدالجلیل صاحب کے فرزندوں میں مولانا بدر الدجی اور مولانا بدر العالم صاحبان بڑے لائق و فائق علماء ہیں، جو شہر مدینہ منورہ میں مقیم ہیں، اللہ تعالی ان دونوں عالم دین کی عمر دراز کرے اور ان کو بھی دین اور قوم کی خدمات کے لئے قبول فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کیلاڈنگی

سرزمین ارکان میں اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم دین اور بزرگ ترین شخصیت حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب کی پیدائش جنوبی منگڈو کی معروف ومردم خیز بستی کیلا ڈنگ میں ہوئی، آپ کا خاندان اس علاقے کا معروف خاندان ہے، آپ کے والد صاحب ایک باثروت لیکن درویش صفت اور خدمت خلق کے حوالے سے یکتائے روزگار بزرگ تھے، کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ مرحومہ بھی نہایت بلند اخلاق والی ایک خاتون اسلام تھی۔

یادر ہے کہ بستی کیلا ڈنگ میں دو عبدالرحمن گزرے ہیں، اور دونوں کے دونوں وقت کے بڑے عالم دین مانے جاتے تھے، ایک کو مولانا عبدالرحمن کبیر جب کہ دوسرے کو مولانا عبدالرحمن صغیر سے پہنچانا جاتا تھا، سر دست جس کا تذکرہ یہاں کیا جا رہا ہے یہ عبد الرحمن کبیر صاحب ہیں، جب کہ ثانی الذکر حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب (صغیر) کا تذکرہ بھی اس کاوش کی زینت بنا ہوا ہے۔

مولانا عبدالرحمن صاحب کا نشوونما اور مکتب نشینی اپنی بستی کے مکتب میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کرنے کے بعد آپ ہندوستان تشریف لے گئے اور دارالعلوم دیوبند میں عرصۂ دراز تک تعلیم حاصل کی، اور وہاں کے اساتذۂ کرام سے مستفید ہوئے۔

تعلیم کے دوران آپ نے فقیہ الہند حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے تعلق پیدا کیا، ان کے ہاتھ میں بیعت ہوکے منازل سلوک طے کیں، تاہم اور ایک روایت ایسی بھی ملی ہے کہ آپ نے حضرت مولانا گنگوہی سے نہیں بلکہ مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے نسبت پیدا کر کے منازل سلوک طے کی تھیں۔

مولانا عبدالرحمن صاحب (کبیر) کے حوالے سے زیادہ معلومات تو نہیں مل سکیں، تاہم اتنی سی بات ضرور ملی کہ آپ ایک بڑے عالم دین اور سلوک وطریقت کی منازل طے کئے ہوئے روحانی آدمی تھے، علاوہ ازیں بڑے صاحب ثروت بھی تھے اور نہایت سخی بھی۔

حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کا انتقال کیلا ڈنگ میں ہوا اور مدفون بھی وہیں ہیں، آپ کی اولاد میں دولار واسوگری معروف آدمی گزرا ہے، اللہ تعالی مولانا کی قبر پر باران رحمت برسائے اور آپ کے درجات بلند کرے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کیلاڈنگی

حضرت مولانا عبدالرحمن المعروف بہ عبدالرحمن صغیر صاحب جنوبی منگڈو کی بستی کیلا ونگ میں پیدا ہوئے، نشوونما اور مکتب نشینی بھی کیلا ڈنگ میں ہوئی، اس کے بعد ابتدائی تعلیم آپ نے علاقے کی دینی درس گاہوں میں پائی، ہندوستان جاکر تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا تو والدین اور اساتذہ کی اجازت ملنے پر آپ ہندوستان جاکر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، وہاں آپ نے متوسطہ اور اعلی دینی تعلیم حاصل کی، مولانا کو قریب سے دیکھنے اور جاننے والے بہتوں کا کہنا ہے کہ آپ بلا کے ذہین تھے، ویسے تھوڑی مدت میں دارالعلوم کے اساتذۂ کرام کے نورِ نظر بن گئے تھے۔

مولانا فراغت کے بعد وطن واپس آئے تو طالبان علوم نبوت حصول علم کے لئے آپ پر ٹوٹ پڑے، آپ نے عرصۂ دراز تک مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں تعلیم دی، نحو وصرف کے بڑے ماہر معلم تھے، چنانچہ آپ کے متعلق حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی کا بیان ہے کہ:

> ''حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب (صغیر) کیلاڈنگی ایک جلیل القدر عالم دین اور ممتاز مدرس ومعلم تھے، آپ کے تلامذہ میں وقت کے بڑے بڑے علماء اور فضلاء ملتے ہیں، جنہوں نے بھی اپنے لائق استاد کی طرح درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کے حوالے سے بڑی بڑی خدمات انجام دیں، روایت ہے کہ مولانا عبد الرحمن صاحب نحو وصرف کے امام تھے، شرح ملا جامی وغیرہ کتابیں آپ حفظ پڑھایا کرتے تھے، غرض بڑے ممتاز اور محقق عالم دین تھے، علوم وفنون میں یکتائے روزگار ہونے کے علاوہ آپ زہد وتقوی کے حوالے سے بھی مجسم بزرگ تھے''۔

مولانا عبدالرحمن صاحب کی اولاد میں جناب ماسٹر حبیب اللہ صاحب، جناب نذیر اللہ رواسوگری کے علاوہ جناب ماسٹر وجیہ اللہ صاحب کا نام تاریخ ارکان کبھی بھولنے نہیں پائے گی، ہماری تاریخ کی مایۂ ناز شخصیت جناب ماسٹر وجیہ اللہ صاحب بڑے ذہین اور مدبر سیاست دان اور مجاہد انسان تھے، جن کا تذکرہ میری اس کاوش میں شامل ہے۔

حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کی وفات کیلا ڈنگ میں ہوئی، اور مدفون بھی وہیں ہیں، اللہ تعالی آپ کے درجات بلند کرے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب کیلادنگی

حضرت مولانا عبدالسبحان بن دھلا رواسوگری بن حضرت مولانا عبدالرحمن (کبیر) کی پیدائش جنوبی منگڈو کی معروف ومردم خیز بستی کیلادنگ میں ہوئی، آپ کا خاندان ایک باثروت ہونے کے علاوہ بااقتدار اور اثر ورسوخ والا خاندان ہے، علاوہ ازیں اس خاندان میں علمائے کرام اور مشائخ عظام کی بھی کوئی کمی نہیں تھی، جن میں آپ کے دادا حضرت مولانا عبدالرحمن صاحبؒ بڑے باکمال اور نامور عالم دین گزرے ہیں۔

مولانا عبدالسبحان صاحب کا نشوونما اور مکتب نشینی بستی کے مکتب میں ہوئی، مولانا کی خداداد صلاحیت بچپن ہی سے سامنے آگئی تھی، چنانچہ آپ کے اساتذۂ کرام نے آپ کے والد صاحب جناب دھلا رواسوگری صاحب سے کہا کہ عبدالسبحان ماشاء اللہ ذہین وفطین ہے، اس لئے اسے علم دین کے حصول کے لئے مدرسہ میں داخل کرا دیا جائے، ویسے اساتذہ کی یہ بات والد صاحب کے دل میں اتر گئی تو آپ کو مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں داخل کر دیا گیا تھا۔

مولانا عبدالسبحان نے ابتدائی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں پائی، اس مدرسہ میں مولانا مستفیض الرحمن صاحب، مولانا نجم الدین صاحب اور مولانا محمد سلطان صاحب آپ کی ابتدائی تعلیم کے اساتذہ ہیں، اس مدرسہ میں چند سال پڑھنے کے بعد متوسطہ اور اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے آپ ہندوستان گئے، اور وہاں کے ایک مدرسہ سے مستفید ہوکر وطن واپس آئے تھے۔

مولانا وطن واپس آنے کے بعد اول اول محلے کے مدرسہ فرقانیہ میں تعلیم دیتے رہے، کہتے ہیں کہ مولانا کی تعلیم میں بڑی برکت تھی کہ جو بھی آپ سے تعلیم پایا وہ کسی نہ کسی اعتبار سے اہل دین کے زمرہ میں شامل ہوگیا تھا۔

مولانا بستی کے فرقانیہ میں چند سال تعلیم دینے کے بعد مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ کے مدرس مقرر ہوئے، وہاں آپ نے عرصۂ دراز تک دینی تعلیم دی تھی، پھر جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ بڑے حسن صفات کے حامل عالم دین تھے، طلبائے مدرسہ آپ کو ایک مثالی معلم کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے، اور آپ بھی اپنے تلامذہ کو ایک باپ کی طرح شفقت کرتے اور پیار دیتے تھے، آپ نے عرصۂ دراز تک علم دین کی خدمت کرتے ہوئے بالآخر ۱۹۸۰ء میں وفات پائی اور کیلادنگ کی خاک میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب گارڈ بیلی

حضرت مولانا مفتی عبدالشکور بن مولانا حبیب احمد صاحب کی ولادت بلی بازار کے شمال میں چھ میل کے فاصلے پر واقع بستی کارڈ بیل میں ۲/فروری/۱۹۴۱ء میں ہوئی، آپ کے والد محترم مرحوم مولانا حبیب احمد صاحب علم وعمل کے رسیا عالم دین تھے، مولانا عبدالشکور کی ولادت کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے ایک روایت نقل کی ہے کہ:

> ''مفتی صاحب کی ولادت اور نام کے سلسلے میں مشہور ہے کہ ایک مرتبہ مفتی صاحب کے والد محترم بوسیدنگ تشریف لے گئے تھے، تاکہ وہاں موجود اپنی زمینوں کا کرایہ وصول کریں، مفتی صاحب کے والد محترم رات عشاء کے بعد کھانا تناول فرما رہے تھے کہ اچانک ایک مجذوب (عبدالمطلب فقیر نام ہے، جو کبھی کبھار جنگل سے آبادی میں آجاتا تھا) آیا اور کہا کہ مولوی صاحب تم ادھر مزیدار کھانوں میں مشغول ہو اور ادھر تمہاری بیوی دردزہ میں مبتلا ہے، یہ کہہ کر کچھ پانی میں دم کردیا، مولوی صاحب نے مجذوب کی بات کو سنی ان سنی کردی، رات گزر گئی، صبح مجذوب پھر آیا اور کہا کہ تیرے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے، عبدالشکور نام رکھنا، وہ بڑا عالم دین ہوگا، چنانچہ مولوی صاحب گھر پہنچے تو دیکھا کہ واقعی لڑکا پیدا ہوا ہے، بہر حال مولوی صاحب مجذوب کے کہنے کے مطابق نومولود کا نام عبدالشکور رکھا، جو واقعی بڑے عالم دین بنے، ورنہ مولوی صاحب کی خواہش تھی کہ نومولود کا نام فاروق رکھا جائے، لیکن مجذوب کی پیشین گوئی پرعمل کیا گیا''۔(۱)

مفتی صاحب کی ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں ہوئی، برمیز اور اردو ساتویں کلاس تک کی تعلیم اپنے علاقے کے مکتب اور سرکاری اردو میڈل اسکول میں ہوئی، اس کے بعد مدرسہ احمدیہ سعد اللہ سر گئے، جہاں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۵ء کے اواخر تک پڑھے، ۱۹۵۶ء کی ابتدا میں دارالعلوم میانجا نفور گئے، جہاں ۱۹۶۰ء تک پڑھتے ہے، اس کے بعد اسی سال مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ پہنچے اور وہاں ایک

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۱۶۱-۱۶۲-

سال پڑھنے کے بعد بنگلا دیش کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری تشریف لے گئے جہاں مسلسل چارسال پڑھ کر ۱۹۶۳ء کے اواخر میں سندفراغت حاصل کی۔

مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے مفتی صاحب کے قابل ذکر اساتذہ کے اسمائے گرامی اپنی تالیف میں درج کئے ہیں، جسے مطالعہ کے بعد جہاں مفتی صاحب کے اساتذہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچیں، وہیں آپ کے دوران تعلیم ان مدارس میں قابل ذکر کون کون اساتذہ تھے ان کی معلومات بھی حاصل ہوگئی ہے۔

مفتی صاحب کے دوران تعلیم سعداللہ سروالے اساتذہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

(۱) استاد الکل حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۲) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۳) حضرت مولانا محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۴) حضرت مولانا عبدالحمید صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

دارالعلوم میانجانفور کے قابل ذکر اساتذہ یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا میر احمد مبارک صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۲) حضرت مولانا مفتی محمد سلطان صاحب ریدوی رحمۃ اللہ علیہ۔
(۳) حضرت مولانا قاری عبدالودود صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۴) حضرت مولانا محمود الحسن صاحب۔
(۵) حضرت مولانا عبدالغفور صاحب (بعد میں مدرسہ دارالسنۃ نہلا کے سینئر استاد)
(۶) حضرت مولانا ظفر علی صاحب کومیر خالوی۔
(۷) حضرت مولانا نذیر احمد صاحب۔

مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں آپ جن اساتذہ سے مستفید ہوئے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا نور احمد صاحب گدوسراوی رحمۃ اللہ علیہ۔
(۲) حضرت مولانا نجم الدین صاحب نلبنوی رحمۃ اللہ علیہ۔
(۳) حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب شقدارفاروی رحمۃ اللہ علیہ۔
(۴) حضرت مولانا نثار احمد صاحب باغکونوی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۵) حضرت مولانا نور محمد قادربیلوی رحمۃ اللہ علیہ۔

آپ نے مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری پہنچ کر وہاں وقت کے بڑے بڑے اساتذہ اورعلم عمل کے حوالے سے قابل تقلید انسانوں سے بھرپور استفادہ کیا، آپ نے یہاں جن حضرات علمائے کرام سے خاص طور پر استفادہ کیا، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۲) حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۳) مفتی اعظم بنگلا دیش حضرت مولانا مفتی فیض اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۴) حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مجاز بیعت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)
(۵) حضرت مولانا مفتی احمد الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۶) حضرت مولانا ابوالحسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (صاحب تنظیم الاشتات)
(۷) حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۸) حضرت مولانا نادرالزمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔
(۹) حضرت مولانا احمد شفیع صاحبؒ (مجاز بیعت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ)

اسی طرح مفتی صاحب کے چند ناقابل فراموش معاصرین کے اسمائے گرامی بھی ملاحظہ ہو:

(۱) حضرت مولانا سید عالم صاحب، مہتمم دارالعلوم میانجانفورؒ۔
(۲) حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب چارکبوی رحمۃ اللہ علیہ۔
(۳) حضرت مولانا نذیر احمد صاحب باغکونوی منگڈوی، سابق مہتمم مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ۔
(۴) حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حنیف صاحب۔
(۵) حضرت مولانا مفتی اظہار الاسلام صاحب، بانی ومہتمم جامعۃ العلوم لال خان بازار چاٹگام۔
(۶) حضرت مولانا محمد خالد صاحب، سابق نائب مہتمم مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری۔
(۷) حضرت مولانا ابوبکر صدیق صاحب۔
(۸) حضرت مولانا محمد یونس صاحب منگڈوی۔
(۹) حضرت مولانا امداد الحق صاحب سلہٹی۔

فراغت تعلیم کے مابعد کی بعض خدمات کے حوالے سے مولانا حافظ صدیق صاحب خود مفتی صاحب

کی زبان سے سن کر ایک اجمالی روایت اپنی کتاب میں درج کر دی ہے، اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کے کارنامے خود آپ کی زبانی سن لیں:

''میں نے فراغت کے بعد وطن آتے ہی جامع مسجد کی امامت اور خطابت کے ساتھ علمائے کرام اور ہمدردان ملت کے اتفاق سے مدرسہ مدینۃ العلوم کی بنیاد ڈالی، جس میں جماعت ششم (قدوری کافیہ وغیرہ) تک مع شعبۂ تحفیظ القرآن کی تعلیم ہوتی تھی، اور روضۃ الاطفال میں فرقانیہ شعبہ میں ڈیڑھ سو سے زائد نونہالان اسلام تعلیم حاصل کرتے تھے، اس نو بنیاد مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری قبول کرنی پڑی''۔(۱)

بعد میں ایک طویل زندگی کے حصوں کے اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:

(۱) ۲۳/ جولائی/ ۱۹۶۵ء بروز جمعہ چوہدری احمد الرحمن صاحب مرحوم سابق ممبر ڈسٹرکٹ کونسل اکیاب کی صاحب زادی سے جامع مسجد گارڈ بیل میں آپ کا عقد نکاح ہوا۔

(۲) ۱۹۶۶ء میں آپ بغرض سیاحت وعلاج برما کے دار الحکومت رنگون گئے، وہاں رنگون کے علاوہ برما کے بعض دیگر شہروں جن میں مانڈلے، لاشو، ٹمٹو وغیرہ قابل ذکر ہیں کا دورہ بھی کیا، اور بعض جگہوں میں امامت اور خطابت کی خدمات بھی انجام دیں، اور اس دورے کے حوالے سے ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنی کوشش اور ذاتی محنت سے اٹھویں کلاس تک برمیز کی تعلیم بھی حاصل کر لی تھی، بعد میں آپ وطن واپس لوٹ آئے تھے۔

(۳) ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۲ء تک آپ نے مدرسہ رحمانیہ ویتیم خانہ کارڈ بیل میں صدر المدرسین کے فریضے انجام دیئے تھے۔

(۴) ۱۹۷۳ء میں آپ مدرسہ احمدیہ سعد اللہ سر کے مدرس مقرر ہوئے، یہاں آپ نے بحسن وخوبی تدریسی خدمات انجام دیں۔

(۵) ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۸ء تک آپ نے منگڈو کے شمالی علاقے کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ اشاعت العلوم کی انتظامی ذمے داری بڑی خوبی سے نبھائی۔

(۶) ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۲ء تک آپ مدرسہ معین الاسلام صاحب بازار منگڈو میں صدر مفتی اور صدر المدرسین

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۱۶۳۔

رہے، اور دورہ شریف کی کتابوں میں بخاری شریف، مسلم شریف اور ابوداؤد شریف کے علاوہ دیگر فنونات کی کتابیں آپ کے زیر درس رہیں۔

(۶) ۱۹۹۲ء میں برمی وحشیوں کے مظالم سے تنگ آ کر آپ بنگلا دیش پہنچے۔

(۷) آپ نے ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۴ء تک کوکس بازار کے جنوب میں واقع گندم کے ایک مدرسہ ''اشرف العلوم'' میں تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ مہاجرین ارکان کی خدمات بھی انجام دیں۔

(۸) آپ ۱۹۹۴ء کے اواخر میں جنوبی کوکس بازار کی معروف دینی اور اخلاقی درسگاہ ''مدرسہ دار السنۃ نہلا'' میں استاد حدیث مقرر ہوئے، جہاں آپ نے تعلیمی خدمات کے علاوہ وہاں کے شعبۂ افتاء میں بھی خاصی خدمات انجام دیں۔

(۹) تعلیمی خدمات کے علاوہ آپ ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۹۲ء تک جمعیت العلماء شمالی کریچنگ کے عہدۂ صدارت پر فائز رہے۔

(۱۰) آپ نے ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۰ء تک آل برما جمعیت العلماء کانفرنس میں پورے منگڈو وعلاقے کی نمائندگی کے فرائض انجام دیئے۔

(۱۱) آپ ۱۹۷۴ء سے لے کر اگلے چند سال تک علاقائی سرکاری کمیٹیوں کے رکن رہے۔

(۱۲) ۱۹۷۴ء سے لے کر آپ نے چند قومی، دینی، اسلامی اور انقلابی تحریکوں میں شامل رہ کر قومی، ملی اور ملکی خدمات سر انجام دیں۔

(۱۳) ایک بات آپ کی زندگی کے حوالے سے رہ گئی ہے، جس کا تذکرہ حافظ محمدیق صاحب نے بھی کیا اور میں نے بھی خود مولانا کی زبان سے سنی تھی کہ: دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری کے دوران تعلیم حضرت مولانا عبد الوہاب صاحب کی زیر صدارت انجمن خدام الاسلام کی تشکیل ہوئی تو اس میں مولانا مفتی عبد الشکور صاحب جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے تھے، اس انجمن نے ایک طویل زمانے تک مہاجرین ارکان کے علاوہ ارکانی مسلمانوں کی امداد وتعاون اور طلبائے ارکان کی سرپرستی کے حوالے سے بہت ساری خدمات انجام دی تھیں۔

(۱۴) حرکۃ الجہاد الاسلامی نامی تنظیم کی بنیاد پڑی تو آپ نے اس تنظیم کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس تنظیم کی سرپرستی کرتے ہوئے تنظیم کو بام عروج پر پہنچایا، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''بنگلا دیش اور برما میں اس جماعت کو بام عروج تک پہنچانے میں مفتی صاحب کا قلم ، گفتار، کردار اور روز و شب کی جد و جہد کارفرما ہے ،مفتی صاحب مدظلہ ۱۹۹۲ء میں اس جماعت کے ناظم اعلی بنے اور دم آخر تک اس مفوضہ فرائض احسن طریقے سے انجام دیئے، ۱۹۹۵ء میں حرکۃ الجہاد کا ترجمان ''الرباط'' منظر عام پر آیا، راقم السطور مدیر اور مفتی صاحب مدیر اعلی مقرر ہوئے ، اور ۲۰۰۱ء تک اس کے شمارے منظر عام پر آتے رہے، لگ بھگ ۳۵ شمارے شائع ہوئے ،مفتی صاحب نے اس رسالہ کو جاندار بنانے کے لئے بنگلا دیش سے جو مضامین بھیجے، اگر انہیں یکجا کر کے شائع کیا جائے تو مستقل ایک کتاب بن جائے گی ،منتشر صورت میں تو الرباط کے مختلف شماروں میں محفوظ ہیں،طبع شدہ کتاب ''برمی جمہوریت اپنے مظالم کے آئینے ہیں'' بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے،مفتی صاحب کو فتوی نویسی میں بے انتہا مہارت حاصل ہے،مفتی صاحب اردو، عربی، برمیز اور بنگلہ زبان میں جو اہم فتاوے تحریر فرمائے ، اگر انہیں یک جا کر کے طبع کر دیا جائے تو فتاوی کی دنیا میں ایک اہم باب کا اضافہ ہوگا''۔(۱)

مولانا مفتی عبدالشکور صاحب بڑے آن بان کے انسان ہیں، بڑے سخی اور مہمان نواز کی حیثیت سے معروف بھی ہیں ،حضرت کی گفتار و کردار کے مابین کوئی فرق نہیں ہے،سنت رسولؐ کے بہت پابند جلیل القدر عالم دین ہیں ،علاوہ ازیں آپ ایک منجھے ہوئے سیاست دان اور ایک دل جلے خادم قوم بھی ہیں،آپ نے اپنے تزکیہ اور اصلاح باطن کے لئے وقت کے عظیم شیخ المشائخ اور آپ کے استاذ حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ و مجاز بیعت حضرت تھانویؒ) کی طرف رجوع فرمایا، ان کے پاک ہاتھ پر بیعت ہو کر اصلاح اور تزکیہ نفس میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھی ، پھر حضرت مولانا عبدالوہاب صاحبؒ کے انتقال کے بعد ان کے اجل خلیفہ حضرت مولانا عبدالعزیز محدث مدرسہ معین الاسلام کی طرف رجوع فرمایا تھا،اللہ تعالی مولانا کی حیات میں برکت دے، آمین۔

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما،ص:۱۶۵۔

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب گدوسراوی

حضرت مولانا عبدالغفار بن حافظ سید علی کی پیدائش جنوبی منگڈو کی مردم جر بستی گدوسرا میں ہوئی، آپ اس علاقے کے معروف عالم دین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا بھانجہ ہیں، مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنی بستی گدوسرا میں پائی، کچھ سیانے ہوئے تو اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، وہاں آپ نے متوسطہ کی تعلیم سے لے کر اعلی تعلیم پائی، دورۂ حدیث شریف کی تکمیل از ہر ہند دارالعلوم دیوبند سے کی، آپ کے اساتذۂ کرام میں شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شاہ اصغر حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ قابل ذکر ہیں ، یاد رہے کہ وطن عزیز میں بھی آپ نے وقت کے جید علماء اور اساتذۂ فن سے تعلیم حاصل کی تھی، جن میں حضرت مولانا عبدالرحمن صاف صغیر کیلا ڈنگی، حضرت مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب گدوسراوی ،حضرت مولانا سعید الرحمن صاحب حائندہ فاروی، حضرت مولانا لعل محمد صاحب خیر فاروی اور حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب جامبنوی رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالغفار صاحب تعلیم سے فراغت بعد ہندوستان سے وطن واپس آئے تو آپ کی شادی خانہ آبادی جنوبی چاٹگام کے معروف علاقہ چکریا کے ایک معزز خاندان میں ہوئی، جہاں تک درس وتدریس کا سوال ہے، اس کے حوالے سے آپ کے فرزند رشید حضرت مولانا سیف اللہ صاحب رقمطراز ہیں کہ:

'' میرے والد محترم حضرت مولانا عبد الغفار صاحب فراغت تعلیم کے بعد ہندوستان سے اپنے وطن ارکان میں آنے کے بعد مدتوں تک تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے، قرآنی تعلیم کے ساتھ ساتھ طالب علموں کو عربی کے مبادیات نحو، صرف اور ادب وغیرہ تقریرا اور تحریرا بڑی تاکید سے پڑھایا کرتے تھے، یہاں خوشخط لکھنے کی بنیاد آپ نے ڈالی تھی''۔

مولانا اپنی عمر کے آخری مرحلہ میں مدرسہ منار الہدی اعزاز العلوم گدوسرا میں تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے، آپ فن طبابت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، طبیب اور حکیم تھے، مریضوں کا علاج انگریزی اور حکیمی دونوں طریقوں سے کرتے تھے، تعلیم اور طبابت کے ساتھ ساتھ گھر کا کام بذات خود انجام دیا

کرتے تھے، آپ کا مزاج تھا کہ وہ اپنے کام خود کیا کرتے تھے، یعنی دوسروں سے خدمات لینا پسند نہیں کرتے تھے، مولانا قرآن کریم کا حافظ بھی تھے، فن نحو وصرف میں خاصی مہارت رکھتے تھے، کہتے ہیں کہ آپ سے جن طالب علموں نے نحو وصرف کا فن پڑھا، وہ قابل ومستعد بن گئے تھے۔

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب سے غالباً ۱۹۹۳ء میں چاٹگام میں ایک بار میری ملاقات ہوئی تھی، جہاں تک میں نے دیکھا اور اندازہ کیا کہ مولانا ایک مدبر اور حاضر دماغ عالم دین ہیں، مولانا نے مجھ سے کچھ علمی سوالات کئے تو میں نے ان کا جواب اپنے علم وآگہی کے مطابق دیا تو آپ بڑے خوش ہو کے فرمانے لگے کہ:

> ''میں نے اپنی زندگی میں چند ندوی حضرات سے ملاقات کی تھی، جس سے جو پوچھا صحیح صحیح جواب ملا تھا، آج بھی آپ کے جوابات سن کر دل بہت خوش ہوا ہے، دراصل ندوی فضلاء خاصے قابل اور مستعد ہوتے ہیں، اللہ تعالی آپ کی عمر درازی کے ساتھ خدمات دین کے لئے قبول کرے''۔

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب کی اولاد میں حضرت مولانا نور محمد صاحب، حضرت مولانا سیف اللہ صاحب، اور مولانا محب اللہ صاحب تمام کے تمام جید علماء میں شمار کئے جاتے ہیں، اللہ تعالی آپ کی اولاد کی زندگی میں برکت عطا کرے، آمین۔

آپ نے مدتوں تک دین وقوم کی خدمات انجام دیتے ہوئے ۱۹۹۵ء میں وفات پائی، اور اپنی آبائی بستی گدوسرا میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا قاری عبدالسلام صاحب راجاربیلی

مولانا قاری عبدالسلام بن عبدالرحمن بن عبدالکریم ہمارے علمائے کرام میں ان دل جلے مجاہدین میں شامل ہیں، جنہوں امت مسلمہ اُرکانیہ کے لئے اپنی جان کی بازی لگائی اور اب بھی لگا رہی ہے، آپ کی پیدائش ۱۹۵۲ء میں علاقۂ راسیدنگ کی معروف بستی راجاربیل میں ہوئی، آپ کے والد ایک نیک سیرت، عالم دوست اور سخی منش تھے، اور والدہ بھی نہایت پاکیزہ سیرت خاتون تھی۔

قاری صاحب کی تعلیمی زندگی کا آغاز گاؤں کے مکتب سے ہوا، کچھ بڑے ہوئے تو مدرسہ اشرف المدارس راجاربیل میں داخل کرائے گئے، وہاں سے آپ نے جماعت ہشتم تک کی تعلیم پائی، اس کے بعد مدرسہ قاسم العلوم فرندنگ سے جماعت چہارم کا امتحان پاس کیا، اس زمانے میں چونکہ یونگ چنگ کی دینی درسگاہ مدرسہ محی العلوم کی بڑی شہرت تھی تو آپ وہیں آئے اور جماعت سیوم کی تعلیم وہیں پائی، پھر اگلے سال سے آپ نے تعلیم کے حوالے سے علاقے سے باہر کے سفر کا آغاز کیا، مدرسہ دارالعلوم میانجان پور منگڈو میں ایک سال متفرقہ کی چند کتابیں پڑھ کر بنگلادیش کی معروف دینی وعلمی درسگاہ مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم میں جا داخلہ لیا، وہاں سے آپ نے دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے ایک سال شعبہ قرآت میں پڑھا، کہتے ہیں کہ تجوید کا امتحان امتیازی شان سے پاس کر کے آپ قاری صاحب کے لقب سے ملقب ہوئے۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ وطن واپس نہ جا سکے، ۱۹۷۷ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک تعلیم القرآن خرولیا علاقۂ کوکس بازار میں تشنگان علوم دینیہ کو سیراب کیا، اس کے بعد آپ ۱۹۸۰ء میں جہاز مقدس پہنچے، حج بیت اللہ اور زیارت مدینۃ الرسولؐ کا شرف حاصل کیا، حجاز مقدس میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر ۱۹۹۱ء میں بنگلادیش واپس آ گئے تھے۔

قاری صاحب ایک دردمند انسان ہیں، تعلیمی زندگی کی ابتداء سے آپ قومی وملی سیاست سے وابستہ ہو گئے تھے، اس حوالے سے اندرون وطن بھی معنی خیز کام کیا، اور بنگلادیش پہنچے تو ہماری قومی وملی سیاست وقیادت سے لو لگائے رکھنے والوں کے ساتھ مل کر بہت سی خدمات انجام دیں، اسی طرح حجاز مقدس کا اول سفر جس کا تذکرہ ابھی ابھی گزر چکا ہے میں بھی قومی وملی سیاست سے وابستہ رہے، آپ ۱۹۹۱ء میں بنگلادیش پہنچے، ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) میں باضابطہ شامل ہو کر اپنی باضابطہ جہادی

زندگی کا آغاز کیا، چنانچہ ۱۹۹۱ء سے لے کر ۱۹۹۸ء تک آپ کو اس جماعت کے اعلی کارکن کے بطور دیکھا گیا، علاوہ ازیں اس جماعت میں آپ کو رکن مجلس عاملہ بھی چن لیا گیا تھا۔

۱۹۹۸ء میں ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کے آغاز میں آپ قائمہ کمیٹی کے رکن چنے گئے، چند مہینے کے بعد اے ار این او کے اعلان کے ساتھ مجلس عاملہ کی تشکیل عمل میں آئی تو اس میں آپ مجلس عاملہ کے سکریٹری برائے امور تعلیم وتربیت کے ذمے دار مقرر ہوئے تھے۔

غالبا ۲۰۰۰ء کے اواخر میں بحیثیت تنظیم کے مندوب آپ کو سعودی عرب بھیجا گیا، جہاں آپ نے پہلے پہلے اچھی خدمات انجام دیں، لیکن افسوس ہے کہ ایک سال گزرتے نہ گزرتے مرکزی مجلس عاملہ کے بعض اعلی عہدے داروں کے ساتھ آپ کا اختلاف شروع ہوا، جس کے نتیجے میں چند مہینوں کے بعد آپ کو نہ صرف تنظیم کے ساتھ ذمے داری سے معزول کر دیا گیا بلکہ آپ کی جگہ دوسرے اور ایک صاحب کو بھیجا گیا تھا۔

غالبا ۲۰۰۷ء کے اواخر میں آپ پھر بنگلا دیش پہنچے، شنید ہے کہ خرولیا کوکس بازار کے مقام پر مع اہل خانہ رہائش پذیر ہیں، بعد کے تفصیلی حالات سے راقم السطور واقف نہیں ہے۔

مولانا قاری عبدالسلام صاحب جہاں کہیں بھی ہوں آپ کی ذات سے قومی وملی کاموں کے ساتھ وابستگی کی امید ہے، قاری صاحب بڑے نیک اور ملنسار اور قوم کے خیر خواہ عالم دین ہیں، ماشاء اللہ بڑے بہادر، حق گو اور انصاف پسند بھی، اللہ تعالی آپ سے قوم کے حوالے سے مزید خدمات لے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا عبدالودود صاحب مظاہری تمبر ووی

سرزمین ارکان کے مایۂ ناز عالم دین، مدرس ومنتظم حضرت مولانا عبدالودود صاحب شمالی منگڈو کے سرحدی گاؤں تمبر ومیں پیدا ہوئے، آپ اس علاقہ کی معروف شخصیت ماسٹر ابوالخیر صاحب کے بھائی ہیں، ماسٹر صاحب کے متعلق بچپن سے یہ سنتا آیا کہ آپ ایک نیک، سخی، زمیندار اور انصاف دوست ہونے کے علاوہ قومی ہمدردی میں یکتائے روزگار انسان ہیں، آپ کے خاندان کو اس علاقہ میں معروف اور بارسوخ خاندان مانا جاتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالودود صاحب کی مکتب نشینی کے بعد ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم علاقہ کے مختلف مدارس میں ہوئی، علم کا شوق بڑھا تو بعد میں اعلی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور سیدھے جا کر سہارنپور یوپی انڈیا پہنچے، چنانچہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، کہتے ہیں کہ حضرت مولانا عبدالودود صاحب نہایت ذہین وفطین طالب علم تھے، جب تک آپ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھتے رہے اساتذۂ کرام کے منظور نظر بنے رہے تھے، درس میں ناغہ کرنا گویا آپ کے لئے ممکنات میں سے نہیں تھا، اس لئے تمام کے تمام اساتذۂ کرام آپ کو بہت ہی پسند کیا کرتے تھے۔

علاوہ ازیں کہتے ہیں کہ مولانا عبدالودود صاحب نہایت متعاون طالب علم تھے، کوئی بھی ارکانی طالب علم کبھی اور کہیں بھی مشکل کا شکار ہو جاتا تو آپ اس کے تعاون اور مدد کرنے میں کوئی بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے، یعنی ممکنہ حد تک اس کی پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

فراغت کے بعد مولانا وطن واپس آئے، کئی سالوں تک دار العلوم میانجان پور کے اعلی درجات کے استاد رہنے کے علاوہ صدر المدرسین اور مہتمم کے عہدے پر فائز رہے، بعد میں مدرسۂ مذکورہ کے شیخ حضرت العلامہ مولانا مفتی سلطان احمد صاحب سے بعض امور میں آپ کا اختلاف ہوا، چنانچہ اختلاف کا خلیج بڑھا تو آپ نے مدرسہ سے مستعفی ہونے کو مناسب سمجھا اور مستعفی ہوگئے۔

نہ جانے کس وجہ سے کہ مولانا ۱۹۸۸ء کے دوران پاکستان گئے، کراچی میں چند دن گزار کر پھر وطن واپس آگئے تھے، زندگی کے آخری مرحلہ میں آپ کو علالت نے بہت ہی ستایا، چاٹگام میں علاج کے لئے چند مرتبہ گئے، مگر تشخیص وعلاج سے کچھ بھی فائدہ نہ ہوا، آپ نے بالآخر ۱۹۹۰ء میں چاٹگام میں انتقال کیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا مفتی علی احمد صاحب گھرک خالوی

دورآخر میں سرزمین ارکان کے ممتاز علمائے دین اور مایۂ ناز مصنفین میں حضرت مولانا مفتی علی احمد صاحب گھرک خالوی کے نام گرامی بھی شامل ہے،اس سرزمین کوایک یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ اس کے بعض فرزندوں نے ہندوستان کی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کر کے وہاں کی مایۂ ناز درسگاہوں میں تعلیم دینے کا شرف حاصل کیا،میرے علم وجانکاری کی حد تک ان باصلاحیتوں معاصرین میں ایک مولانا مفتی علی احمد صاحب کے علاوہ حضرت مولانا شبیراحمد صاحب کوئیار بیلی بھی ہیں،جن کا تذکرہ میری اس حقیر کاوش کی زینت بنا ہوا ہے۔

حضرت مولانا مفتی علی احمد بن نحو میاں تقریبا ۱۹۶۷ء میں شمال منگڈو کی بستی گھرک خالی میں پیدا ہوئے،آپ کا نشوونما اور مکتب نشینی اپنی آبائی بستی میں ہوئی،چوتھی جماعت یعنی ہدایۃ النحو تک کی تعلیم دارالعلوم میانجاپور میں پائی،مولانا مفتی علی احمد صاحب کے بعض اساتذہ سے میری ملاقات رہی ہے، ہرایک آپ کی ذہانت وفطانت اوراخلاقی بلندیوں کے قائل ہیں،چنانچہ ایک استاد کا کہنا ہے کہ:

> ''مولوی علی احمد گھرک خالوی ایک ذہین وفطین طالب علم تھے،نہایت محنتی ہونے کے ساتھ اس کی اخلاقی بلندی اور شرافت نفسی کم سے کم طلبائے مدارس کے لئے قابل تقلید تھی،اسے بڑا ملنسار اور ہرایک کا خیرخواہ پایا گیا تھا،اللہ تعالی اس کی حیات دراز کرے اورملت وقوم کی خدمات کی مزید توفیق سے نوازے''۔

بہر حال مولانا علی احمد صاحب نے ارکان کے ممتاز علمائے کرام ومعلمین عظام سے تعلیم پا کر ہندوستان کا سفر کیا،اول اول تھانہ بھون اور چرتاول میں پڑھ کر ۱۴۰۷ھ کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، وہاں سے آپ نے ۱۴۱۳ھ بمطابق ۱۹۹۲ء میں دورۂ حدیث اورافتاء کی سندیں حاصل کیں۔

مولانا علی احمد صاحب جس طرح عرض کی جا چکی ہے کہ ماشاءاللہ بڑے ذہین وفطین طالب علم تھے، فراغت تعلیم کے بعد جامعہ اسلامیہ مظفر نگر یوپی میں استاد حدیث مقرر ہوئے،اس کے علاوہ مفتی جامعہ کے عہدے پر بھی فائز ہوئے،الحمد للہ تعالی مولانا کئی کتابوں کے مصنف ہیں،غالبا آپ کی ایک تصنیف میری نظر سے بھی گزری ہے،اللہ تعالی آپ کی حیات دراز کرے،اورعلم دین کی مزید خدمات کی توفیق عطا کرے،آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا فیض الحق صاحب حمیدی نوراللہ فاروی

حضرت مولانا فیض الحق المعروف بہ فیض الحق حمیدی صاحب جنوبی منگڈو کی معروف ومردم خیز بستی نور اللہ فارہ میں پیدا ہوئے،آپ کے والدمرحوم بڑے نیک صفات اورعالم دوست اور ہردلعزیز آدمی تھے،اوروالدہ بھی علم دین کی شیدائی تھی۔

مولانا فیض الحق صاحب کی مکتب نشینی کے بعد ابتدائی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں ہوئی، بعض جاننے والوں کا کہنا ہے کہ آپ کے متوسطہ کی تعلیم بھی اس ادارہ میں ہوئی تھی،حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی کا بیان ہے کہ آپ کی ابتدائی سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم اس ادارہ میں ہوئی تھی،مولانا نہایت ذہین وفطین طالب علم تھے اورنہایت ذمے دار مدرس بھی،آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت موانا مستفیض الرحمن صاحب،حضرت مولانا سلطان احمد صاحب،شیخ الحدیث حضرت مولانا نوراحمد صاحب گدوسراوی کے علاوہ حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب اور مولانا نوراحمد صاحب بھی شامل ہیں۔

فراغت تعلیم کے بعد مولانا فیض الحق حمیدی صاحب مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ کے مدرس بنے عرصۂ دراز تک اس میں خدمات دین انجام دیتے رہے تھے۔

یادرہے کہ اس علاقے میں فیض الحق کے نام سے اور چند علمائے دین بھی مشہور ہیں،جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا فیض الحق صاحب خونیہ فاروی۔
(۲) حضرت مولانا فیض الحق بن دودو میاں صاحب خونیہ فاردی۔
(۳) حضرت مولانا فیض الحق بن مولانا ابوحنیفہ صاحب کیلا دنگی۔
(۴) حضرت مولانا فیض الحق صاحب نلبنوی۔

بہر حال مولانا فیض الحق حمیدی صاحب ایک جید عالم دین تھے،تلامذہ کونہایت ذمے داری کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے،کہتے ہیں کہ مولانا مبادیات علوم اسلامیہ کے بڑے ماہرانسان تھے،مولانا نے ایک طویل عرصہ تک مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں علم دین کی خدمات انجام دیتے ہوئے تقریبا ۱۹۷۵ء میں وفات پائی،اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا مفتی فیض الحق صاحب کیلا دنگی

حضرت مولانا مفتی فیض الحق بن حضرت مولانا مفتی ابو حنیفہ صاحب کی ولادت ۱۹۳۰ء میں بستی کیلا دنگ منگڈو میں ہوئی، آپ کے والد مرحوم حضرت مولانا مفتی ابو حنیفہ صاحب کا شمار اپنے وقت کے عظیم عالم دین اور فقیہوں میں ہوتا تھا، جن کا مختصر تذکرہ میری اس حقیر کاوش کی زینت بنا ہوا ہے۔

مکتب نشینی کے بعد مولانا فیض الحق صاحب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں ہوئی، اور ایک روایت کے مطابق متوسطہ تک کی تعلیم بھی اس درسگاہ میں ہوئی تھی، آپ نے اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور دار العلوم دیو بند جا داخلہ لیا تھا، چنانچہ چند سال وہاں پڑھ کر سند فراغت ہاتھ لئے وطن واپس آئے تھے۔

مولانا وطن واپس آ کر دلیہ فارہ شجاع ڈیا والے معروف ڈاکٹر محمد انور صاحب کی ہمشیرہ سے شادی کی، اس کے بعد مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں بحیثیت مدرس مقرر ہوئے، جہاں آپ نے کافیہ، حسامی، میبذی، نور الانوار وغیرہ کتابوں کا درس دیتے رہے، مدت دراز تک اسی مدرسہ میں تعلیمی فریضہ انجام دینے کے بعد وہاں برپا ہونے والے انقلابِ مدرسہ سے متاثر ہو کر مدرسۂ مذکورہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، مگر چند دن جاتے نہ جاتے مدرسہ عالیہ شقدار فارہ والوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اسی دوران آپ جمعیت علمائے اسلام منگڈو برانچ کے مفتی بھی رہے، یعنی تدریس کے ساتھ افتاء کی خدمات بھی انجام دیا کرتے تھے۔

کہتے ہیں کہ مولانا فیض الحق صاحب علوم اسلامیہ کے چنداں فنون کے ماہر اور عالم انسان تھے، ویسے بھی آپ اپنے دور کے قابل ذکر محقق علماء میں شمار تھے۔

آپ کے دو صاحب زادوں کا پتہ چلا:

(۱) ایک کا نام انیس/محمد انیس ہے: اس صاحب زادے کے متعلق مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

(۲) جب کہ دوسرے کا نام حافظ محمد عتیق ہے، کہتے ہیں کہ حافظ عتیق صاحب بھی ایک جید حافظ القرآن ہیں، جنھوں نے اپنے والد بزرگوار کی طرح اپنے علاقے میں دین کی کافی خدمات انجام دی ہیں۔

بہر حال مولانا فیض الحق صاحب کیلا دنگی ایک جید الفکر عالم دین اور قابل قدر مدرس و معلم تھے، آپ نے عرصۂ دراز تک دین اور علم دین کی خدمات انجام دیتے ہوئے تقریباً ۲۰۰۵ء میں وفات پائی، آپ کیلا دنگ کی قبرستان میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا کلیم اللہ صاحب کیلا دنگی

داعی اسلام و معلم قرآن حضرت مولانا کلیم اللہ صاحب جنوبی منگڈو کی بستی کیلا دنگ میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد صاحب بہت ہی نیک اور علماء دوست انسان کی حیثیت سے علاقے بھر میں مشہور تھے، کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ ماجدہ بھی نہایت عابدہ اور پارسا خاتون تھی۔

مولانا کلیم اللہ صاحب نے مکتب نشینی کے بعد ابتدائی اور متوسطہ کی دینی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں پائی، حصول علم دین کا مزید شوق بڑھا تو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلادیش) کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ عزیزیہ قاسم العلوم پٹیہ میں جا داخلہ لیا، چند سال تک پڑھنے کے بعد وہیں سے دورۂ حدیث نبویؐ کی سند حاصل کی، آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا مفتی عزیز الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بانی مدرسہ ضمیریہ پٹیہ) حضرت مولانا علی احمد صاحب بوالوی، حضرت مولانا احمد المروف بہ امام صاحب حضور، حضرت مولانا علی احمد صاحب خیلی اور میر سنن حضرت مولانا امیر حسین صاحب شامل ہیں۔

فراغت تعلیم کے بعد مولانا کلیم اللہ صاحب وطن واپس آئے اور علاقہ کے ایک مہذب گھرانہ کی لڑکی سے شادی کی، اس کے بعد علاقہ میں قرآنی تعلیم کے ساتھ وابستہ ہو گئے، ساتھ ہی ساتھ تبلیغی جماعت کے ساتھ منسلک ہو کر دعوت دین کی خدمات کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا، چنانچہ آپ کے متعلق حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی کا بیان ہے کہ:

> ''فراغت تعلیم کے معا بعد حضرت مولانا کلیم اللہ صاحب اپنے علاقہ میں قرآنی تعلیم کے ساتھ مصروف ہو گئے، ساتھ ہی ساتھ تبلیغی دین کے سلسلے میں مرکز جماعت تبلیغ منگڈو سے خاص رابطہ رکھتے تھے، بڑے نیک اور ٹھنڈے دماغ کے عالم دین تھے، چنانچہ مولانا ایک عالم باعمل و مہذب شخصیت کی حیثیت سے علاقے بھر میں مشہور تھے، شک نہیں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بڑے نیک اور مخلص عالم دین اور داعی بزگ تھے''۔

غرض مولانا کلیم اللہ صاحب نے اپنی پوری عملی زندگی کو دعوت دین اور قرآنی تعلیم سے وابستہ رکھتے ہوئے تقریباً ۱۹۷۶ء میں وفات پائی، موضع کیلا دنگ میں دفون ہیں۔

حضرت مولانا لعل محمد صاحب گدوسراوی

حضرت مولانا لعل محمد بن حاجی محمود کی پیدائش جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی گدوسرا میں ہوئی، آپ کے والد مرحوم حاجی محمود علاقے میں اچھے انسان کی حیثیت سے معروف تھے، اور والدہ بھی بعض جاننے والوں کے مطابق بڑی اللہ والی خاتون تھی۔

مولانا کا نشوونما اپنے آبائی بستی گدوسرا میں ہوا، مکتب نشینی کے بعد ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں ہوئی، بعدازاں اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، کہتے ہیں کہ مولانا نے مدرسہ امینیہ دہلی میں داخلہ لے کر وہیں سے سند فراغت حاصل کی، لیکن بعض حضرات کا کہنا ہے کہ مدرسہ امینیہ سے نہیں بلکہ اطراف دہلی کے کسی درسگاہ سے دورۂ حدیث نبوی شریف پڑھ کر آپ نے فراغت حاصل کی تھی۔

مولانا فراغت کے معا بعد وطن واپس آئے، آپ کی شادی حضرت مولانا محمد یوسف بن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب گدوسراوی کی صاحب زادی سے ہوئی، شادی کے بعد آپ علاقے کے مختلف دینی درسگاہوں اور مکاتب میں دینی اور قرآنی تعلیم دیتے رہے تھے، بعد میں آپ نے رنگون کا سفر کیا، جہاں آپ عرصۂ دراز تک تجارت اور معاشی فکر میں مصروف تو رہے لیکن اس میں آپ کی کوئی خاص کامیابی نہیں ملی تھی۔

رنگون میں چند سال گزار کر آپ وطن واپس آئے، وطن میں چند دن گزار کر آپ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کی نیت سے ارکان سے سفر شروع کیا، اور چاٹگام ہوتے ہوئے بنگلا دیش کے دارالحکومت ڈھاکہ پہنچے، ابھی آپ سعودی عرب کی طرف حج بیت اللہ کی نیت سے ہوائی جہاز پر سوار ہوئے ہی تھے کہ داعی اجل آ پہنچا، یوں آپ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا لعل محمد صاحب کی وفات حسرت آیات ۱۹۹۱ء میں ہوئی، انتقال کے بعد آپ کی نعش مبارک چاٹگام لائی گئی، ہر چند کوشش کی گئی تھی کہ آپ کی میت کو آپ کے وطن ارکان لایا جائے، لیکن ہر چند کوشش کے باوجود علاقے کے برمی حکام کی بدمعاشی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہو سکا، اس لئے آپ کی میت کو بعد نماز جنازہ چاٹگام کے معروف علاقہ پٹیہ میں دفن کر دیا گیا، آپ بڑے اخلاقی آدمی تھے، اللہ تعالی آپ کے درجات بلند کرے، آمین یا رب العالمین۔

حضرت مولانا محمود احمد صاحب گدوسراوی

مولانا محمود احمد صاحب کی ولادت بستی گدوسرا میں ۱۹۳۵ء میں ہوئی، آپ اپنے زمانے میں اپنے خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ کے والد مرحوم حضرت مولانا محمد یوسف صاحب ایک جلیل القدر عالم دین، محدث و مفسر قرآن تھے، اسی طرح آپ کے دادا حضرت مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک عظیم عالم دین بزرگ تھے، ان دونوں بزرگوں کی مختصر سوانح حیات میری اس کاوش کی زینت بنی ہوئی ہے۔

مولانا محمود احمد صاحب نے ایک روایت کے مطابق مکتب نشینی کے بعد ابتدائی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ سے حاصل کی، لیکن بعض حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپ نے متوسطہ تک کی دینی تعلیم اسی مدرسہ میں حاصل کر کے اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے بنگلا دیش کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری پہنچے، وہاں آپ نے چند سال تعلیم حاصل کر کے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، اس کے معا بعد بعد وطن واپس آئے تھے۔

آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب، حضرت مولانا نجم الدین صاحب، حضرت مولانا سلطان احمد صاحب کے علاوہ حضرت مولانا الحاج عبد الوہاب صاحب (سابق مہتمم مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری و مجاز بیعت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ) قابل ذکر ہیں۔

فراغت تعلیم کے بعد مولانا محمود احمد صاحب نے موضع خائندہ کاٹا کے ایک دین دار خاندان کی نیک سیرت خاتون مسماۃ عطر جہان سے شادی کی، کہتے ہیں کہ مولانا کی خانگی زندگی بڑی لطف سے گزری تھی، لیکن کسی بھی اولاد سے تادم آخر محروم رہ گئے تھے۔

مولانا محمود احمد صاحب مدتِ دراز تک اپنے گاؤں کے سرپنچ (اوکاٹا) رہے تھے، ایک روایت کے مطابق مسلسل پندرہ سال تک آپ اپنے آبائی گاؤں کے سرغنہ رہے، بعد میں اسی گاؤں کے مدرسہ اعزاز العلوم گدوسرا کے مہتمم بھی رہ چکے تھے، ساتھ ہی ساتھ اسی مدرسہ کے تعلیمی خدمات بھی انجام دیتے رہے تھے۔

حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی کے مطابق مولانا محمود احمد صاحب نہایت ذہین، معاملہ فہم اور مدبر انسان تھے، مسائل کے حل نکالنے کے بڑے ماہر تھے، آپ نے ۲۰۱۰ء میں وفات پائی، اور گدوسرا میں مدفون ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب گدوسراوی

مولانا محمد اسماعیل صاحب بن حضرت مولانا سعید الرحمن صاحب بستی گدوسرا منگڈو میں ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد مرحوم حضرت مولانا سعید الرحمن صاحبؒ ایک عظیم عالم دین، اعلی درجہ کے مفتی اور فقیہ انسان تھے، جن کا تذکرہ اس کاوش میں شامل ہے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب کا نشوونما اپنے گاؤں میں ہوا، مکتب نشینی کے بعد ان کی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں ہوئی، انہوں نے اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے بنگلا دیش جانا چاہا لیکن ملکی حالات بے حد نازک ہونے کی وجہ سے وہ وطن سے باہر کہیں تعلیم حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، بالآخر مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں دورۂ حدیث کے لئے بھرتی ہوگئے، چنانچہ اسی مدرسہ سے دورۂ حدیث کی تعلیم پاکر سند فراغت حاصل کی، ان کے نامور اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب، حضرت مولانا نور احمد صاحب، حضرت مولانا نجم الدین صاحب، حضرت مولانا نذیر احمد صاحب اور مولانا نثار احمد صاحب کے علاوہ حضرت مولانا حافظ مجاہد حبیب اللہ صاحب بھی شامل ہیں۔

فراغت تعلیم کے بعد انہوں نے اپنے ماموں زاد بہن منورہ بیگم بنت مولانا عبد الغفار صاحب گدوسراوی سے شادی کی، جن کے بطن سے دو بچے محمد یسین اور سعید حسین پیدا ہوئے، بعد ازاں وہ اپنے محلے کے مکتب میں قرآنی تعلیم کی خدمت میں مصروف ہوگئے تھے۔

بعض ظروف کے پیش نظر انہوں نے رنگون کا سفر کیا، ایک مدت تک وہیں ان کا قیام رہا، دریں اثناء انہوں نے وہیں بھی قرآنی تعلیم کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا، ۱۹۸۰ء میں وطن واپس آئے، وطن میں چند دن گزار کر معاش کی تلاش میں کویت گئے، لیکن انقلاب کویت کے دوران وہ وطن واپس لوٹے، پھر کچھ دن کے بعد حج و زیارت کی نیت سے حجاز مقدس پہنچے، حج بیت اللہ و زیارت مدینہ منورہ کے بعد جدہ میں قیام کیا، معاش کی تلاش میں سرگرداں رہے، لیکن ان کو اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں لی، اللہ تعالی کی یہی مرضی تھی کہ ان کو حجاز مقدس کے شہر جدہ میں مرض موت نے آلیا تو کچھ دن علالت میں مبتلا رہ کر آخر کار وہیں ان کا انتقال ہوگیا، جدہ کیلوا ربعۃ عشر کی قبرستان میں مدفون ہیں، مولانا صاحب نہایت ذہین وفطین عالم دین تھے، ان کے والد کی طرح معاملہ فہم اور دوراندیش انسان بھی، اللہ تعالی مغفرت فرمائے۔

حضرت مولانا محمد امین صاحب گدوسراوی

حضرت مولانا محمد امین بن حضرت مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب کی پیدائش ۱۹۰۷ء میں بستی گدوسرا منگڈو میں ہوئی، نشوونما بھی وہیں ہوا، مکتب نشینی کے بعد ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کر کے متوسطہ، ثانویہ اور اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور سیدھے ازہر ہند دار العلوم دیوبند جاد داخلہ لیا، دوران تعلیم مولانا نے اپنے آپ کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے وابستہ کرلیا تھا، کچھ ظاہری علوم میں بھی وہی استاد تھے اور باطنی علوم میں بھی شیخ کامل، بالآخر دار العلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کر کے وطن واپس پہنچے تھے، وطن واپس آتے ہیں درس و تدریس اور خدمات قرآنیہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا تھا، آپ کے متعلق حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی صاحب کا بیان ہے کہ:

> ''فراغت تعلیم کے بعد وطن واپس آتے ہی مولانا محمد امین صاحب اپنے علاقہ میں قرآنی تعلیم کی خدمات میں مصروف ہوگئے، بچوں کو قرآنی تعلیم اور علم دین سے آراستہ کرنے کا فریضہ انجام دیتا رہا، علاوہ ازیں مولانا علاقے کے اکثر مدارس کی مجلس شوری کے ممبر رہے، شوری کے ممبر کی حیثیت سے اکثر مجالس میں شرکت بھی کیا کرتے تھے، آپ بڑے صائب الرائے، مدبر اور دوراندیش انسان تھے، حق گوئی اور عدل وانصاف کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے، گدوسرا کی جامع میں عرصۂ دراز تک امام اور خطیب تھے، علوم دینیہ کے تقریبا ہر شعبہ میں کمال رکھتے تھے، خاص طور پر تجوید اور قرآت کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے''۔

مولانا نے تعلیم سے فراغت کے بعد وطن واپس آتے ہی اپنے علاقہ کی معروف شخصیت حضرت مولانا امیر حمزہ صاحب کی صاحبزادی سے شادی کی، اللہ تعالی نے آپ کی اولاد میں برکت دی، آپ کے پانچ بیٹے بالترتیب یہ ہیں (۱) مولانا نثار احمد (۲) مولانا قاری بشیر احمد (۳) مولوی حبیب احمد (۴) رفیق احمد (۵) شفیق احمد، ماشاء اللہ یہ سب آپ کی یادگار ہیں۔

مولانا محمد امین صاحب نے عرصۂ دراز تک ملک وملت اور اپنی معصوم روہنگیا قوم کی خدمات انجام دیتے ہوئے ۱۹۸۹ء میں انتقال کیا، گدوسرا کی قبرستان میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا محمد انور صاحب گدوسراوی

ممتاز عالم دین حضرت مولانا محمد انور صاحب بن مولانا منیر اللہ صاحب جنوبی منگڈو کی معروف بستی گدوسرا میں ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد صاحب بھی اپنے وقت کے جید عالم دین تھے، جن کا تذکرہ میری اس حقیر کاوش میں شامل ہے۔

مولانا محمد انور صاحب نے مکتب نشینی کے علاوہ چند بنیادی ابتدائی کتابیں اپنے والد گرامی حضرت مولانا منیر اللہ صاحب سے پڑھیں، پھر ابتدائی اور متوسطہ کی دینی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ سے حاصل کی، اس کے بعد اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کی نیت سے پاکستان گئے، وہاں دارالعلوم کراچی میں داخلہ لیا، اسی مدرسہ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، آپ کے اساتذۂ کرام میں آپ کے والد حضرت مولانا منیر اللہ صاحب کے علاوہ حضرت مولانا نجم الدین صاحب، حضرت مولانا سلطان احمد صاحب، حضرت مولانا نور احمد صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا سبحان محمود صاحب اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب شامل ہیں۔

فراغت تعلیم کے بعد مولانا محمد انور صاحب وطن واپس آئے، وطن واپس آتے ہی منشی غلام حسین صاحب فیاضی فاروی کی صاحبزادی سے شادی کی، مولانا کی خدمات دینیہ کے حوالے سے حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی کا بیان ہے کہ:

> ''مولانا محمد انور صاحب فراغت کے بعد وطن آتے ہی دینی خدمات میں مشغول ہو گئے، عرصۂ دراز تک اپنے مادری وطن کی بستی گدوسرا میں قرآنی تعلیم کی خدمات میں مصروف رہے، بعد میں زمانے کی گردش سے وطن کو خیر باد کہہ کر شاہی فریر دیپ میں قیام پذیر ہوگئے، آپ کے اس ترک وطن کی داستان بڑی لمبی ہے، زندگی کے آخری ایام تک شاہی فریر دیپ میں موجود برمافارہ کے مدرسہ میں تعلیمی خدمت سے منسلک رہے، آپ ایک ممتاز عالم دین اور عامل بزرگ ہونے کے ساتھ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت خلق کے حوالے سے معروف تھے، درس وتدریس میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے، آپ کا انتقال شاہی فریر دیپ میں ۲۰۰۵ء ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون''۔

حضرت مولانا محمد بلال صاحب گوزی بیلی (۱)

حضرت مولانا محمد بلال صاحب ۱۹۵۱ء میں شمالی منگڈو کی بستی چھوٹی گوزی بیل میں پیدا ہوئے، آپ کا خاندان اس سے پہلے پرامپرو میں آباد تھا، بعد میں آپ کے والد صاحب بعض وجوہات کی بنیاد پر اپنے سسرال کے گھر گوزی بیل چلے گئے تھے، آپ کے والد بڑے نیک اور علم دین سے بہت محبت رکھنے والے انسان تھے، جہاں بھی وعظ ونصیحت کی محفل سج جاتی، وہ وہاں بڑے اہتمام سے پہنچ جاتے تھے۔ مولانا محمد بلال نے مکتب نشینی اور ابتدائی تعلیم اپنے ننہال کی بستی گوزی بیل میں پائی، مکتب میں آپ مولانا یار محمد صاحب سے قرآن مجید کے علاوہ دینیات کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد کا ایک دلچسپ واقعہ مولانا محمد بلال صاحب کی زبانی سنئے کہ:

> ''اس دوران میرے والد صاحب ایک مجلس وعظ میں حاضر ہوئے تو وہاں مولانا محمد علی عرف ٹھنڈا مولوی کا بیان سنا، بیان کا موضوع علم دین کی فضیلت پر تھا، مجلس وعظ کے اختتام پر مولانا موصوف نے لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ اس مجلس میں کون کون لوگ ہیں جو اپنی اولاد کو عالم بنانے کے لئے وقف کر دیں گے؟ تو میرے والد صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا کہ میں اپنے بیٹا محمد بلال کو اللہ کے دین اور علم دین کے لئے وقف کرتا ہوں، تو مولانا صاحب نے والد صاحب کو شاباشی دی اور دعا کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالی تمہاری امید بھر لائے''۔

بہر حال مکتب میں ابتدائی دینیات اور کچھ اردو میں مہارت حاصل ہونے کے بعد والد نے مدرسہ محمدیہ پرامپرو میں داخلہ کرادیا، مگر آپ کی عمر بہت کم تھی اور گھر سے آمد ورفت میں تکلیف ہورہی تو بعد میں بستی کے قریب کا مدرسہ بڑی گوزی بیل میں داخلہ کرادیا، یہ مدرسہ ایک سال کے بعد کولار بیل میں منتقل ہوا

(۱) میں عرصۂ دراز تک کیلو اربعہ عشر جدہ میں مقیم تھا، وہاں حضرت مولانا محمد بلال صاحب سے میرے بہت قریبی تعلقات تھے، حتی کہ ایک طویل مدت تک آپ میرے ساتھ رہے تھے، جہاں تک میں نے دیکھا کہ آپ علم کے بڑے رسیا عالم دین تھے اور جو بھی مستعد عالم پاتے گویا اس کے ہو جایا کرتے تھے، علاوہ ازیں روز میری مجلس میں تشریف لاتے اور علم وفن سے لوگوں کو محظوظ فرمایا کرتے تھے، کبھی کبھار رات بھی میرے ساتھ گزار دیا کرتے تھے۔

تو آپ بھی وہاں چلے گئے، اور دو سال تک وہیں پڑھتے رہے، اس کے بعد چالی فرانگ میں ایک مدرسہ کی بنیاد پڑی تو آپ وہاں گئے، اس مدرسہ کے مدرس ایک بڑے عالم دین مولانا سید عالم صاحب سے کافیہ اور قدوری نامی کتابیں پڑھیں، ابھی آپ کی عمر اٹھارہ سال تک پہنچ چکی تھی، علم کا شوق بڑھا تو پاکستان جانے کا قصد کرلیا، اس حوالے سے مولانا صاحب خود لکھتے ہیں کہ:

''بعد میں میں مختلف علاقے میں تعلیم کی نیت سے پہنچا تھا، بالآخر ۱۹۶۹ء میں تعلیم کے لئے پاکستان جانے کا قصد کرلیا، تعلیمی زندگی بھی عجیب سی ہوتی ہے، تعلیم کا شوق ہمیشہ میرے حالات پر دباؤ ڈالتا رہا تھا، بعد میں پاکستان جانے کی تجویز والدین کے سامنے رکھی گئی تو انہوں نے خوشی خوشی سے منظور کرلی، لیکن حال یہ تھا کہ والدین میرے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہ تھے، بڑے شوق کے مالک تو تھے ہی، مگر تنگدستی ان کی زندگی پر پوری طرح سوار تھی، رمضان آیا تو میں نے ارادہ کیا کہ ارکان کے دارالحکومت اکیاب جاؤں، وہاں چندہ وغیرہ حاصل کروں، شوق کے دباؤ پر میں اکیاب پہنچ گیا، اس بارے میں احباب نے میرا مذاق اڑایا تو میں نے ان کے جواب میں کہا کہ:

یا بم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

الغرض میں نے اکیاب میں تین مہینے گزار دیئے اور جہاں بھی گئے وعظ ونصیحت کے ذریعے لوگوں سے کچھ چندے بھی وصول کئے، بالآخر تھوڑی سی کامیابی پر میں اپنے گاؤں واپس آیا تھا''۔

مولانا کے والدین کی مالی حالت جس طرح عرض کی گئی ہے کہ بڑی خراب تھی، پھر بھی کسی طرح کھینچ تان کر مصارف مہیا کر دیئے تھے، مختصر سی تیاری کے بعد آپ پاکستان کے لئے نکل پڑے، اس موقع پر والد صاحب کے الوداعی کلمات پر گفتگو کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ:

''مجھے وہ لمحہ جب یاد آیا ہے تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑتا ہے، والد محترم مجھے رامیور

بیل چھوڑے چالی فرانگ جا رہے ہے تو ہم دونوں کی انکھیاں بہ رہی تھیں، عصر کا وقت تھا، جدائی کے بعد بار بار میری طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہے اور فرما رہے تھے کہ بیٹا ممکن ہے کہ دنیا میں شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو، اور بالآخر ہوئی بھی ایسی، جدائی کے وقت انہوں نے دعائیں دیتے ہوئے کہا تمہارا یہ سفر مبارک ہو، اللہ تعالی تجھے دنیا اور آخرت میں سرخرو کرے''۔

مولانا براہ نہلا اور کوکس بازار چاٹگام پہنچ گئے، چاٹگام میں اسی دوران آپ کو بہت تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، لیکن بالآخر بحری جہاز سے پاکستان کے معروف شہر کراچی پہنچ گئے تھے، اس حوالے سے مولانا رقمطراز ہیں کہ:

''بحری سفر کے دوران بہت سے عجائبات دیکھنے میں آئے، ان عجائبات میں سے میرے لئے ایک اڑنے والی مچھلی کا دیکھنا بہت حیرت انگیز تھا، اب کراچی پہنچا تو لگتا تھا کہ میں ایک نئی دنیا میں آپہنچا ہوں، یہاں لانڈھی میں اپنے بعض آشناؤں سے ملاقات ہوئی، بعد میں لانڈھی اسٹیشن سے بذریعہ ریل حیدرآباد پہنچا، وہاں اتر کر ایک تانگے کے ذریعے غریب آباد میں واقع مدرسہ ''قوۃ الاسلام'' میں جا پہنچا، وہاں زیر تعلیم چند ارکانی احباب جن میں مولانا محمد صالح نکھوروی، مولانا محمد امین کیاری فرانگی، مولانا ولی حسین بڑی گوزی بیلی قابل ذکر ہیں سے ملاقات ہوئی تو میری خوشی کی انتہاء ہوگئی تھی''۔

داخلہ کی مدت ختم ہوجانے کی وجہ سے آپ کا یہاں مکمل داخلہ نہیں ہو پایا تھا، صرف سماعت کی اجازت مل گئی تھی، اس حوالے سے آپ خود لکھتے ہیں کہ:

''میں مولانا سلیمان صاحب ہزاروی کے درس میں بیٹھنے لگا، آپ نورالانور پڑھایا کرتے تھے، تین بنگالی اور برمی طالب علم کتاب کی عبارت پڑھا کرتے تھے، ایک روز کا واقعہ تھا کہ مولانا نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا، بیٹا محمد بلال! آج تم ہی عبارت پڑھو گے! مولانا کا یہ فرمانا تھا کہ وہ لڑکے جو عبارت پڑھا کرتے تھے

فورا بول پڑے کہ مولانا یہ تو صرف سماعت کر رہا ہے، مستقل یہاں کے طالب علم نہیں ہے، مگر مولانا کسی کی سننے کو تیار نہ تھے، پھر فرمایا کہ جو کچھ بھی ہو آج وہی عبارت پڑھے گا، مولانا کا حکم پاتے ہی میں نے ایک طویل عبارت بڑی آن بان سے پڑھ ڈالی، تب حضرت ہزاروی نے فرمایا کہ ایک یہی طالب ہے کہ جو حقیقت میں علم کے حصول کے لئے یہاں آیا ہے، اور تم تو صرف پیٹ پالنے کی خاطر یہاں جمع ہو گئے ہو، اس کے بعد حضرت نے وہاں کے مہتمم صاحب کے نام ایک سفارشی خط لکھا، اور بتایا ہے کہ یہ لڑکا بڑا ذہین ہے اور علم کا متوالا بھی، امید ہے کہ آپ اس غریب اور مسافر طالب علم پر رحم فرما کر فورا خورد و نوش کا انتظام فرما دیں گے، مولانا کی سفارش نامہ ملتے ہیں حضرت مہتمم صاحب نے مطبخ کے ذمے دار کو حکم دیا کہ بلال نامی برمی طالب علم کا کھانا جاری کر دیا جائے، ویسے چھ مہینے تک میں نے یہاں پڑھا، سارے اساتذہ مجھے بڑے پیار کرتے تھے، ایک دن کا واقعہ ہے کہ نور الانور کے درس میں حضرت مولانا سلیمان صاحب نے لڑکوں سے پوچھا کہ امر کتنے معنی پر مشتمل ہے، سارے لڑکے خاموش تھے، میں نے جواب دیا کہ امر سولہ معنی پر مشتمل ہے، پھر تفصیلات پوچھنے پر میں نے مع امثلہ کے ساری چیزیں بیان کر دیں، اب مولانا نے جیب سے دس روپئے نکال کر میرا حوالہ کر دیا تھا''۔

اس کے بعد اگلے شعبان اور رمضان کے دو مہینے مولانا محمد بلال صاحب نے پنجاب کی میاں والی نامی جگہ میں گزارے، جہاں آپ نے مولانا محمد زمان (جو مذکورہ دو مہینے ہر سال قرآن کا درس دیا کرتے تھے) کے یہاں گزارے، اس حوالے سے مولانا لکھتے ہیں کہ:

''مولانا محمد زمان صاحب ہر سال شعبان اور رمضان میں درس قرآن دیا کرتے ہیں، رجب کے مہینہ میں میں نے اللہ تعالی کے نام لے کر اس کے لئے اپنا نام درج کر دیا، تاکہ میاں والی پنجاب میں ہونے والے اس درس قرآن میں شریک ہو سکوں، رجب کے اواخر میں میں سیدھا وہاں پہنچ گیا، دیکھا کہ ہزار تک طلبہ جمع ہو گئے ہیں، میں

یہاں دو مہینے حضرت کے درس میں شریک رہا، اور عید کے بعد میں یہاں سے لاہور چلا گیا تھا، تاکہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں اگلے کے لئے سال داخل ہو سکوں''۔

۱۹۶۴ء میں مولانا نے جامعہ اشرفیہ لاہور میں داخلہ لیا، یہاں آپ گیارہ سال مسلسل پڑھتے رہے تھے، درس نظامیہ کی بقیہ تمام کتابیں پڑھنے کے بعد فنونات عالیہ کے درس میں شامل ہوئے، اس حوالے سے مولانا خود رقمطراز ہیں کہ:

''لاہور پہنچا تو وہاں کے آب و ہوا، ماحول اور پرسکون فضا نے مجھے محو حیرت میں ڈال دیا، یہاں سے میں نے انسانیت کا درس لیا، مجھے دنیا کی رنگ رلیاں اور اونچ نیچ کا پتہ وہاں جا کر چلا، جامعہ اشرفیہ کا نام بچپن سے سن رکھا تھا، وہاں داخلہ کے بعد اندازہ ہوا ہے کہ یہ ایک عظیم دینی درسگاہ ہے، یوں تو اس درسگاہ کے فیض یافتہ بہت سے حضرات ہمارے ملک میں بھی تھے اور ہیں، ان لوگوں سے جتنی بھی باتیں اس درسگاہ کے متعلق سنی تھیں، اسے میں نے اس سے زیادہ بڑھ کر پایا، وہاں میں گیارہ سال سے زیادہ عرصہ تک ٹھہرا، متداول نصاب کے اختتام اور دورہ شریف سے فراغت کے بعد میں نے فنونات عالیہ کی کتابیں وہیں پڑیں، اور یہاں سے فراغت کے بعد ۱۹۷۳ء کی ابتداء میں حج و زیارت کی نیت سے سعودی عرب پہنچا، اور وہاں بھی مکہ معظّمہ کے دار الحدیث میں داخلہ لے کر مزید دو سال تعلیم حاصل کر چکا ہوں''۔

حج و زیارت سے فراغت اور دار الحدیث کی پڑھائی کے اختتام پر آپ پھر پاکستان چلے گئے، وہاں سے آپ ایران اور عراق کا بھی سفر کر کے بڑے محظوظ ہوئے تھے، وہاں کے سفر کے متعلق مولانا نے مجھے بہت سی انوکھی باتیں بتائی تھیں، لیکن طوالت کے خوف سے میں نے ان ساری باتوں کو نظر انداز کر دیا، بہر حال آپ ایران اور عراق کی سرزمینوں کے دورے کے بعد دوبارہ کراچی پہنچ گئے تھے۔

آپ ابھی پاکستان پہنچے تو دار العلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کے حوالے سے علمائے پاکستان میں بڑی گرم جوشی دیکھی گئی، چنانچہ آپ بھی صد سالہ جشن میں شرکت کے لئے تیار ہو گئے، غرض جماعت علماء کے ساتھ آپ دار العلوم کے صد سالہ جشن میں شریک ہو گئے، جشن کے اختتام کے بعد آپ نے

پاکستان واپس جانے کے بجائے وطن کی راہ لی، وطن پہنچے تو جامعہ اسلامیہ کولاربیل کے ارباب بست و کشاد نے آپ کو دعوت دی کہ آپ تشریف لائیں اور اس درسگاہ کو رونق بخشیں، چنانچہ آپ نے دعوت قبول کرتے ہوئے وہاں درس دینا شروع کر دیا تھا۔

غالبا ۱۹۸۰ء کے اواخر کی بات تھی کہ جس زمانے میں مولانا محمد بلال صاحب کا کولاربیل مدرسہ میں تقرر ہوا تھا اس زمانے میں سرزمین ارکان کے ممتاز ناز عالم دین شیخ الحدیث حافظ مولانا محمود الحسن بن مولانا امیر حسین صاحب شرف الدین بیلی وہاں درس حدیث کی شمع فروزاں بنے ہوئے تھے، مولانا کی تقرری کے معا بعد مولانا محمود الحسن صاحب کی کوشش سے شرف الدین بیل والی ایک خاتون سے آپ کی شادی ہوگئی تھی، مولانا کی اس شادی کے حوالے سے کچھ باتیں اگلی سطور میں آرہی ہیں۔

غرض مولانا محمد بلال صاحب نے کولاربیل کے مدرسہ میں مسلسل تین سال تک تعلیم دی، اول اول ہدایۃ النحو سے لے کر ہدایہ اولین تک کی کتابیں پڑھاتے رہے، لیکن بعد میں جماعت اولی تک کی کتابیں آپ کے ذمے تھیں۔

اس کے بعد آپ مدرسہ نظامیہ خائندہ فارہ میں منتقل ہو گئے، وہاں آپ نے مسلسل چھ سالوں تک درس دیا تھا، مشکوۃ المصابیح اور جلالین شریف جیسی حدیث وتفسیر کی کتابیں آپ کے حصے میں تھیں، اس کے بعد شجاع فارہ والے مدرسہ (جس کے بانی مولانا عبد الحمید صاحب تھے) میں جا کے ایک سال تک تعلیم دی، اس کے بعد مدرسہ توحیدیہ منگنما کے ارباب بست وکشاد کی دعوت کو لبیک کہتے ہوئے وہاں کی شمع فروزاں بنے طلبہ کو محفوظ کرتے رہے تھے، اس کے بعد کے کچھ حالات خود آپ کے قلم سے ملاحظہ کیجئے کہ:

''اللہ تعالی کے فضل وکرم سے یہاں تک میرا ہر کام، ہر معاملہ اور ہر قدم ترقی کی طرف گامزن تھے، نہ جانے کس وجہ سے کہ یہاں سے میری زندگی نے انگڑائیاں لیں، ہر ترقی تنزلی میں بدل گئی، روشنی ختم ہو کے ہر معاملہ میں اندھیری چھائی رہی، مدرسہ توحیدیہ کے مہتمم مولانا فضل احمد صاحب کے اصرار پر میں نے ملائشیا کا سفر کیا، یہ سفر نہیں تھا گویا میری زندگی نے اس سفر کی شکل میں موت کو دعوت دی تھی، یوں

تو معاشی اعتبار سے سفر اچھا ہی تھا، مگر معاشرتی اعتبار سے میری حالت دگرگوں ہو گئی تھی، ملائشیا میں میں نے جامعۃ القرآن نامی مدرسہ میں مسلسل پانچ سالوں تک تعلیم دی، اور اس دوران وطن میں تین چار مرتبہ آنا جانا ہوا تھا، لیکن میری قسمت خراب تھی کہ جو کچھ کمایا میری بیوی نے سب کچھ ضائع کر دیا، اور بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی ہے کہ میری بیوی نے مجھ سے بڑی بے وفائی کی، اس نے میرے نکاح میں رہتے ہوئے کسی دوسرے سے شناسائی کر لی، جس کی وجہ سے مجھے بالآخر اسے طلاق دینا پڑا، اب میں بہت تھکا ہوا تھا، کیوں کہ اس کے بطن سے میری تین لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے تھے، اب میری دنیا ایسی بدلی کہ میری ہر خوشیاں پریشانیوں میں تبدیل ہو گئی تھیں''۔

خانگی زندگی کے حوالے سے کہا جائے تو مولانا کی زندگی مسلسل پریشانیوں سے عبارت ہے، پہلی والی اہلیہ کے بچھڑ جانے کے بعد مولانا محمد بلال صاحب نے دوسری شادی تو کی لیکن معاشرتی اعتبار سے اس دوسری اہلیہ سے بھی آپ کی زندگی میں کوئی توازن نہ آسکا تھا۔

بہر حال اس دوسری شادی کے بعد آپ پھر سعودی عرب پہنچے، یہاں میں نے آپ کو کوئی چار پانچ سالوں سے زیادہ عرصہ تک قریب سے دیکھا، آپ بڑے اداس، سہمے ہوئے اور چوٹ کھائے ہوئے نظر آئے، اس حالت میں آپ پھر سے بنگلا دیش پہنچے، لیکن کچھ عرصہ ٹیکناف میں گزار کر ملائشیا پہنچ گئے تھے، جہاں آپ کا اطلاع کے مطابق بڑی بری حالت میں انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد بلال صاحب یک مستعد عالم دین تھے، زمانے کے اتار چڑھاؤ سے بھی قدرے واقف تھے، آپ کے اندر ملی شعور اور قومی جذبات بھی تھے، ملت اسلامیہ ارکانیہ کے حوالے سے کام کرنے والی تنظیم ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کے ممبر بھی رہے، سعودی میں راقم کے ساتھ آپ نے دسیوں پروگراموں میں شرکت بھی کی، بعض مجالس میں اپنے روشن خیالات کے ذریعے لوگوں کو محفوظ ہونے کا موقع بھی دیا تھا، روہنگیا قوم کی بہبودی کے بڑے متمنی تھے، اللہ تعالی حضرت مولانا محمد بلال کی بال بال مغفرت فرمائے، آمین یارب العالمین۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سلطان صاحب فقیرہ فاروی

دورآخر میں سرزمین ارکان کے مایۂ ناز علمائے دین میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سلطان صاحب فقیرہ فاروی کا اسم گرامی بھی شامل ہے،مولانا نحو وصرف،فقہ واصول فقہ کے علاوہ حدیث وتفسیر میں بھی بڑے باکمال عالم دین ہیں،مولانا کی ولادت تقریباً ۱۹۲۷ء میں بستی فقیرہ فارہ علاقۂ نوراللہ فارہ منگڈو میں ہوئی،کہتے ہیں کہ مولانا کے والد صاحب نہایت عابدوزاہداورخدمت خلق کے حوالے سے معروف بزرگ تھے۔

مولانا محمد سلطان صاحب کی ابتدائی اورمتوسطہ کی دینی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں ہوئی،یہاں آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب،حضرت مولانا نور احمد صاحب اورحضرت مولانا عبدالجلیل صاحب شامل ہیں،بعد میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے آپ نے ہندوستان کا سفر کیا،اوروہاں کے ایک دینی مدرسہ سے فراغت حاصل کرتے ہوئے وطن واپس آئے،کہتے ہیں کہ آپ نے دارالعلوم دیوبند یا مظاہرالعلوم سہارنپور کے بجائے انہیں علاقے کے کسی ایک دینی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی،اس حوالے سے بعض جاننے والوں سے پوچھا گیا تھا،لیکن کسی ایک نے بھی تفصیلات بتا کے مجھے مطلع ہونے کا موقع نہیں دے سکا۔

مولانا نے فراغت کے بعدوطن واپس آکے عبدالمطلب سرجن صاحب خاینگ خالوی منگڈوی کی صاحب زادی سے شادی کی،جن کی اولاد میں محمودالحسن صاحب معروف ہیں،مولانا محمد سلطان صاحب وطن پہنچے تو مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ کے ارباب بست وکشاد نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا،آپ نے اس درس گاہ میں عرصۂ درازتک خدمات انجام دیں،چنانچہ آپ کی خدمات کے حوالے سے حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی کا بیان ہے کہ:

> ”مولانا محمد سلطان صاحب مدت درازتک مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں قابل قدرخدمات انجام دیتے رہے،اس مدرسہ میں ایک انقلاب آیا تھا،جس سے متاثر ہوکر آپ یہاں سے مدرسہ عالیہ شقدار فارہ منتقل ہو گئے تھے،وہاں بھی مدت درازتک امتیازی شان سے علوم دینیہ کی خدمات انجام دیں،بعد میں پھرنوراللہ فارہ چلے آئے، بالآخر یہاں شیخ الحدیث کی ذمہ داری سنبھالی،آپ آج تک اسی منصب پرفائز ہیں،نحو وصرف کے علاوہ فن حدیث وتفسیر میں بھی کافی درک رکھتے ہیں“۔

حضرت مولانا محمد صدیق صاحب گدوسراوی

داعی برحق اورقابل قدرعالم دین حضرت مولانا محمد صدیق صاحب کی ولادت ۱۹۰۰ء میں جنوبی منگڈو کی بستی گدوسرا میں ہوئی،آپ کے والد حضرت مولانا عبدالستار صاحب گدوسراوی ایک شاندار عالم دین ہونے کے ساتھ بڑے پائے کے داعی اسلام تھے،جنھوں نے اپنی حیات مستعار میں دین اورامت مسلمۂ ارکانیہ کی قابل قدرخدمات انجام دی تھیں،کہتے ہیں کہ مولانا کی استعداد بڑی قابل اعتماد تھی۔

مولانا محمد صدیق صاحب نے مکتب نشینی کے بعد ابتدائی اور بنیادی تعلیم اپنے علاقے کی دینی درسگاہوں میں پائی،کہتے ہیں کہ مولانا کی ذہانت وفطانت کی شان شروع ہی سے ظاہر ہونے لگی تھی، چنانچہ اساتذہ آپ کو خاص شفقت کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔

مولانا نے اپنے علاقے کے مدرسوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد متوسطہ اوراعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا،اور وہاں کی ایک دینی درسگاہ سے فراغت حاصل کر کے وطن واپس آئے تھے(بعض حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپ نے مدرسۂ شاہی مرادآباد سے فراغت حاصل کی تھی)۔

فراغت کے بعد وطن واپس آئے تو آپ کی شادی خانہ آبادی علی تانجو منگڈو کے ایک مہذب گھرانے کی لڑکی سے ہوئی،محمودالرحمن،حافظ الرحمن اورحبیب الرحمن آپ کے صاحب زادے ہیں۔

مولانا محمد صدیق صاحب ایک شاندار عالم دین،مصلح اور مدرس ہونے کے ساتھ بڑے دل جلے داعی اسلام تھے،علاوہ ازیں پندونصیحت کے ذریعے لوگوں کی اصلاح کرنے میں بھی یکتائے روزگار تھے، چنانچہ آپ کے متعلق حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی کا بیان ہے کہ:

> ”حضرت مولانا محمد صدیق صاحب بڑے نیک اور دردمند عالم دین تھے،آپ نے اپنے علاقے میں قرآنی تعلیم کی بڑی جاندار اور شاندار خدمت کی،ارشاد و تلقین،وعظ ونصیحت کو اپنی زندگی کا شعار بنالیا تھا،جماعت تبلیغ سے خاص وابستہ رہے تھے،آپ زہدوورع کے حوالے سے بھی بڑے مشہور تھے،آپ نے ایک پرہیزگار عالم دین کی حیثیت سے اپنی زندگی گزاری تھی“۔

مولانا محمد صدیق صاحب نے عرصۂ درازتک تعلیم وتلقین کے فرائض انجام دیتے ہوئے اسی سال کی عمر میں ۱۹۸۰ء میں وفات پائی،خاک گدوسرا میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا حافظ محمد طیب صاحب سوفرانگی، بوسیدنگی

حضرت مولانا حافظ محمد طیب صاحب کی ولادت ۱۹۵۳ء میں شمالی بوسیدنگ کی بستی سوفرانگ کے ایک معزز خاندان میں ہوئی، مکتب نشینی کے ساتھ آپ نے اپنی بستی کے حفظ خانے سے قرآن کریم کی مکمل حفظ کر کے وہاں کے مدرسہ میں داخلہ لیا، ابتدائی اور متوسطہ کی دینی تعلیم اپنے آبائی بستی میں حاصل کی، چند سال بستی کے مدرسے میں پڑھ کر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، وہاں سے آپ نے سند فراغت حاصل کی۔

حافظ صاحب غضب کے ذہین انسان تھے، جس طرح آپ ایک مایۂ ناز حافظ القرآن تھے، اسی طرح بلند پایہ کے عالم دین بھی، آپ کے متعلق بہتوں حفاظ کرام کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حافظ محمد طیب صاحب قرآن کریم کو الٹے پڑھ سکتے ہیں، مزید یہ کہ آپ نے زندگی بھر ختم تراویح کا التزام کیا، شنید ہے کہ ایسا واقعہ کبھی بھی پیش نہیں آیا کہ مولانا سے دوران تلاوت کبھی بھی غلطی ہوئی ہو، غرض بڑے ممتاز اور قابل حافظ قرآن تھے۔

حافظ صاحب نے اپنی زندگی میں چند حفظ خانے میں تعلیم دی، جس زمانے میں میں مدرسہ عالیہ بوسیدنگ میں زیر تعلیم تھا، اس زمانے میں آپ سابری گوانگ کے حفظ خانہ میں معلم تھے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آپ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہت دور دراز سے طلباء آتے لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ سے مایوس واپس چلے جاتے تھے۔

حافظ صاحب نہایت عالم پرست اور طالب علم دوست انسان تھے، علماء اور طلباء کی اہانت آپ کو بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی، آپ کے سامنے کہیں علماء یا طلباء کی اہانت ہوجاتی تو آپ لڑنے مرنے تک کے لئے تیار ہوجاتے تھے، اس حوالے سے بہت سارے واقعات دیکھنے اور سننے میں آئے تھے۔

حافظ صاحب بڑے خوددار طالب علم اور غیرت مند عالم دین وممتاز حافظ قرآن تھے، ساتھ ہی ساتھ جائز کی حد تک ضدی بھی تھے، بطور خاص نادان یا نام نہاد دانشوران سے آئے دن آپ کا زبانی مقابلہ رہتا تھا، گویا علم دین اور علمائے امت کی عزت وآبرو کا حفاظت کرنا آپ کی زندگی کا شیوہ بن چکا تھا۔

حافظ صاحب کا مزاج عاشقانہ تھا، آپ کی جوانی اور نوجوانی بڑی رنگ رلیوں میں گزر گئی تھی، شاعر بھی تھے اور قوال بھی، آپ نے اپنے وقت کے نامور قوالوں سے درجنوں مرتبہ مقابلہ ومسابقہ کیا، آپ نے وقت کے جن قوالوں سے مقابلہ کیا تھا ان میں قاسم قوال اکیابی، زین العابدین قوال منگڈوی، مولوی عبد الحنان قوال منگڈوی، مقبول احمد قوال اور مولوی نورالاسلام قوال ناقابل فراموش ہیں، اور ان میں سے بھی مقبول احمد قوال اور مولوی نورالاسلام قوال سے آپ نے درجنوں مرتبہ مقابلہ کیا تھا، موخرالذکر قوال صاحب سے آپ کا مقابلہ جو مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ میں ہوا، بہت شہرت کا حامل رہا تھا۔

حافظ صاحب کی شہرت جس طرح بطور حافظ قرآن چاردانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی، اسی طرح آپ قوالی کی دنیا میں بھی بہت مشہور ہوگئے تھے، آپ کے چند نامور شاگرد قوالی کی دنیا میں اب بھی ہیں، جن میں مولوی عبدالشکور قوال لوادنگی بوسیدنگی اور مولوی محمد زمان قوال بڑی شہرت کے حامل ہیں۔

حافظ صاحب جس زمانے میں مدرسہ عالیہ بوسیدنگ میں درجہ عالیہ کے طالب علم تھے، اسی زمانے میں شبیر احمد المعروف بہ ''شبو'' شقدارفاروی منگڈوی نجی کام کے سلسلے میں بوسیدنگ آئے دن آیا کرتے اور ریلوے کے مقام پر ٹھہرتے تھے، ظاہر ہے کہ شبیر صاحب مسابقہ کا آدمی نہ تھے، بس وہ ایک معنی کے گلوکار تھے، شبیر صاحب جب بھی یہاں آتے تو حافظ صاحب اپنے ہمنوا اور ساتھیوں سمیت شبیر صاحب کے قیام گاہ میں پہنچ جاتے تھے، خود بھی گاتے اور شبیر صاحب کی مدھور اور مدبھری آواز سے محظوظ بھی ہوا کرتے تھے، آپ شبیر صاحب کے بڑے مداح تھے، اور کہتے تھے کہ شبیر صاحب بڑے ہر دلعزیز، عاشق مزاج اور ملنسار گلوکار ہیں، ویسے شبیر صاحب کے ساتھ رات گزاری کی پاداش میں حافظ صاحب کو اساتذۂ کرام کی سرزنش کا بہتوں مرتبہ سامنا بھی کرنا پڑا تھا، مگر آپ سرزنش کی پرواہ کئے بغیر شبیر احمد صاحب کے یہاں جایا کرتے تھے۔

حافظ صاحب جوانی میں فٹ بال کے بڑے رسیا تھے، بڑے اچھے کھلاڑی بھی تھے، فٹ بال کھیلنے کی وجہ سے آپ کو مختلف مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا، حتی کہ خانگی دشواریاں میں پیش آئی تھیں۔

حافظ صاحب کی آبائی بستی سوفرانگ میں ایک مدرسہ ہے، جہاں سے آپ نے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم پائی، گئی صدی کی اسی کی دہائی میں آپ اس مدرسہ کے مہتمم مقرر ہوئے تھے، چنانچہ آپ مدرسہ کی

طرف سے حجاز مقدس پہنچے تھے، آپ نے حج بیت اللہ وزیارت مدینہ منورہ سے فراغت کے بعد اس مدرسہ کے حوالے سے وہاں کام بھی کیا تھا، اس حج وزیارت سے فراغت پر آپ وطن واپس پہنچے، لیکن آپ کی زندگی بدل سی گئی تھی، تصوف کی طرف آپ کا رجحان بڑھ گیا تھا، چنانچہ آپ نے شیخ طریقت حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کھجر یلی کے دربار میں پہنچ کر بیعت کی، یوں یادالٰہی میں مشغول ہو گئے تھے، ویسے چند سال گزرتے نہ گزرتے حضرت پیر صاحب نے آپ کو خلعت اجازت سے سرفراز کر دیا تو اب آپ کی زندگی میں مزید رنگ بھرا، پیری مریدی کا سلسلہ جاری کر دیا تو لوگ آپ کی طرف رجوع کرنے لگے، آپ وعظ ونصیحت اور تلقین وارشاد کے ذریعے لوگوں کو دین کی طرف لانے لگے، یوں چند سال گزرتے نہ کرتے آپ کے مریدوں کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہوگئی تھی۔

حافظ صاحب ایک سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے، نعت رسول خود بھی گاتے اور دوسروں سے بھی سنا کرتے تھے، آپ کی دھن اور لحن وآواز میں بڑی کشش تھی، حضرت رسول اکرم ؐ کی مدح سرائی ہوتی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے، اس حوالے سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ صحیح معنی کے فنافی الرسول انسان تھے۔

میری نانہال کی بستی باغکونہ، بوسیدنگ میں حافظ محمد طیب صاحب کے انگنت مریدان اور چاہنے والے ہیں، ان میں میرے قریبی رشتے داروں میں سے بھی چند حضرات تھے، میرے ماموں جناب ماسٹر حافظ احمد صاحب (مرحوم) بھی آپ کے مرید اور شیدائی تھے، چنانچہ حافظ صاحب پیری مریدی کے سلسلے میں یہاں آیا کرتے تھے، بطور خاص جبھی اس بستی کے مدرسے کا سالانہ جلسہ ہوتا، آپ ضرور مدعو ہوتے تھے، غالبا ۱۹۸۸ء کا واقعہ تھا کہ میں بنگلا دیش سے وہاں پہنچا تو دیکھتے ہیں کہ حافظ صاحب میرے پہنچنے کے ایک دن پہلے وہیں تشریف فرما ہیں، مجھے پا کر آپ بڑے خوش ہوئے، ویسے چند دن آپ کی رفاقت میں وقت گزارنے کا موقع ملا، میرے والد صاحب ایک روز آپ بشمول آپ کے ساتھیوں کو کھانے پر بلایا تو آپ نے قبول کیا، کھانے کے بعد فرمانے لگے کہ:

> ”بھائی طاہر جمال صاحب! نہ جانے زندگی مزید کتنی باقی ہے، آپ تو چند دن کے بعد بنگلا دیش چلے جائیں گے، خدا معلوم اس دنیا میں آپ سے پھر کبھی ملاقات ہو

> گی کہ نہیں، لیکن یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتا ہوں کہ انشاء اللہ جنت میں ملاقات تو ضرور ہوگی، چنانچہ آپ سے یہی ملاقات اس مستعار زندگی میں میری آخری ملاقات ثابت ہوئی“۔

۲۰۰۲ء کا واقعہ تھا کہ آپ دوبارہ حجاز مقدس پہنچے ہوئے تھے، حج وزیارت سے فارغ ہوئے تو آپ کو بیماری لاحق ہوگئی، اور شدت بیماری کی تاب نہ لا کر ارکان کے اس مایۂ ناز فرزند نے داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون، نماز جنازہ حرم مکی میں ہوئی اور جنت المعلی میں آسودۂ خاک ہوئے۔ ع

سردارِ عاشقان رسول خدا ہی تھے۔

حضرت مولانا محمود الرحمن صاحب گدوسراوی

حضرت مولانا محمود الرحمن بن حضرت مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب ۱۸۹۳ء میں جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی گدوسرا میں پیدا ہوئے، آپ کے والد مرحوم حضرت مولانا حافظ محمد یعقوب صاحبؒ وقت کے شیخ الشیوخ تھے، اور والدہ مرحومہ بھی ایک نیک، پاکیزہ اور بلند اخلاق کی خاتون تھی۔

حضرت مولانا اور سیف اللہ صاحب گدوسراوی کے مطابق آپ خاندان یعقوب کے دوسرے روشن چراغ تھے، جنھوں نے زندگی بھر قوم وملت کی بھرپور خدمات انجام دے کر اس جہان فانی سے رخصت لی۔

مولانا محمود الرحمن صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنی بستی گدوسرا میں پائی، غالبا آپ نے اپنے والد صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، علاقے میں متوسطہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عمر کے لحاظ سے کچھ بڑے ہوئے تو آپ نے اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور دارالعلوم دیوبند میں جا داخلہ لیا، جہاں سے سند فراغت حاصل کر کے وطن واپس آئے تھے۔

آپ کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اور شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ مولانا محمود الرحمن صاحب نے وطن واپسی پر سرزمین ارکان کے عظیم اور معروف داعی حضرت الحاج محمد اسماعیل صاحب راجار بیلی کی صاحب زادی سے شادی کی، اللہ تعالی نے اس شادی میں بڑی برکت دی، چنانچہ اس اہلیہ محترمہ کے بطن سے مولانا اشرف علی صاحب اور مولانا شمس العالم صاحب (مقیم حال مکہ مکرمہ) کے علاوہ اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں، ماضی میں مولانا اشرف علی صاحب سے راقم السطور کا قریبی تعلق رہا، آپ کے ساتھ ایک مدت تک مل کر کام کرنے کا بھی موقع ملا، نہ جانے آج کل کہاں مقیم ہیں، مولانا اشرف علی صاحب نہایت خلیق عالم باعمل ہونے کے علاوہ ایک مرد مجاہد بھی ہیں، مولانا اشرف علی صاحب کا ایک صاحب زادہ ۱۹۹۴ء کے جہاد میں شہید ہوا۔

مولانا محمود الرحمن صاحب نے مدرسہ عالیہ شقدارفارہ میں قابل قدر تدریسی خدمات انجام دیں، زہد و تقوی کے ساتھ مختلف علوم وفنون میں آپ یکتائے روزگار مانے جاتے تھے، عرصۂ دراز تک آپ نے درس و تدریس کے ساتھ منسلک رہ کر ۱۹۵۹ء میں گدوسرا میں داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور سرزمین گدوسرا میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا مرتضی حسن صاحب نلبنوی

مولانا مرتضی حسن صاحب کی ولادت جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی نلبنیہ میں ہوئی، کہتے ہیں کہ آپ کے والد حضرت مولانا احمد حسین بن ضمیر الدین صاحب ایک جلیل القدر عالم دین ہونے کے ساتھ صاحب بصیرت اور خدا ترس بزرگ تھے، جنھوں نے اپنی مستعار زندگی میں قوم وملت کی کافی خدمات انجام دے کر اس جہان فانی سے رخصت لی۔

مولانا مرتضی حسن صاحب کی مکتب نشینی اور ابتدائی تعلیم اپنے نامور باپ کے ہاتھ میں ہوئی، اس کے بعد ہتالیہ فارہ کے مدرسہ میں بھرتی ہوئے، وہیں جماعت ششم تک کی تعلیم پانے کے بعد مدرسہ شرف العلوم نور اللہ فارہ منگڈو میں داخلہ لیا، جہاں سے جماعت اولی تک کی تعلیم مکمل کر کے رنگون چلے گئے، جہاں ایک دینی ادارہ میں چھ مہینے تک تعلیم دیتے ہوئے ہندوستان جانے کے لئے ویزے کے انتظار کرتے رہے تھے، چنانچہ ویزہ ملتے ہی ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئے، اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد مزید ایک سال تک دیگر علوم کے مطالعے کر کے سیدھے وطن واپس آ گئے تھے۔

وطن میں چند دن گزار کے بعد دوبارہ آپ نے رنگون کا سفر کیا، جہاں ایک دینی ادارہ کی بنیاد ڈالی، اس ادارہ میں آپ کا کام نہیں بن سکا تو آپ پگو چلے گئے، جہاں اور ایک دینی ادارہ "مدرسہ اسلامیہ" کی بنیاد رکھی، جس میں آپ تقریبا چار سالوں تک تعلیم دیتے رہے، اس کے بعد اس مدرسہ کو دیگر ذمے داروں کو سپرد کر کے ۱۹۶۳ء میں "کوکرے" چلے گئے، جہاں کے ایک دینی مدرسہ "مدرسہ محمدیہ" میں چار سالوں تک تعلیم دیتے رہے، آپ نے وہیں سے ایک شادی کی، اور شادی کے بعد ارکان واپس آ کے مدرسہ عالیہ شقدارفارہ اور جامع مسجد منگڈو میں خدمات انجام دیتے رہے تھے۔

مولانا ۱۹۹۱ء میں سعودی عرب چلے گئے، حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے فراغت بعد کیلو اربعہ عشر جدہ کی ایک جامع مسجد "مسجد قادر فارہ" میں امامت کے علاوہ ایک رفاہی وفلاحی تنظیم "الجمعیۃ الخیریۃ" کی ذمے داری نبھائی، اس رفاہی وفلاحی تنظیم کے لئے آپ نے سعودی حکومت سے اجازت نامہ بھی حاصل کیا تھا، بعد ازاں رنگون سے ہوتے ہوئے تھائی لینڈ کے دارالحکومت بنکاک پہنچے، جہاں کی ایک جامع مسجد میں دس سال تک امامت وخطابت کے فریضے انجام دیتے ہوئے پھر رنگون واپس آئے، جہاں کی ایک دینی درسگاہ "مدرسہ نعمانیہ" میں شیخ الحدیث کے بطور فرائض انجام دیتے رہے تھے۔

مولانا فنون لطیفہ سے بڑی حد تک شغف رکھتے تھے، آپ ہندوستان کے آخری مسلم تاجدار شاہ ظفر اور شاعر مشرق علامہ اقبال کے اشعار کے حافظ کہلائے جاتے تھے، جمعیت علمائے ہند طرز کی سیاست بھی کرتے تھے، تحریک جہاد اسلامی ارکان کے حوالے سے یوں تو آپ تقریباً خاموش نظر آتے تھے، مگر پتہ چلا کہ دل ہی دل میں اس تحریک کی کامیابی کے لئے کوشاں اور دعا گو تھے، شریعت مطہرہ کے بڑے پابند اور سنت رسول اکرمؐ کے بڑے شیدائی تھے، آپ نے اپنے دور میں جامع مسجد منگڈو کی توسیع بھی کی تھی، آپ بڑے عالم، صاحب بصرت وفراست انسان کہلائے جاتے تھے، علماء کے علاوہ دانشوران بھی آپ سے مستفید ہوتے تھے۔

مولانا مرتضی حسن صاحب نے اپنی عملی زندگی کو دین اور قوم کی خدمات میں گزار کر انتقال کیا، آپ کی اولاد میں سے تین عالم دین ہیں، جو راقم السطور کے تلامذہ میں سے ہیں، اللہ تعالی ان سب کو کامران کرے، آمین، یارب العالمین۔

حضرت مولانا منیر احمد صاحب زادی فرانگی، بوسیدنگی

محترم حضرت مولانا منیر احمد بن حضرت مولانا اصحاب الدین صاحبؒ کی ولادت ۱۹۵۲ء میں موضع زادی فرانگ شمالی بوسیدنگ میں ہوئی، آپ کے والد حضرت مولانا اصحاب الدین صاحبؒ اپنے وقت کے جلیل القدر عالم دین اور فقیہ وکلامی بزرگ تھے، جن کی مختصر سوانح حیات میرے اس سلسلۂ کاوش کی زینت بنی ہوئی ہے، علاوہ ازیں آپ کے بڑے بھائی جناب محترم ماسٹر محمد عزیز صاحب بھی ایک قابل قدر دانشور، خادم قوم اور معمر سیاست دان ومحرک قومی لیڈر تھے، جن کی مختصر سوانح حیات بھی اس سلسلۂ کاوش کی زینت ہے۔

مولانا منیر احمد صاحب کی مکتب نشینی اور ابتدائی تعلیم اپنے بزرگ والد کے ہاتھوں ہوئی، اس کے بعد بستی کے مکتب میں بٹھا دیئے گئے، بعد میں دار العلوم فندو فرانگ میں تعلیم پا کر مدرسہ عالیہ بوسیدنگ میں متوسطہ کی تعلیم ختم کی، اس کے بعد دار العلوم میانجان پور میں موقوف علیہ کی کتابیں پڑھ کر اعلی تعلیم کے لئے پاکستان پہنچے اور دورۂ حدیث جامعہ اسلامیہ ٹنڈ اللہ یار میں پڑھ کر سند فراغت حاصل کر لی، اس کے بعد دیگر کچھ عصری تعلیم حاصل کر کے ۱۹۷۱ء میں تعلیم سے فارغ ہو گئے تھے۔

مولانا منیر احمد صاحب تعلیم سے فراغت کے بعد کراچی پہنچے، اور برمی کالونی کراچی کے ایک دینی درسگاہ میں چند سال تعلیم دی، بعد ازاں ۱۹۷۶ء میں حج بیت اللہ شریف کی نیت سے مکہ مکرمہ پہنچے تھے۔

مکہ مکرمہ میں مولانا سے میری درجنوں مرتبہ ملاقاتیں رہی ہیں، جبھی میں آپ کی رہائش گاہ پہنچتا تو آپ کی آنکھوں میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی، محبت اور شفقت میں کوئی بھی کمی نہیں رکھتے تھے، آپ کا ایک داماد مولوی محمد نور صاحب میرے شاگرد رشید ہیں، ماشاء اللہ تعالی بڑے ادب شناس اور کافی ہشیار عالم دین ہے، اللہ تعالی مولوی محمد نور کی حیات دراز فرمائے۔

مولانا منیر احمد صاحب کو جہاں تک دیکھا اور پایا، ماشاء اللہ بڑے جان دار عالم دین پایا، آپ نہایت ملنسار، ہنس مکھ اور خوش طبع انسان ہیں، دوستوں احبابوں کی دل جوئی میں بہت مشہور اور میرے مطابق یکتائے روزگار ہیں، جس طرح عرض کی گئی ہے کہ میری آپ سے بار ہا ملاقاتیں رہیں، کبھی کبھی علمی موضوعات پر گفتگو بھی فرماتے تھے، جتنے بھی فرماتے ماشاء اللہ بہت خوب فرمایا کرتے تھے، سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، آپ نے غالباً ۲۰۲۲ء میں انتقال کیا، خاکِ مقدس میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا منیر اللہ صاحب گدوسراوی

حضرت مولانا منیر اللہ صاحب جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی گدوسرا میں پیدا ہوئے، آپ کی تاریخ ولادت کا پتہ نہ چل سکا، کہتے ہیں کہ آپ کے والد صاحب ایک عالم دوست آدمی تھے۔

مولانا نے اپنی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب گدوسراوی سے حاصل کی، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان پہنچ کر از ہر ہند دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا، وہاں چند سال مسلسل پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب سے مستفید ہو کے وطن واپس آئے تھے۔

شادی خانہ آبادی کے بعد مولانا منیر اللہ صاحب مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں مدرس ہوئے، عرصہ دراز تک اس مدرسہ میں حدیث وتفسیر کے درس دیتے رہے، چنانچہ مولانا کے متعلق حضرت مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی صاحب کا بیان ہے کہ:

> ''حضرت مولانا منیر اللہ صاحب ایک جلیل القدر عالم دین تھے، مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں مدت دراز تک حدیث نبویؐ وتفسیر القرآن کی خدمات انجام دیتے رہے، بعد میں اسی مدرسہ میں ایک انقلاب آیا تو آپ نے اس مدرسہ سے کنارہ کشی اختیار کی، اس کنارہ کشی کے دوران آپ نے مدرسہ عالیہ شقدار فارہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد بعض وجوہات کے پیش نظر آپ شاہی فرید دیپ چلے گئے اور وہاں کے مدرسہ ''بحر العلوم'' میں عرصۂ دراز تک تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے، آپ نے اپنی عمر کے آخری حصے وہیں گزارے، آپ حدیث وتفسیر فقہ وتاریخ میں ید طولی رکھتے تھے، آپ پند ونصیحت کے حوالے سے بھی واعظِ بےنظیر تھے''۔

حضرت مولانا منیر اللہ صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے، پہلا بیٹا مولوی محمد انور صاحب جب کہ دوسرا مولوی حافظ طفیل احمد صاحب ہیں، موخر الذکر صاحب زادہ مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں، بہر حال حضرت مولانا منیر اللہ صاحب نے اپنی مستعار عملی زندگی کو درس وتدریس میں گزار کر ۱۹۸۲ء میں شاہی فرید دیپ میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا حافظ محمد یوسف صاحب گدوسراوی

حضرت مولانا حافظ محمد یوسف صاحب بن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی ولادت ۱۸۹۵ء میں جنوبی منگڈو کی معروف ومردم خیز بستی گدوسرا میں ہوئی، آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب اپنے وقت کے ایک جلیل القدر عالم دین اور شیخ رہے تھے، کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ بھی بڑی پاکیزہ صفات اور اخلاقی خاتون تھی۔

مولانا حافظ محمد یوسف صاحب نے مکتب نشینی اور ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے اور ایک روایت کے مطابق بستی کے مکتب سے حاصل کی، اس کے بعد متوسطہ اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، کہتے ہیں کہ آپ نے متوسطہ کی تعلیم ہندوستان کی کسی دینی مدرسہ سے حاصل کی، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا، وہاں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصلی کی، دار العلوم میں آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قابل ذکر ہیں۔

فراغت کے بعد مولانا سیدھے وطن واپس آئے، آپ کی پہلی شادی نور اللہ فارہ کے چوہدری خاندان سے ہوئی جب کہ دوسری شادی شجاع فارہ کی ایک نیک صفات خاتون سے ہوئی تھی۔

اللہ تعالی نے حضرت مولانا حافظ محمد یوسف صاحب کی اولاد میں بڑی برکت دی، آپ پانچ بیٹے اور چار بیٹیوں کے والد تھے، بیٹوں میں بالترتیب مولانا رشید احمد صاحب، ماسٹر سید احمد صاحب، فضل احمد صاحب، فروخ احمد صاحب اور محمود احمد صاحب بڑے کام کے انسان بنے تھے۔

مولانا حافظ محمد یوسف صاحب مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں احادیث نبویؐ کے عرصۂ دراز تک استاد تھے، بعد میں نہ جانے کس وجہ سے آپ مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ کو چھوڑ کر میانجا نفور چلے گئے، وہاں آپ شیخ الحدیث مقرر ہوئے تھے، کہتے ہیں کہ مولانا حافظ محمد یوسف صاحب حدیث وتفسیر اور فقہ کے علاوہ دیگر علوم وفنون کے بھی ماہر تھے۔

مولانا ایک جید حافظ القرآن بھی تھے، رمضان المبارک میں جامع مسجد منگڈو میں ختم تراویح پڑھایا کرتے تھے، بعض علمائے کرام کا بیان ہے کہ مولانا بڑے صاحب ذوق عالم دین تھے، آپ نے عرصۂ دراز تک علم دین کی خدمات انجام دیتے ہوئے اپنی آبائی بستی گدوسرا میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا قاری مظہر الاسلام صاحب گدوسراوی

نامور عالم دین مولانا قاری مظہر الاسلام صاحب جنوبی منگڈو کی معروف بستی گدوسرا میں پیدا ہوئے، کہتے ہیں کہ آپ کے والد صاحب نہایت دین دار، پاکباز اور علماء پسند آدمی تھے، اور والدہ بھی بڑی پارسا خاتون تھی۔

قاری مظہر الاسلام صاحب نے مکتب نشینی کے بعد ابتدائی تعلیم گدوسرا میں پائی، متوسطہ کی تعلیم اس علاقہ کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں پاکر اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان گئے، وہاں کسی دینی درسگاہ سے سند فراغت حاصل کر کے وطن واپس آئے تھے۔

وطن واپسی کے بعد آپ حضرت مولانا حافظ محمد یوسف بن مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب کی صاحب زادی سے شادی کی، آپ کی اولاد میں مولانا سید عالم صاحب، نور عالم اور حفصہ قابل قدر ہیں۔

حضرت مولانا مظہر الاسلام صاحب نے مادر علمی مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں طویل مدت تک تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں، درس وتدریس کے تہ بتہ مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ کی طرف سے رنگون کے دورے کرتے رہے، کہتے ہیں کہ آپ نے وہاں سے بہتوں طالب علموں کو علم دین کے حصول کے لئے اس مدرسے میں لایا تھا، مولانا برمی زبان میں بڑی مہارت رکھتے تھے، برمی زبان اس طرح بولتے تھے کہ گویا آپ ایک روہنگیا نہیں بلکہ برمی نژاد مسلمان عالم دین ہیں۔

مولانا قاری مظہر الاسلام صاحب علم قرآت وتجوید میں خاصی مہارت رکھتے تھے، ویسے آپ قاری صاحب کے لقب سے معروف تھے، آپ سے بہتوں طالب علم مستفید ہوکے زمانے میں قاری القرآن مشہور ہوئے تھے، جنہوں نے بھی علم تجوید وقرآت کی نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔

مولانا قاری مظہر الاسلام صاحب اپنے وقت کے ایک جید عالم دین اور قاری القرآن ہونے ساتھ ایک شاعر بھی تھے، اردو اور روہنگیا زبان میں برجستہ طبع آزمائی کرتے تھے، فقہ وفتاوی میں بھی خاصی مہارت وتجربہ رکھتے تھے، علاوہ ازیں کہتے ہیں کہ آپ ایک ممتاز خطیب ومقرر بھی تھے۔

مولانا بڑے ذہین وفطین تو تھے ہی، لیکن آپ کا اپنی مستعار زندگی کے آخری سرا میں دماغی توازن بگڑ گیا تھا، ویسے آپ نے ملک وملت کی طویل المدت تک خدمات انجام دیتے ہوئے ۱۹۸۸ء میں انتقال فرمایا، اور گدوسرا میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا نثار احمد صاحب بانگونوی منگڈوی

حضرت مولانا نثار احمد بن ابوبکر بن عزیز الرحمن بن واعظ الدین کی پیدائش تقریباً ۱۹۱۱ء میں اپنی آبائی بستی بانگو نہ منگڈو میں ہوئی، کہتے ہیں کہ آپ کے والد جناب ابوبکر صاحب نہایت دین دار، خداترس اور علماء وصلحاء پسند آدمی تھے، کم عمری میں ان کا انتقال ہو گیا تھا، اور بعض لوگوں کے بیان کے مطابق آپ کی والدہ بھی بڑی پارسا وعابدہ خاتون تھی۔

مولانا نثار احمد صاحب بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے، اس لئے زندگی کے اگلے دوڑ میں آپ کو کافی پریشانیاں برداشت کرنی پڑی تھیں، بہر حال آپ نے ابتدائی اور متوسطہ کی دینی تعلیم اپنی بستی اور علاقے کے دیگر دینی درسگاہ میں پاکر اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان جانے کی تمنا ظاہر کی تو اپنے لائق چچا جناب ماسٹر امیر حمزہ اور ماسٹر صلاح الدین دودومیاں صاحبان تعاون کے لئے آگے بڑھے، چنانچہ انہوں نے اپنے چہیتے بھیجہ کو اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان روانہ کر دیا، مولانا نے ہندوستان کے مدارس میں تعلیم پانے کے بعد بالآخر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، جہاں سے سند فراغت حاصل کر کے وطن واپس آئے تھے۔

ہندوستان سے واپس آنے کے بعد مولانا نثار احمد صاحب نے عرصۂ دراز تک مدرسہ اشرف والعلوم نور اللہ فارہ میں تعلیمی خدمات انجام دیں، بعد میں اس مادر علمی میں مدت دراز تک عہدۂ اہتمام بھی سنبھالا، غالباً ۱۹۸۴ء میں راقم السطور کی آپ سے ملاقات ہوئی تھی، جہاں تک نظر آئے کہ آپ بڑے پائے کے عالم دین اور منتظم ہونے کے ساتھ نہایت شریف اور بلند اخلاق کے مالک بزرگ نظر آئے، آپ اپنی پوری عملی زندگی کو علم دین اور طلبائے علوم نبوت کی خدمات میں لگا کر ۱۹۸۶ء میں انتقال فرمایا، اپنی آبائی بستی بانگو نہ کی قبرستان میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا نثار احمد صاحب کی اولاد میں ایک حافظ ومولوی صاحب بھی ہیں، غالباً عطاء اللہ ان کا نام ہے، جن سے میری ملاقات ہوئی تھی، پھر آپ کے ایک اور صاحب زادہ گرامی جناب انجینئر عطاء الرحمن بھی ہیں، جنہوں نے وطن میں تعلیم پاکر اعلی تعلیم کے لئے ترکی کا سفر کیا، اور وہاں کی ایک یونیورسیٹی سے جغرافیہ میں ماجستر (MA) کر کے وہاں نوکری حاصل کی، آج کل وہ قومی وملی خدمات سے منسلک اور بڑے سرگرم عمل ہیں، اللہ تعالی ان کو قبول فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا نجم الدین صاحب نلبنوی

سرزمین ارکان میں دور آخر کے جلیل القدر عالم دین، منتظم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا نجم الدین صاحب معروف بہ نجم الدین صغری صاحب کی پیدائش تقریبا ۱۹۱۳ء میں جنوبی منگڈو کی معروف و مردم خیز بستی نلبنیہ میں ہوئی، کہتے ہیں کہ آپ کے والد صاحب ایک دین دار ہونے کے ساتھ بڑے عالم دوست اور صلحاء پسند بزرگ تھے۔

حضرت مولانا نجم الدین صاحب نے مکتب نشینی کے بعد ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم اپنے علاقہ میں پاکر اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اس حوالے سے ایک روایت یہ ہے کہ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، جب کہ دوسری ایک روایت کے مطابق آپ نے دارالعلوم دیوبند میں نہیں بلکہ امروہہ کی درسگاہ میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی تھی ،آپ کی فراغت لگ بھگ ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی۔

مولانا نجم الدین صاحب ایک سیاسی سوچ رکھنے والے طالب علم تھے، چنانچہ آپ دوران تعلیم تنظیم ''خدام الاسلام ارکان برما'' کے رکن رہے تھے، بہر حال فراغت کے بعد آپ سیدھے وطن واپس آئے، اور شادی خانہ آبادی کے بعد مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں مدرس مقرر ہوئے تھے۔

حضرت مولانا نجم الدین صاحب نے مادر علمی مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں ۱۹۹۵ء تک تدریسی خدمات انجام دیں، ویسے آپ کے ہزاروں تلامذہ اب تک اندرون وطن اور بیرون وطن میں پھیلے ہو ئے ہیں، مولانا نجم الدین صاحب ۱۹۸۹ء سے دم آخر تک مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں دوسری کتابوں کے ساتھ بخاری شریف کا درس دیتے رہے تھے، آپ کے چند تلامذہ سے میری ملاقاتیں رہی ہیں، ماشاء اللہ ہر ایک آپ کے مدح سرا ہے۔

مولانا نجم الدین صاحب ایک منتظم بزرگ بھی تھے، چنانچہ آپ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ کے مہتمم رہے، بعض حضرات کا یہی کہنا ہے کہ مولانا جتنے بڑے عالم دین تھے اتنے بڑے معاملہ فہم منتظم بھی تھے۔

مولانا نجم الدین صاحب ایک عالم دین اور منتظم تھے، آپ نے غالبا ۱۹۹۸ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، اللہ تعالی آپ کے مراتب بلند کرے، اور جنت الخلد میں عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

حضرت مولانا حافظ نور الاسلام صاحب نلبنوی

محترم حافظ نور الاسلام بن نور احمد بن عبد المجید بن عبد اللہ کی ولادت ۱۹۵۱ء میں بستی نلبنیہ جنوبی منگڈو میں ہوئی، آپ کے والد مرحوم جناب نور احمد صاحب بڑے دیندار اور خداترس انسان تھے، اور والدہ مرحومہ معراج بی بی بھی حافظ صاحب کے بیان کے مطابق بڑی نیک صفات خاتون تھی۔

حافظ صاحب کی ابتدائی تعلیم آپ کے آبائی گاؤں کے مکتب میں ہوئی، اور پانچویں جماعت تک کی تعلیم شقدار فارہ ہائی اسکول میں پائی، برمیز اسکول میں آپ سے ایک مگھ طالب علم کا جھڑپ ہوا تو آپ بھاگ کر اپنے گاؤں چلے گئے، بعد میں علی تانجو کے معروف حفظ خانہ میں شیخ القراء حضرت مولانا حافظ ابوالخیر صاحب سے قرآن کریم کا پورا حفظ کیا، اس کے بعد اسی حفظ خانہ سے ملحق مدرسہ میں ایک سال دینی علم کی تعلیم حاصل کی تھی۔

حافظ نور الاسلام صاحب ۱۹۶۷ء میں پاکستان چلے گئے اور مدرسہ اعدادیہ برمی کالونی میں حفظ کے دورہ کے ساتھ دیگر دینی کتب کے مطالعہ بھی کرتے رہے، اس کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب کی ادارت میں چلنے والی دینی درسگاہ ''مدرسہ فاروقیہ'' میں بھرتی ہوئے، وہاں سے آپ نے جماعت سوم تک کی دینی تعلیم پائی تھی۔

حافظ صاحب ۱۹۷۴ء میں متحدہ عرب امارات چلے گئے، وہاں ان کے بڑے اور فاضل بھائی حضرت مولانا شیخ فیاض احمد کے مدرسہ ''فیاض العلوم'' سے ملحق حفظ خانہ میں چار سالوں تک مسلسل حفظ کی تعلیم دی، اس کے بعد آپ ۱۹۷۷ء میں سعودی عرب چلے گئے، اقامہ وغیرہ کے حصول کے بعد دوبارہ متحدہ عرب امارات چلے تو گئے لیکن حرمین شریفین کی محبت میں شرشار ہو کے ۱۹۷۹ء میں مستقل طور پر سعودی عرب میں اقامت گزین ہو گئے تھے۔

۱۹۷۹ء میں حافظ صاحب نے شہر جدہ میں تجارت کا سلسلہ شروع کیا، کرانتینہ اور سوق بن لادن جدہ میں مفروشات کی دکانیں چلائیں، پھر سوق الصواریخ منتقل ہو کے دس سالوں تک وہاں تجارت کا سلسلہ جاری رکھا، اس کے بعد ۱۹۹۰ء میں شہر دمام (سعودی عرب) میں منتقل ہو گئے، وہاں میں آپ مفروشات کی دکانوں کے ساتھ دیگر تجارتی کاموں میں مشغول رہے، اللہ تعالی نے آپ کی تجارت میں بڑی برکت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں کروڑوں کے مالک بن گئے۔

حافظ صاحب ۱۴۳۱ھ میں کینسر کے مرض میں مبتلا ہوئے، دمام کے ایک معروف شفاخانے میں آپ کا اپریشن ہوا، لاکھوں کی مالیت کے مصارف پر آپریشن تو ہوا مگر کامیابی تو خالق ومالک کے ہاتھ میں ہے، خاصی کوشش کے باوجود آپ شفایاب نہیں ہوسکے، آخر کار آپ کا انتقال غالبا ۲۰۱۲ کے لگ بھگ ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حافظ نور الاسلام صاحب کے چند بھائی ہیں، عبد المالک صاحب (کالو)، مولانا فیاض احمد صاحب، مستفیض الرحمن صاحب، امام حسین صاحب میں سے مولانا فیاض احمد صاحب کی بڑی بڑی دینی اور انسانی خدمات ہیں، مولانا فیاض احمد صاحب کی اولاد میں سے صدیق مکرم مولانا نور الہدی صاحب ندوی مرحوم رقم السطور کے مخلص دوستوں اور خیر خواہوں میں سے تھے، مولانا نور الہدی صاحب کی تعلیم میں حافظ نور الاسلام صاحب کی بڑی اعانت تھی، اللہ تعالی کے کرم اور احسان اور حافظ صاحب کی کوشش کے نتیجے میں مرحوم مولانا نور الہدی صاحب ایک اعلی درجہ کے عالم بنے تھے، افسوس حیات نے وفا نہ کی، آپ بھر پور جوانی میں جدہ میں وفات پاگئے۔

حافظ نور الاسلام صاحب نے ۱۹۷۴ء میں بی بی شمس النہار بنت ابوسعید جیمنگ خالوی سے شادی کی، ان کے بطن سے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں، بڑے بیٹے حافظ عبد اللہ ماشاء اللہ بڑا زیرک ہے، عبد الکریم ایک بڑا تاجر بنا، محمد زکریا جو ۲۰۰۷ء کے دوران تعلیم کے سلسلہ میں یمن کے دار الحکومت صنعاء میں کلیۃ الطب میں زیر تعلیم ہے، اللہ تعالی ان سب کو کامیاب کرے۔

حافظ صاحب کے ارکانی اساتذہ میں حافظ ابو الخیر مرحوم کے علاوہ مولانا نور احمد قادر بیلوی، مولانا حبیب الرحمن اودنگی، مولانا بشیر علی علی تانجوی او مولانا سمیع اللہ علی تانجوی قابل قدر ہیں، اس طرح دستوں میں مولوی کلیم اللہ بن صدیق احمد سوداگر سندی فرانگی، حافظ محمد حسین سنبنوی، حافظ محمد یعقوب بارنگیہ ڈیلوی اور مولوی محمد عالم ہاتھی ماروی قابل ذکر ہیں۔

مرحوم حافظ نور الاسلام صاحب نے اپنی مستعار زندگی میں بڑی بڑی دینی، انسانی اور قومی خدمات انجام دیں، آپ نے انگنت حفاظوں کے استاد ہونے کے علاوہ نیپال میں ایک مسجد کی تعمیر کروائی، اس طرح اپنی آبائی بستی نلبنیہ میں چند اسکولوں کی تعمیر کروائی، راستے اور پل بنوائے، اساتذۂ مدارس دینیہ کی تنخواہیں اپنے جیب خاص سے ادا کرنے کے ساتھ بے شمار یتیموں کی کفالت، ناداروں کی خدمت انجام دی ہیں، ان خدمات کے علاوہ تحریک آزادی کے حوالے سے اس وقت پائی جانے والی تنظیموں

کی بڑی بڑی مالی امداد واعانت کی، اللہ تعالی آپ کی جملہ خدمات کو قبول کرے۔

حافظ صاحب بڑے ہنس مکھ، ملنسار اور خوش اخلاق انسان تھے، مالدار ہونے کے ساتھ بڑے سخی اور فراخ دل بھی تھے، حفاظ قرآن سے بڑے الفت اور شفقت رکھتے تھے، کہتے ہیں کہ آپ کے در سے کوئی بھی انسان نا امید نہیں جاسکتے تھے، جتنا بھی ممکن ہوتا تھا لوگوں کے دلوں کو خوش رکھنے میں لگے رہتے تھے، اللہ تعالی مغفرت فرمائے، آمین۔

حضرت العلامہ مولانا ولایت حسین صاحب ممبراوی

سرزمین ارکان کے ممتاز و مایۂ ناز عالم دین، بلند پایہ کے ادیب وشاعر، مصنف و قلمکار حضرت مولانا ولایت حسین بن حضرت مولانا عبد الخالق بن صوفی علی حسین صاحب ۱۹۳۹ء میں موضع سانگری فارہ، ممبرا، ارکان میں پیدا ہوئے، آپ ابھی دو سال کے شیر خوار بچے تھے کہ آپ کے والد مولانا عبدالخالق بن صوفی علی حسین کا انتقال ہوگیا، آپ کے والد صاحب حضرت شیخ طریقت مولانا امیر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ خاص اور مجاز بیعت تھے، اسی طرح مولانا کا ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا بھائی ایام طفولت میں انتقال کرگیا، آپ کے علاوہ آپ کا اور ایک چھوٹا بھائی تادم تحریر الحمدللہ تعالی حیات سے ہیں۔

مولانا ابھی ایام طفولت میں تھے کہ سرزمین ارکان اور وہاں کے مسلمانوں پر وہ مصیبت ناگہانی آئی جسے عام زبان میں مگھ کاڑا کاڑی (قتال مگھ ومسلمان) کہا جاتا ہے (یعنی ۱۹۴۲ء کا وہ سانحہ عظیمہ جس نے پوری سرزمین کو خاک وخون میں نہلا دیا تھا نازل ہوا)، چنانچہ ایام قتال کے دوران آپ کی والدہ نے زندگی کو ہتھیلی پر رکھ کر اپنے بچوں سمیت ارکان سے ہجرت کرکے علاقۂ رنگپور میں پناہ لی تھی، رنگپور میں مولانا کا داخلہ ایک سرکاری اسکول میں ہوا، وہیں قرآن کریم کا ناظرہ اور کچھ بنگلہ زبان کی تعلیم پائی، اگلے تین چار سال بعد آپ اپنی والدہ کے ساتھ وطن واپس آئے تھے۔

وطن واپسی پر آپ کا داخلہ اور ایک مدرسہ میں ہوا، جس میں اردو کی ابتدائیات کے علاوہ بری زبان کی کچھ تعلیم پائی، اس کے بعد اگلے سال آپ کا داخلہ مدرسہ محی العلوم یونگ چنگ میں ہوا، وہیں عربی، فارسی زبانوں کے علاوہ فقہ، اصول فقہ، نحو وصرف اور منطق پر مہارت حاصل کی، مدرسۂ مذکورہ کے شیخ معروف عالم دین حضرت مولانا محمد صالح صاحب آپ کو بہت پیار کرتے تھے، جنھوں نے اپنے قریب رکھ کر خاص تعلیم دی، چند سال کے بعد مولانا صالح صاحب بعض ناقابل بیان وجوہات کی بنیاد پر مدرسۂ مذکورہ سے منتقل ہوکر مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ گئے تو انہوں نے اپنے شاگرد رشید کو بھی ساتھ لے گیا، جہاں آپ نے کنز الدقائق اور شرح ملا جامی وغیرہ کتابیں پڑھیں، پھر مولانا محمد

صالح صاحب زانخامہ (علاقۂ بوسیدنگ) کے مدرسہ میں منتقل ہوئے تو آپ بھی اپنے استاد کو ے ساتھ وہاں گئے، جہاں آپ نے نور الانوار وغیرہ کتابیں پڑھیں، اسی سال آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔

والدہ کے انتقال کے بعد آپ سرزمین ارکان کے دارالحکومت اکیاب چلے گئے، جہاں آپ کو ایک صاحب ثروت اہل خیر ملا، جس نے آپ کو دیگر طلباء کے ساتھ اعلی دینی تعلیم کے لئے بنگال بھیجا، چنانچہ مدرسہ ضمیریہ پٹیہ میں چند سال تعلیم پا کر ۱۹۵۴ء میں سند فراغت حاصل کی تھی۔

مولانا فراغت کے بعد وطن واپس لوٹے اور موضع شیتا فوریکہ کی ایک دینی درسگاہ میں مدرس مقرر ہوئے، لیکن اگلے سال اکیاب چلے گئے، اور مدرسہ عالیہ ناظرہ فارہ اکیاب میں ایک سال پڑھا کر دوسرے سال قصائی فارہ اکیاب میں مدرس مقرر ہوئے، جہاں آپ نے بعض بدعتی لوگوں سے جدال کی حد تک مناظرہ کیا، اور رد بدعت وخرافات پر ایک رسالہ بھی لکھا، جس کا نام ''طاعت نما بدعت'' رکھا گیا تھا، لیکن جواب تک مخطوط ہی رہ گیا ہے۔

سرزمین ارکان کے سیاسی حالات سے تنگ ہوکر مولانا نے ۱۹۶۶ء میں ہجرت کی، اور چاٹگام کے معروف علاقہ حوالی شہر کے ایک مدرسہ میں پڑھانا شروع کیا، مگر یہ علاقہ بھی آپ کے لئے راس نہ آیا، چناچہ ڈیڑھ سال کے بعد آپ اپنے اہل وعیال سمیت مغربی پاکستان کے شہر کراچی پہنچ گئے تھے۔

کراچی میں آپ بنارس کالونی میں ٹھہرے اور ایک مطبع سے وابستہ ہوکر بعض علمی وقلمی خدمات انجام دیں، اس دوران آپ مسجد حضراء میں بچوں کو دینی تعلیم دیتے رہے، دریں اثناء آپ نے جناح روڈ میں واقع ''عربی کالج'' میں داخلہ لیا، جہاں سے آپ نے انگریزی اور عربی زبانوں کی باضابطہ سند حاصل کی، بعد ازاں کورنگی کے ایک دینی مدرسہ میں پڑھاتے رہے، اسی دوران جمعیت علمائے اسلام کے دفتر میں کام بھی کیا، اس کے بعد موسی کالونی میں سکونت مستقل پذیر ہوگئے، جہاں آپ نے اپنے مکان سے ملحق ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھ کر تعلیمی خدمات انجام دیں۔

مولانا بعد میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کی نیت سے حجاز مقدس پہنچے، حج وزیارت سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ کے ایک مدرسہ میں پڑھانا شروع کردیا تھا، لیکن وہاں بعض حاسدین نے آپ کو بہت ہی تنگ کیا، جس کے نتیجے میں آپ کو مدرسہ چھوڑنا پڑا تھا۔

مولانا مدینہ منورہ کے اس مدرسہ سے مستعفی ہونے کے بعد پھر کراچی چلے گئے، اور ایک روایت کے مطابق آپ نے ایک پنجابی خاتون سے شادی کی، جس نے بعد میں آپ کو اتنا تنگ کیا کہ بالآخر آپ پاکستان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

مولانا ۱۹۹۰ء یا اس کے ایک سال بعد پاکستان چھوڑ کر بنگلا دیش پہنچ کر کوکس بازار میں اقامت پذیر ہو گئے، جہاں آپ نے ایک روہنگیا مسلم خاتون سے شادی کی، بعد میں اس نے بھی آپ کو چھوڑا تو آپ تقریبا بدحوس ہو گئے تھے، بہرحال مولانا تادم تحریر کوکس بازار میں مقیم ایک دینی مدرسہ میں بچوں کو تعلیم دینے کے ساتھ تصنیف وتالیف میں مشغول ہیں۔

مولانا عربی، اردو اور فارسی کے زندہ دل اور قادر الکلام شاعر ہیں، ساتھ ہی ساتھ کامیاب مورخ وشارح بھی، آج کل ترمذی شریف کی شرح لکھ رہے ہیں، اردو اور عربی زبان میں آپ کی متعدد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں، علاوہ ازیں بہت ساری تصانیف غیر مطبوعہ بھی ہیں، اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی مطبوعہ تصانیف کی فہرست حاضر خدمت کی جائے:

(۱) حول مآسی المسلمین في بورما الاشتراکیہ: یہ دوسو پیساٹھ صفحات پر مشتمل ایک قابل قدر تصنیف ہے، یہ ارکانی مسلمانوں کی حالت زار کی ایک تفصیلی داستان ہے، جس میں تاریخ بھی ہے اور مولانا کے دل کی دھڑکن بھی، یہ ارکانی مسلمانوں کی حالت زار پر مبنی ایک مفید کتاب ہے، جو دراصل مگھ برمی درندوں اور خونین کی خون خواری کی ایک زندہ دستاویز بھی ہے۔

(۲) الاشتراکیۃ تبلع المسلمین فی بورما: یہ کتاب روہنگیا مہاجرین کی تاریخ اور اس قوم کی داستان دل شکن پر مشتمل ہے، جو اس محروم قوم کی مختلف ہجرتوں کی تفصیلی داستان پر مشتمل ہے۔

(۳) الحق اقول: اس تصنیف میں مولانا نے مسلمانوں کے عروج وزوال، ذلت ونامرادی کے اسباب وعلل بیان کئے ہیں، اور مسلمانوں کو بحیثیت ایک زندہ قوم اس دنیا میں جینا ہے تو کن کن چیزوں کی ضرورت ہے، اس پر بحث کی گئی ہے۔

(۴) اردو اخبارات کے تراشیدے: یہ اردو اخبارات کے تراشیدوں کے ساتھ بعض مباحث پر مشتمل ایک تصنیف، جس میں ارکانی مسلمانوں کی خونیں داستان بیان کی گئی ہے، تین سو صفحات سے زائد اور

اق پر مشتمل ایک قابل تحسین تصنیف ہے۔

(۵) عداوت کے شعلے: یہ کتاب کتاب وسنت اور راسخین فی العلم کی آراء پر مشتمل اہل بیت خاص طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی خلافت کے خلاف کی گئی سازشوں کا علمی جواب ہے۔

(۶) قیامت قریب ہے: یہ چالیس احادیث کے ترجمے اور تشریحات پر مشتمل ایک کتاب ہے۔

(۷) مومن کا زندان: کتاب الرقائق کی چالیس احادیث اور ان کی تشریحات پر مشتمل ہے۔

(۸) الجہاد: اس کتاب میں جہاد اسلامی پر بحث کی گئی ہے، جس میں جہاد کی فضیلت، شہادت کی برکت اور جاسوسوں کے قتل وغیرہ مباحث پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۹) تلخ حقیقت: یہ الحق اقول کا اردو ترجمہ ہے۔

(۱۰) برمی مہاجرین کا تاریخی جائزہ: یہ الاشتراکیہ تبلغ المسلمین في بورما کا اردو ترجمہ ہے۔

(۱۱) ترک جہاد کا وبال ذلت وخواری ہے: کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔

(۱۲) تحفۂ نعمان: یہ علم الصرف کی ابتدائی کتاب ہے۔

(۱۳) خلاصۃ النحو: یہ علم النحو کی ابتدائی کتاب ہے۔

مولانا محترم کی غیر مطبوعہ بھی چند تصانیف ہیں، جن میں قابل ذکر یہ ہیں:

(۱) معیار انسانیت۔

(۲) طاعت نما معصیت۔

(۳) فتح العلام في ادلۃ الاحکام۔

(۴) مفتاح القرآن، تعلیقات علی تفسیر الجلالین۔

(۵) مبادی القواعد اللغۃ العربیۃ۔

(۶) تعلیم الاسلام الجزء الاول والثانی۔

(۷) قاموس القرآن۔

۱۹۹۶ء کی بات ہے کہ مولانا سے ملنے کے لئے راقم السطور کوکس بازار گیا تو آپ نے از راہِ کرم اپنی رہائش گاہ میں کھانے کی دعوت کی، جہاں آپ سے ملک وملت کی زبوں حالی پر بہت ساری گفتگو کی

گئی، اس دوران آپ نے ترمذی شریف کی شرح پر مشتمل ایک مسودہ دکھایا، اور بتایا کہ یہ کتاب انشاء اللہ اگلے ایک سال میں مکمل ہوجائے گی، نہ جانے حضرت کا آج کل کیا حال ہے۔

جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ مولانا عربی، فارسی اور اردو زبانوں کے ایک زندہ دل اور قادر الکلام شاعر ہیں، آپ کی شاعری کا ایک بڑا حصہ راقم کی نظر سے گزرا، زبان شستہ وشگفتہ، دلاویز اور عام فہم ہے، قومی اور ملی حالات پر مشتمل آپ کی شاعری دل کو چیرنے والی ہے، اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا حافظ محمد یوسف صاحب چالی فرانگی، منگڈوی

حضرت مولانا حافظ محمد یوسف صاحب شمالی منگڈو کی بستی چالی فرانگ میں تقریبا ۱۹۴۰ء میں ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد صاحب ایک دین دار، پرہیزگار صوفی صافی بزرگ تھے، اور والدہ ماجدہ بھی حافظ صاحب کے بیان کے مطابق نہایت عابدہ وزاہدہ خاتون تھی۔

حافظ محمد یوسف صاحب نے بسم اللہ خوانی کے بعد اپنی آبائی بستی کے مکتب سے ناظرۂ قرآن کریم کے ساتھ دینیات کی بنیادی تعلیم حاصل کی، بعد میں حفظ خانے میں داخل ہو کے قرآن کریم کا مکمل حفظ کیا، اس کے بعد مدرسہ میں داخل ہوئے، جہاں سے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے چاٹگام گئے، اور ساتکانیہ کے ایک دینی مدرسہ سے درجۂ عالمیت تک کی تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے تھے۔

ساتکانیہ میں دوران تعلیم مولانا حافظ محمد یوسف نے حضرت مولانا شاہ صوفی شمس العارفین جہانگیری مرزا کیلی ساتکانوی چاٹگامی سے بیعت کی، عرصۂ دراز تک شیخ کی خدمت میں رہتے ہوئے طریقت و سلوک کی منازل طے کئے، اس کے بعد وطن واپس آئے تھے۔

بنیادی طور پر مذکورہ طریقت کا یہ سلسلہ طریقۂ عالیہ سہروردیہ اور سلسلۂ عالیہ قادریہ سے جاملتا ہے، مرزا کیل ساتکانیہ چاٹگام میں اس سلسلے کا پہلا شیخ حضرت مولانا شاہ صوفی مخلص الرحمن صاحب جہانگیری معروف بہ شیخ العارفینؒ تھے، آپ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا شاہ صوفی عبد الحی صاحبؒ سجادہ نشین ہوئے، جن کے انتقال کے بعد حضرت مولانا شمس العارفین سجادہ نشین ہوئے، پھر ان کے انتقال کے بعد حضرت مولانا شاہ صوفی کمال الدین معروف بہ تاج العارفین خانقاہِ مرزا کیلیہ کے گدی نشین بنے، جو تادم تحریر ۲۰۲۴ء اس خانقاہ جسے دربار شریف کہا جاتا ہے کے مرشد ہیں۔

حضرت شیخ العارفین مولانا شاہ صوفی مخلص الرحمن صاحبؒ مرزا کیلی ایک جلیل القدر عالم دین، فقیہ اور مناظر بزرگ تھے، جن کا سلسلہ پٹنہ بہار کے عظیم صوفی بزگ حضرت مولانا شاہ صوفی منعم پاک باز اور سید نور الدین مبارک غزنوی سے ہوکر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ سے جاملتا ہے، یوں یہ

سلسلہ بنیادی طور پر سلسلۂ عالیہ سہروردیہ کا ایک ذیلی شاخ ہے، تاہم یادرہے کہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے شیخ ایک طرف آپ کے چچا حضرت شیخ ضیاء الدین ابونجیم عبدالقادر سہروردیؒ تھے تو دوسری طرف حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ تھے، لیکن ساتکانیہ والے سلسلۂ عالیہ ابوالعلائیہ جہانگیریہ اگرچہ یہاں کے مروجہ تقریباً تمام سلاسل طریقت کی طرف منسوب ہے، لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں کہ مشرب کے اعتبار سے یہاں کے شیوخ سلسلۂ قادریہ میں زیادہ ترنسبت دیا کرتے ہیں۔

شیخ العارفین مولانا شاہ صوفی مخلص الرحمن صاحبؒ ایک صاحب تصنیف عالم دین، فقیہ اور مناظر بزرگ تھے، جن کی ایک سے زیادہ تصانیف میری نظر سے گزریں، حضرت کی ایک تصنیف ''شرح الصدور فی دفع الشرور'' ہے، جو حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ''تقویۃ الایمان'' کے رد پر ہے۔

حضرت شیخ شاہ صوفی فخر العارفین مولانا عبدالحی جہانگیریؒ بھی ایک جلیل القدر عالم دین تھے، جن کی سیرت پر مولانا حکیم شاہ صوفی سکندر شاہ صاحب کانپوریؒ نے ''سیرت فخر العارفین'' کے نام سے تین حصوں پر مشتمل ایک مبسوط کتاب تصنیف کی ہے، جو میری نظر سے گزری ہے، یہ کتاب پاک وہند کے مختلف پریس سے کئی مرتبہ شائع ہوچکی ہے، اس کا بنگلا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

اب آمدم برسر مدعا کہ مولانا حافظ محمد یوسف صاحب چالی پرانگی سے ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۷ء تک کے درمیان میری چند ملاقاتیں رہیں، ایک مرتبہ میں آپ سے ملاقات کے لئے چالی پرانگ بھی گیا تھا، حافظ صاحب کے گھر میں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی، جس میں تصوف وسلوک کی چند کتابوں کے ساتھ فقہ وفتاوی کی چند کتابیں بھی نظر آئیں، آپ حجۃ الاسلام امام ابوحامد غزالی کے بڑے شیدائی تھے، اپنے مدعا کی چیزیں ہمیشہ اسی کتاب سے نکالا کرتے تھے، میں نے حافظ صاحب کو جہاں تک دیکھا، اس کی بنیاد پر عرض ہے کہ آپ ایک اعلی درجہ کے متواضع، منکسر المزاج، سخاوت پسند، عابد وزاہد اور عاشق صادق بزرگ تھے، علاوہ ازیں آپ فارسی کے بلند پایہ کے صوفی شاعر بھی تھے، چالی پرانگ میں دوران گفتگو آپ نے اپنے مخطوط دیوان سے کئی کلام سنائے، جہاں تک اندازہ ہوا کہ آپ کی شاعری طریقت وسلوک پر مشتمل تھی، آپ تو ۱۹۹۰ء میں اس دنیا سے رخصت لئے چلے گئے، نہ جانے آپ کے دیوان کا کیا حال ہے۔

ارکان اوراس کے متعلق بعض نمایاں تاریخی واقعات

۲۶۶۶ق م ۔ سے دھنووتی ردھنیاودی پہلے عہد حکومت، جس کا سلسلہ ۸۰۰ق م تک جاری تھا۔

۸۲۵ق م ۔ سے دھنووتی ردھنیاودی دوسرے عہد حکومت، جس کا سلسلہ ۷۸۸ء تک جاری تھا۔

۷۸۸ء ۔ ویسالی دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۰۱۸ء تک جاری تھا۔

۹۵۷ء ۔ ارکانی راجا چولائنگ چندرا کے زمانے میں ارکان پر منگولوں کا حملہ، اور ارکان کی تاخت وتاراج۔

۱۰۱۸ء ۔ پن سا پہلے دور حکومت کی ابتداء، جو ۱۱۰۳ء میں اپنی انتہاء کو پہنچی تھی۔

۱۱۰۳ء ۔ پارن دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۱۶۷ء تک جاری رہا۔

۱۱۶۷ء ۔ کریٹ دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۱۸۰ء تک جاری تھا۔

۱۱۸۰ء ۔ پن سا دوسرے دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۲۳۷ء تک جاری تھا۔

۱۲۳۷ء ۔ لنگریٹ دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۴۰۴ء تک جاری تھا۔

۱۴۰۴ء ۔ برمی غاصب راجا ''من کھاؤن'' کا ارکان پر حملہ، نرامیخلا کی ارکان کی سلطنت سے بے دخلی۔

۱۴۰۴ء ۔ ارکانی بادشاہ نرامیخلا (محمد سلیمان شاہ رمن سامون) کا ترک وطن یا جلاوطن۔

۱۴۳۰ء ۔ سلیمان شاہ کی ارکان واپسی اور مروک حکومت کی بنیاد، جس کا سلسلہ ۱۷۸۴ء تک جاری تھا۔

۱۶۶۰ء ۔ بدنصیب مغل شہزادہ شجاع کی ارکان میں آمد، بعد میں اس کا مع اہل وعیال قتل۔

۱۶۶۶ء ۔ مگھ اور پرتگیز لٹیروں کی وجہ سے مختلف آلام و پریشانیاں۔

۱۷۱۰ء ۔ ارکان میں خانہ جنگی، اور وسیع پیمانے میں نقصانات۔

۱۷۸۴ء ۔ برمی غاصب راجا بودھوپھیا کا ارکان پر حملہ وقبضہ، اور اس کی دہشت گردی، اور قتل عام۔

۱۷۹۶ء ۔ تیس ہزار ارکانیوں (مگھ رمسلمانوں) کا ترک وطن اور بنگال میں ان کی پناہ۔

۱۷۹۸ء ۔ جنرل علیہ بائنگ رعلی بھائی (مسلمان) وغیرہ کی برمی غاصبوں سے آزادی کی جدوجہد۔

۱۸۱۱ء ۔ سین فیا(KINGBERING) اور مسلم لیڈروں کی قیادت میں ہونے والے انقلاب کی ناکامی۔

۱۸۲۵ء ۔ پہلی انگلو برمن جنگ۔

۱۸۲۶ء ۔ ارکان پر برطانیہ کا قبضہ۔

۱۹۳۰ء ۔ برمی مسلم تاجر'' اوباؤ'' کے تعاون سے برما مسلم سوسائٹی کا قیام۔

۱۹۳۰ء ۔ مگھ ڈاکو (بورینگ اونگ) اور اس کے حواریوں کی بربریت اور مسلمانوں کی بڑے پیمانے سے ہجرت۔

۱۹۳۰ء - وسطی، تحتی برما اور ارکان میں مسلمانوں کا قتل عام اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۳۳ء - روہنگیا جمعیت علمائے اسلام ارکان کی بنیاد۔

۱۹۳۶ء - برطانوی ہند سے برما کی انتظامی علیحدگی، اور ملک بھر سے مسلمانوں کا کریک ڈاؤن۔

۱۹۴۲ء - رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ۔

۱۹۴۲ء - ارکانی مسلمانوں کا تاریخی قتل عام، اور بڑے پیمانے پر ان کی ہجرت۔

۱۹۴۲ء - منگڈو، بوسیڈنگ اور راسیڈنگ پر مشتمل تاریخی ''مسلم ریاست'' کا قیام۔

۱۹۴۵ء - ارکان میں برطانویوں کی دوبارہ واپسی۔

۱۹۴۵ء - ''برما مسلم جنرل کونسل'' نامی تنظیم کا قیام۔

۱۹۴۵ء - مسٹر عبد الرزاق کی صدارت میں برما مسلم کانگرس کا قیام۔

۱۹۴۶ء - مسٹر عبد الرزاق کی سربراہی میں پمنا رپیومنا مسلم کانفرس کا انعقاد۔

۱۹۴۷ء - سازش پر مبنی بدنام زمانہ ''پیلونگ کانفرنس'' کا انعقاد۔

۱۹۴۷ء - برمی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات۔ جس میں ارکانی مسلمانوں کو قانونی طور پر نمائندگی ملی تھی۔

۱۹۴۷ء - محمد جعفر حسین قوال کی زیر قیادت ''جہاد کونسل'' کی تشکیل اور ظالموں کے خلاف اعلان جہاد۔

۱۹۴۸ء - برطانیہ سے برما یا برمیوں کو حصول آزادی۔

۱۹۴۸ء - محمد قاسم بن عطاء الدین کی قیادت میں ''مجاہد پارٹی'' کا قیام۔

۱۹۴۹ء - مولانا مظفر احمد کی زیر صدارت انجمن مہاجرین ارکان کا قیام۔

۱۹۵۰ء - بی ٹی ایف کی بربریت، ہزاروں مسلمانوں کی شہادت اور ہزاروں کی ہجرت۔

۱۹۵۰ء - بانئ تحریک آزادئ ارکان محمد جعفر حسین قوال کی افسوسناک شہادت۔

۱۹۵۱ء - آزاد برما میں قومی اسمبلی کے پہلے عام انتخابات۔

۱۹۵۴ء - ارکان میں بنگالی مگھوں کا دخول عام، مسلم بستیوں پر قبضہ، مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۵۶ء - برمی قومی اسمبلی کے دوسرے انتخابات۔

۱۹۵۹ء - ارکان میں اور ایک مرتبہ بنگالی مگھوں کا دخول عام، مسلم بستیوں پر قبضہ، مسلمان ترک وطن پر مجبور۔

۱۹۶۰ء - مایو فرنٹیر اڈمنسٹریشن کا نفاذ۔

۱۹۶۱ء - برمی قومی اسمبلی کے تیسرے عام انتخابات۔

۱۹۶۱ء - راغب اللہ مرحوم وغیرہ کی قیادت میں ۲۹۰ سے زائد مجاہدین کا برمی فوجی قیادت کے سامنے سارنڈر۔

۱۹۶۲ء - جمہوری آئین کی معطلی، اور اقتدار پر جنرل نے ون کی قیادت میں برمی فوج کا مکمل قبضہ۔

۱۹۶۲ء - برما میں شوشل ازم کا نفاذ۔

۱۹۶۳ء - نے ون کے نام نہاد قومی اسمبلی کے انتخابات۔

۱۹۶۴ء - روہنگیا انڈیپنڈنٹ فورسس (RIF) کی تشکیل۔

۱۹۶۶ء - مگھ شرپسندوں کی شرپسندی اور برمی بربروں کی بربریت کی وجہ سے مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۶۶ء - محمد جعفر ثانی کی قیادت میں ارکان آزاد فوج (RNLP) کی تشکیل۔

۱۹۷۳ء - نے ون کی قیادت میں برمی فوج اور اس کے لالے پالے غنڈوں کے مظالم، اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۷۳ء - محمد جعفر حبیب (رحمہ اللہ) کی زیر قیادت روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کی تشکیل اور اعلان۔

۱۹۷۵ء - جنرل نے ون کی ایماء پر مسلمانوں کی وسیع پیمانے میں گرفتاریاں اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۷۵ء - ارکان ہسٹریکل سوسائٹی (AHS) کا قیام۔

۱۹۷۷ء - روہنگیا مسلم طلبہ تنظیم ''رابطۃ الطلاب المسلمین الروہانجیین کا قیام۔

۱۹۷۸ء - نے ون کے نام نہاد برمی قومی اسمبلی کے انتخابات۔

۱۹۷۸ء - ناگامن آپریشن، برمیوں اور مگھوں کی غارت گری، مسلمانوں کی عام گرفتاریاں، قتل عام اور ہجرت۔

۱۹۷۹ء - روہنگیا جمعیت علماء (مسلح) کی زیر زمین جدوجہد کا آغاز۔

۱۹۸۲ء - روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی تشکیل۔

۱۹۸۲ء - مولانا عبد القدوس مجاہد کی امارت میں حرکۃ الجہاد الاسلامی نامی تنظیم کی جدوجہد کا آغاز۔

۱۹۸۲ء - نے ون قومی اسمبلی کے اور ایک نام نہاد انتخابات۔

۱۹۸۶ء - ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کی تشکیل۔

۱۹۸۶ء - مولانا عبد الحمید مجاہد کی زیر امارت ''روہنگیا اسلامی محاذ'' نامی تنظیم کی تشکیل۔

۱۹۸۶ء - روہنگیا طلبہ تنظیم، اتحاد الطلاب المسلمین ارکان۔ برما۔ (ITM) کی بنیاد۔

۱۹۸۸ء - جنرل نیون کی اقتدار سے ہمیشہ کے لئے چھٹی، اور سین لوین کی گدی نشینی۔

۱۹۸۸ء - ڈاکٹر مونگ مونگ کی چند دنوں والی حکومت۔

۱۹۸۸ء - جنرل سا مونگ کی قیادت میں اقتدار پر فوج کا دوبارہ قبضہ۔

۱۹۸۸ء - مولانا محمد حنیف راغب ارکانی کی قیادت میں ''اتحاد المجاہدین'' نامی تنظیم کی تشکیل۔

۱۹۸۸ء - روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کا اعلان۔

۱۹۹۰ - ارکانیوں کی نمائندہ جماعت ''نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی فار ہیومن رائٹ (NDPHR) کا قیام۔

۱۹۹۰ء - نام نہاد انتخابات / اقتدار پر فوج کا قبضہ، جس کا سلسلہ تان شوے سے لے کر اب تا جاری ہے۔

۱۹۹۱ء - روہنگیا مسلمانوں پر مظالم اور ان کی بڑے پیمانے پر ہجرت۔

۱۹۹۱ - مسلمانوں کا قتل عام، وسیع پیمانے میں مسلمانوں کی گرفتاریاں، اور ان کی بڑے پیمانے پر ہجرت۔

۱۹۹۵ء - روہنگیا نشنل الائنس (RNA) نامی الائنس کی تشکیل۔

۱۹۹۸ء - ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کی تشکیل اور اعلان۔

۲۰۱۱ء - ارکان روہنگیا یونین (ARU) کی بنیاد اور اعلان۔

۲۰۱۲ء - مسلمانوں کا قتل عام، ہزوروں شہادت، ہزاروں ماں بہنوں کی عصمت دری، اور لاکھوں کی ہجرت۔